حیات عبدالحیؒ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

بار اول

۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۴ء

نام کتاب	:	حیات عبدالحیؒ
مصنف	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
کمپوزنگ	:	عطاءالرحمٰن (تعمیر حیات)
تعداد	:	۱۱۰۰
صفحات	:	۳۶۹
طباعت	:	پاریکھ آفسٹ پرنٹنگ پریس ٹیگور مارگ، لکھنؤ
قیمت	:	۱۱۰/روپئے

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

عرض ناشر

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اسلامیان ہند کی تاریخ رقم کرنے والوں میں سب سے زیادہ روشن ہے، "نزہۃ الخواطر (۱-۸) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الهند، اور الهند فی العهد الاسلامی" لکھ کر انہوں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ محفوظ کردی ہے،، وہ ایک بلند پایہ مؤرخ وادیب بھی تھے اور صاحب ذوق محدث بھی، ندوہ کے دور اختلاف میں وہ اس کے ناظم منتخب ہوئے ان کی ذات پر سب کا اتفاق تھا، ان کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ترقی کے منازل طے کئے۔

جس نے ساڑھے چار ہزار سے زیادہ علماء فضلاء، ملوک وامراء اور ہندوستان کی مشہور شخصیات کے حالات محفوظ کردیئے ہوں، اس کی ضرورت تھی کہ اس شخصیت کے حالات بھی لوگوں کے سامنے آئیں، مولانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے ان کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے ان کے مختصر حالات زندگی لکھ کر ان کی کتاب یاد ایام میں مقدمہ کے طور پر شامل کئے، لیکن با قاعدہ تفصیل کے ساتھ یہ کام مولانا کے قابل صد افتخار فرزند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حصہ میں آیا، حضرت مولانا نے حیات عبدالحی کے نام سے مولانا کی سوانح مرتب فرمائی، اس کو سب سے پہلے مفتی عتیق الرحمٰن نے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کیا، ایک عرصہ کے

بعد وہ کتاب دوبارہ پاکستان سے شائع ہوئی، ہندوستان میں پہلا اڈیشن ختم ہونے کے بعد کتاب عرصہ تک دوبارہ نہیں طبع ہوسکی محترمی انیس چشتی صاحب نے پاکستانی اڈیشن کا عکس لے کر کتاب شائع کی، اور جلد ہی وہ اڈیشن بھی ختم ہوگیا۔

سید احمد شہید اکیڈمی کی جانب سے نئی کمپوزنگ کے ساتھ اب یہ کتاب شائع کی جارہی ہے، افادۂ عام کی غرض سے اس کا ضمیمہ جو ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کے تذکرہ پر مشتمل ہے الگ شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مفید بنائے اور اس سلسلہ میں کوشش کرنے والوں کو اجر عطا فرمائے۔

۲۰ر جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ

بلال عبد الحی حسنی ندوی
دار عرفات، رائے بریلی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

باب سوم

بیعت وارادت، تعلیم سلوک واجازت، دینی مرکزوں کا سفر اور مشائخ علماء کبار سے استفادہ

باب چہارم

اصلاحی و عملی سرگرمیاں، ندوۃ العلماء کی تحریک سے دلچسپی و ہمدردی عملی معاونت و شرکت، مولانا محمد علیؒ کے معتمد خاص اور مددگار ناظم

باب پنجم

نظامتوں کی تبدیلی، ندوہ کا دورِ اختلاف و انتشار، طلبہ کی اسٹرائک اور ملک میں بےچینی، علامہ شبلی کی وفات، مصالحت و تصفیہ

❁❁❁

❁ باب ششم

مولانا سید عبدالحی صاحب کا نظامت کیلئے متفقہ انتخاب، ندوہ کے استحکام و ترقی کیلئے انکی کوششیں، اہم سالانہ جلسے، اہم خدمات اور مساعی

❁❁❁

باب ہفتم
عائلی زندگی، طبابت وکسب معاش، نظام الاوقات، مرض ووفات

❁ باب ہشتم

نمایاں صفات، مزاجی خصوصیات، ذوق ورجحانِ طبع

❁❁❁

❁ باب نہم

ہندوستان کی دینی وعلمی عظمت، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی تدوین، مولانا کی اہم تاریخی تصنیفات عربی میں

❁❁❁

باب دہم

اردو کی تاریخی تصنیفات، یادِ ایام، گلِ رعنا، دوسرے رسائل و دینی تصنیفات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

راقم الحروف کی تحریری و تصنیفی زندگی کا آغاز تذکرہ سوانح سے ہوا، ابھی میری عمر سولہ، سترہ سال کی تھی کہ میرے مربی اور برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم نے ایک اردو مضمون ''تیرہویں(۱) صدی کا مجاہد اعظم'' عربی میں ترجمہ کے لئے دیا، جب اس مضمون کا آزاد ترجمہ مکمل ہوگیا تو وہ اس وقت عالم اسلام کے وقیع ترین رسالہ ''المنار'' میں جو علامہ سید رشید رضا مرحوم کی ادارت میں قاہرہ سے نکلتا تھا، اشاعت کے لئے بھیج دیا گیا، علامہ مرحوم نے اس کو بالاقساط ''المنار'' میں بھی شائع کیا اور ''ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان الشہید'' کے نام سے اس کو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کرکے نوعمر مضمون نگار کی عزت و ہمت بڑھائی، یہ مصنف کے قلم کا پہلا نقش تھا جس کو ایک مقبول اور مجاہد بندہ کی نسبت نے آب و تاب بخشی۔

یہ آغاز ایسا مبارک تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں مصنف کے قلم سے ''سیرت سید احمد شہید'' جیسی تصنیف نکلی، جس نے خود مصنف کو ایک نئی زندگی عطا کی، ایمان کی

---

(۱) یہ مولانا محی الدین قصوری کا ایک بسیط مضمون تھا جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے تذکرہ کے طور پر رسالہ ''توحید'' امرت سر میں مسلسل و بالاقساط شائع ہوا تھا۔

حلاوت بخشی، دینی حلقہ میں تعارف کرایا اور اہل دعوت وعزیمت کی سوانح نگاری کی مزید توفیق وسعادت سے سرفراز کیا اور اس کے قلم سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نامور دینی وروحانی شخصیتوں کے تذکرے اور سوانحِ حیات شائع ہوتے رہے اور یہ موضوع اس کا پسندیدہ اور محبوب موضوع بن گیا، اس سلسلہ میں مشہور داعی الی اللہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی سوانح، اویسِ زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کا تذکرہ اور شیخِ وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کی حیات قابل ذکر ہے، خود ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا سلسلہ جس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اصلاً ان ممتاز اور نامور شخصیتوں کے تذکروں ہی کے مجموعہ کا نام ہے، جن کا اسلام کی تاریخِ تجدید واصلاح میں نمایاں مقام اور کام ہے، یہ سب ان مضامین اور مختصر تذکروں کے علاوہ ہے جو وقتاً فوقتاً مصنف کے قلم سے نکل کر اہم دینی رسائل و مجلات میں شائع ہوئے یا کسی کتاب کا جز بنے۔(۱)

یہ کہانی جو کسی قدر خودستائی سے خالی نہیں ذرا تفصیل سے اس لئے سنانی پڑی کہ سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کی اس طویل و مسلسل مشغولیت میں کبھی مصنف کو خیال نہیں آیا کہ وہ اپنے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی سوانح حیات مرتب کرے، کسی صاحبِ قلم فرزند کے لئے کبھی بھی یہ بات شرم اور معذرت کی نہیں سمجھی گئی کہ وہ اپنے نامور اور صاحب کمال باپ کی سوانح لکھے اور اس کے وہ صحیح حالات اور واقعاتِ زندگی، علمی ودینی خدمات اور تصنیفی کارنامے دنیا کے سامنے پیش

(۱) مثلاً مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیرآبادی کا مبسوط تذکرہ جو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں شائع ہوا یا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا مفصل تذکرہ جو سوانح مولانا محمد یوسف صاحب کا جز بنایا گیا، آخر میں شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی کے خاندانی وذاتی حالات جس کو ان کے مجموعۂ ملفوظات کا مقدمہ بنایا گیا۔

کرے جن میں نئی نسل کے لئے استفادہ ورہنمائی کا وافر سامان ہے، خاص طور پر جب صاحب سوانح کی پوری عمر اسلاف وپیشروؤں کے کارناموں کی حفاظت واشاعت اوران کے نام اورکام کو زندہ رکھنے میں گزری ہواوراس کے قلم سے اپنے ملک کے تقریباً پانچ ہزار علماء ومشاہیر کے تذکرے مرتب ہوئے ہوں تو اس کا یہ اخلاقی وعلمی حق ہرشریف انسان کوتسلیم کرناپڑے گا کہ "الجزاء من جنس العمل" اورشیخ سعدیؒ کے فرمان ؎

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن

تا بماند نام نیکت پائیدار

کے اصول کے مطابق اس کا سوانح اوراس کا تذکرہ بھی مرتب کیا جائے اوراس کی واقعی اورصحیح خدمات اورکارناموں کوضائع ہونے یا گوشۂ گمنامی میں مستور ہونے سے بچالیا جائے ،اس لئے اگر یہ سوانح سالہا سال پہلے مرتب کرلی جاتی جب ناچیز مصنف کا ولولۂ تصنیف تازہ،قلم جواں ورواں اور بصارت صحیح اورمحفوظ تھی،تو ذرا بھی تعجب کی بات نہ ہوتی، اس وقت ایسے لوگ بھی موجود تھے جن سے بہت سی ضروری معلومات اورچشم دیدواقعات مہیا ہوسکتے تھے۔

لیکن اس پورے عرصہ میں کبھی مصنف نے اس کام کاارادہ نہیں کیااورنہ کبھی اس کے دل میں اس کی ایسی تحریک پیدا ہوئی کہ وہ سب کام چھوڑ کراس کی طرف متوجہ ہوجائے،سب سے پہلے پروفیسرسید نجیب اشرف ندوی مرحوم نے (جنہوں نے ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولاناحکیم سید عبدالحی صاحب کوقریب سے دیکھا تھااور ایک محلّہ میں رہنے کی وجہ سے ان کوان کی زندگی کے مطالعہ کا موقعہ ملاتھا) مجھ سے اس کتاب کے لکھنے کی فرمائش کی، پھران کا معمول ہوگیا کہ جب کبھی ان سے ملاقات

ہوتی وہ اس کا تقاضہ کرتے اور میں مناسب طریقہ پر اسکو ٹال دیتا، یہاں تک کہ انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا اور میں ان کی زندگی میں ان کی فرمائش پوری نہ کرسکا، ان کے انتقال کے بعد ایک صاحب دل بزرگ (۱) نے مجھ سے بار بار اس کا تقاضا کیا اور اس کام کی طرف متوجہ نہ ہونے پر کئی بار اپنی آزردگی اور تکلیف کا اظہار کیا، ان کا تقاضا اس حد تک پہنچ گیا کہ مجھے ان کے سامنے آنے سے شرم آنے لگی اور ان کو مطمئن کرنے کے لئے ان سے وعدہ کرنا پڑا کہ پہلی فرصت میں اس کام کی طرف متوجہ ہوں گا۔

شاید یہ کام ابھی اور ٹلتا اور ممکن ہے کہ میرے غیر مختتم مشاغل کبھی اس کی مہلت نہ دیتے کہ اس کا ایک قدرتی سامان ہوگیا، ادھر کئی سال سے بعض خاص اسباب کی بناء پر میری تصنیفی سرگرمیوں کا میدان عربی زبان بن گئی ہے، اشاعت کی سہولتوں اور عرب نوجوانوں کی قدردانی نے میری تمام تر توجہ عربی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانے پر مرکوز کرلی، ۱۹۷۰ء کے آغاز میں وہ عزیز جو میری عربی تحریر وتصنیف میں مدد کرتے تھے اور میرے مضامین ومسودات لکھتے تھے اچانک علیل ہوگئے اور ایک طویل عرصہ کے لئے اپنے وطن چلے گئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے وہ سب عزیز نوجوان اور دارالعلوم کے اساتذہ جو عربی تحریر وتصنیف میں میری مدد کرسکتے تھے، پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہوگئے، میرے لئے یکسر بیکار ومعطل رہنا ایک تکلیف دہ سزا کے مرادف تھا، اس لئے وقت گزاری کے لئے ضروری تھا کہ میں اردو میں لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کروں جس کے لئے مجھے کاتب ومعاون مل سکتے تھے، اس وقت دفعتاً مجھے اس کتاب کا خیال آیا اور میں نے فروری ۱۹۷۰ء میں اس کا آغاز کردیا، کام کے تسلسل میں میرے ناگزیر سفروں کی وجہ سے

(۱) صوفی عبدالرب صاحب ایم.اے. مراد ہیں۔

طویل وقفے پڑتے رہے پھر بھی کام کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ (۱۸ مئی ۱۹۷۰ء) کو اصل سوانح کا حصہ مکمل ہو گیا، (۱) کارکردگی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسکی مدت تصنیف تین مہینے سے زائد نہیں، تصنیف کا آغاز کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اگر اس کام میں مزید تاخیر ہوتی تو بہت سا قیمتی اور ضروری مواد اور ان تاریخی دستاویزوں اور کاغذات کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا جو اس وقت خوش قسمتی سے موجود ہے، تصنیف کے دوران اللہ تعالیٰ کی مدد اور رہنمائی کا برابر تجربہ و مشاہدہ ہوتا رہا کہ کس طرح بے سان گمان ضروری مآخذ ہاتھ آتے رہے اور کڑیوں پر کڑیاں ملتی چلی گئیں، یہ تائید غیبی صاحب سوانح کے اخلاص اور ان کی اس محنت شاقہ کی قبولیت کی دلیل ہے جو انہوں نے اسلاف کرام کے حالات معلوم کرنے، پھر ان کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں برداشت کی، بہت سے وہ بوسیدہ کاغذات، قدیم خطوط جن کی طرف پہلے کبھی توجہ نہیں ہوئی تھی اور جو اس وقت نظر سے اوجھل تھے، عین اس وقت نظر کے سامنے آئے جب ان کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی تھی اور جب ان کا مل جانا نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔

اس کام میں بنیادی حصہ اور یوں کہنا چاہئے کہ سوانح کا ابتدائی ڈھانچہ دراصل صاحب سوانح کے فرزند اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی کی لکھی ہوئی وہ مختصر سوانح ہے جو "ترجمۂ مصنف" کے عنوان سے "یادِ ایام" کے اس دوسرے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوئی، جو "تاریخِ گجرات" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اگر یہ مختصر سوانح نہ ہوتی تو اس کتاب کی ترتیب نہایت دشوار ہو جاتی، اس لئے کہ ناچیز مصنف کے لئے جس کی عمر اپنے والد کے انتقال کے وقت دس سال کی تھی ان بنیادی معلومات کا فراہم

(۱) ضمیمہ جس میں صاحب سوانح کے فرزند اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کا تعارف وتذکرہ ہے بعد میں لکھا گیا۔

کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوتا، جن کے بغیر کوئی سوانح مرتب نہیں ہوسکتی، اس مختصر سوانح نے مشعلِ راہ کا کام دیا اور اس کے سہارے اور اسکی روشنی میں مصنف نے اپنا سفر آسانی اور کامیابی کے ساتھ طے کیا۔

دوسری بڑی مدد خواہر زادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی سلمہ مصنف ''سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی'' سے ملی، جو بھائی صاحب کے بعد خاندانی کاغذات، قلمی ذخیرے اور انساب وحالات سے سب سے زیادہ واقف ہیں، وہ اس تصنیف کے دوران برابر قدیم خطوط اور تحریروں میں سے ایسی ایسی نایاب چیزیں نکال کر دیتے رہے اور سنین و جزئیات میں ان سے ایسی مدد ملی جن کے بغیر یہ کتاب مکمل ومستند نہیں ہوسکتی تھی، عزیز موصوف کو کسی شکریہ وتحسین کی ضرورت نہیں کہ یہ خدمت ان کے لئے عین سعادت ولیاقت کی بات ہے۔

ممکن ہے بعض خردہ گیر طبیعتیں اس کتاب کی تصنیف پر خودنمائی اور آباء واجداد کے مناقب اور کارناموں کی جا وبیجا تشہیر کا طعنہ دیں اور ان کو اس میں تفاخر ومبالغہ آرائی کی بو آئے، لیکن ان چند ناقدین کے الزام کے ڈر سے جن سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا اور جن کی ملامت سے کوئی بچ نہیں سکا، ان اہل ذوق کو اس سرمایہ سے محروم کرنا صحیح نہ ہوگا، جن کی بہت بڑی تعداد ہے اور جو ان حالات وواقعات کو سرمۂ بصیرت بنانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، علوم دینیہ اور مدارس عربیہ کے طلبہ سے لے کر ملک کے ممتاز فضلاء، اہل قلم ومصنفین اور ملک وملت کے خادموں اور قائدین کے لئے اس میں عبرت وبصیرت اور ذکر وموعظت کا بہت بڑا ہاتھ ہے، اس کتاب میں ایک فرد واحد کی تنہا کوششوں کی داستان ہے، جس نے ایک آدمی کا نہیں، بلکہ اکاڈمی کا کام کیا، پوری عمر گوشۂ گمنامی میں رہ کر بغیر کسی اعلان وتشہیر کے ایک پورے

ملک نہیں، بلکہ ایک تحتی براعظم کی علمی، تعلیمی، تصنیفی، روحانی اور دینی تاریخ مرتب کر ڈالی اور اس کے لئے ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا جو نہ اس کی مادری زبان تھی، نہ اس میں کمال پیدا کرنے کے لئے اس کے پاس وہ قدرتی ذرائع تھے، جو اس زمانہ میں طلباء وعلماء کو آسانی سے میسر ہیں، یہ بلند نگاہی، بلند ہمتی اور خالص علمی ذوق اور جذبۂ خدمت کا ایسا نمونہ ہے جس کی نظیر اس عہد میں اسی ملک میں نہیں، بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب شیخ تاج الدین سبکی نے اپنی مشہور ومقبول کتاب "طبقات الشافعیة الکبریٰ" میں اپنے والد نامدار شیخ تقی الدین سبکی کا مبسوط تذکرہ (جو ایک مستقل رسالہ کی قائم مقامی کرتا ہے) (۱) شامل کیا ہوگا، نیز جب علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام، سبحۃ المرجان، خزانۂ عامرہ، ید بیضا اور سرو آزاد" میں اپنے نانا سید عبدالجلیل بلگرامی کے تذکرہ میں غیر معمولی درازنفسی اور اطناب سے کام لیا ہوگا (۲) اور آخر میں جب فخر المتاخرین مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے اپنی بعض جلیل القدر تصنیفات کے مقدموں (مقدمہ سعایہ وعمدۃ الرعایہ) میں اپنے والد بزرگوار مولانا عبدالحلیم لکھنوی کا شرح وبسط سے تذکرہ کیا اور پھر ان کی وفات پر ان کے حالات میں ایک مستقل رسالہ "حسرة العالم بوفاة مرجع العالم" کے نام سے تصنیف کیا ہوگا تو ان کے خاندان وبرادری اور ان کے شہر وقصبہ

(۱) یہ باریک ٹائپ کے اکیاسی (۸۱) صفحات میں پھیلا ہوا ہے، چھ جلدوں کی اس کتاب میں امام غزالی اور تقی الدین سبکی کے تراجم طویل ترین ہیں۔

(۲) بلکہ ید بیضا سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تصنیف کی غرض اصلی اپنے جد مادری کا ہی تذکرہ لکھنا تھا، میر عبدالجلیل صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بر مطالعہ کنندگانِ این سطور مخفی ومستور نماند کہ علت غائی تسوید ایں کتاب ذکر آنجناب......تقدس مآب است۔

میں اس کے متعلق کیسی کیسی سرگوشیاں اور ان پر مجلسوں میں کیسے کیسے تبصرے ہوئے ہوں گے، لیکن یہ سب حضرات نئی نسلوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان ناقدین وحاسدین کی خردہ گیری کی سزا آئندہ نسلوں کو نہیں دی اور حالات وواقعات، علمی کمالات اور ان ادبی شہہ پاروں سے اہل ذوق کو محروم نہیں کیا جو ہمیشہ اس ''خزانہ عامرہ'' (۱) کے قدرداں رہے ہیں، آج تاریخ کے دفتر اور اس عہد کے تصنیفی مرقع میں ان ناقدین ومعترضین کی ان نکتہ چینیوں کا کیا ذکر، ان کے ناموں کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا، جنہوں نے ان مصنفین کی ان کتابوں کو طعن وملامت کا ہدف بنایا، لیکن یہ کتابیں اور ان کتابوں کے اقتباسات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی زندہ وتابندہ ہیں، جن میں نئی نسلوں کے لئے استفادہ وانتفاع کا وافر سامان ہے اور یہی سنت الٰہی اور فطرت کا قانون ہے۔

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ﴾ (۲) ترجمہ: جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت اور مناسب معلوم ہوتی ہے، ایک یہ کہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا خلیل الرحمٰن سہانپوریؒ اور مولانا حکیم سید عبدالحیؒ میں سے کسی کی سوانح لکھی جائے، تو ندوۃ العلماء کے دور اختلاف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ اس کے بغیر نہ یہ سوانح مکمل ہو سکتی ہے، نہ ان شخصیتوں کے سب گوشے اور ان کی زندگی کے سب پہلو اس کے بغیر سامنے آسکتے ہیں، جب محتاط

---

(۱) یہ مولانا آزاد بلگرامی کی مشہور تصنیف کا نام ہے۔ (۲) رعد: ۱۷۔

مؤرخین بھی تاریخ اسلام اور سیر صحابہ مرتب کرتے وقت مشاجرات صحابہ سے صرف نظر نہ کر سکے اور جنگِ جمل وصفین کو چارو ناچار جگہ دینی پڑی، تو اس عہد کا مؤرخ اور اس کی کسی قابل احترام شخصیت کا سوانح نگار اس سے کس طرح اغماض برت سکتا ہے، البتہ یہ اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس میں توفیق الٰہی سے کسی جگہ بھی نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا، ہر شخصیت کو حالات کے اس چوکھٹے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ان واقعات واختلافات کا ظہور ہوا اور اس کو اس کا صحیح مقام دینے کی امکانی حد تک سعی کی گئی ہے، تاریخ ونفسیات انسانی کا ایک طالب علم اور کسی دینی واصلاحی تحریک کا خادم اور سپاہی ان واقعات سے بھی بہت کچھ سبق لے سکتا ہے اور نئے تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾

اب جب وہ عہد گزر چکا ہے اور اختلافات وشکایتوں کے وہ اسباب بھی زائل ہو چکے ہیں جو اس وقت بہت اہم نظر آتے تھے، تو اب سعادتمند اخلاف کے لئے صحیح راستہ اور مناسب طرز عمل یہ ہے کہ وہ اپنے ان اسلاف کو معذور بلکہ ماجور سمجھیں اور ان الفاظ میں ان کے لئے دعا کرتے رہیں۔

﴿ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان ولا تجعل
في قلوبنا غلاً للذين آمنوا ربنا إنك رؤف رحيم﴾ (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا مصنف نے تاریخ دعوت وعزیمت کے حصہ

---

(۱) ترجمہ: اے ہمارے پروردگار ہماری اور ہمارے ان دینی بھائیوں کی مغفرت کرنا جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ چلے گئے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی طرف سے کوئی کھوٹ نہ رکھ۔ اے ہمارے پروردگار تو بہت ہی شفقت والا مہربان ہے۔

اول کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ کسی شخصیت کے سمجھنے، اس کے جذبات واحساسات ومقاصد کو معلوم کرنے کے لئے صرف واقعات کی فہرست اور سنین واعداد کا مجموعہ کافی نہیں، اس کے خطوط، تحریریں، مضامین اور تصنیفات کے طویل اقتباسات اور تقریروں کے نمونے (اگر وہ محفوظ ہوں) ضروری ہوتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں اس شخصیت کے حقیقی اعماق وآفاق معلوم ہوں اور قارئین کو سوانح نگار کی وساطت کے بغیر کچھ دیر صاحب سوانح کے ساتھ وقت گزارنے اور لطف اٹھانے کا موقعہ ملے، اسلئے مصنف نے ان تمام تذکروں میں جو اسکے قلم سے نکلے، صاحب سوانح کے اصلی خیالات اور جذبات کے پیش کرنے میں اور اسکی تحریروں یا تقریروں کے طویل اقتباسات نقل کرنے میں بخل وکفایت شعاری سے کام نہیں لیا کہ صاحب سوانح کی شخصیت کے سمجھنے کے لئے یہی شاہ کلید ہے، اسکا ایک فائدہ جس کا مصنف کو خود تجربہ ہے یہ ہے کہ بعض اوقات بڑی بڑی ضخیم تصنیفات حوادث وانقلابات کی نذر ہو جاتی ہیں اور کسی کتاب میں درج کئے ہوئے اقتباسات باقی رہ جاتے ہیں جو اسکی طرز فکر اور خصوصیات کو زندہ رکھتے ہیں اور آئندہ نسلیں انہی کے ذریعہ اس مصنف کا سراغ پاتی ہیں۔

آخر میں مصنف مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب (ناظم ندوۃ المصنفین) دہلی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے، جنہوں نے اس کتاب کو قدر کے ہاتھوں سے لیا اور اس کی طباعت واشاعت کا شایان شان انتظام فرمایا، انہوں نے عرصہ ہوا مصنف سے اسکی فرمائش کی تھی کہ وہ اپنی کوئی تصنیف اشاعت کے لئے ندوۃ المصنفین کو دے، مصنف نے مارچ ۱۹۷۰ء کے آخری ہفتہ میں ترکیسر (ضلع سورت) میں اس تازہ پیش کش کا تذکرہ کیا، جب ہم دونوں اپنے فاضل دوست مولانا غلام محمد صاحب

نورگت کے مہمان تھے تو انہوں نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اسکی طباعت واشاعت کی پوری ذمہ داری قبول فرمائی۔

خدا کرے یہ کتاب ہر طرح مفید ومؤثر ثابت ہو اور اس سے خدمت علم ودین اور حصول رضائے الٰہی کا جذبۂ صادق پیدا ہو کہ یہی اس کتاب کا سب سے بڑا پیغام ہے۔

سید ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی۔

۱۹/ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ
۲۴/جون ۱۹۷۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول

خاندان، جدامجد، والد ماجد

سیرت سازی میں خاندان اور قریبی اجداد کی اہمیت

انسان کے مزاج و مذاق کی تشکیل، اس کے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات اس کے زندگی کا رخ متعین کرنے میں، اس کے خاندان اور اس کے قریبی اجداد کا اثر، علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس کی تصدیق گزشتہ تاریخ، نیز پے در پے مشاہدات و تجربات سے ہوتی رہتی ہے اور اس کا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے۔

یہ اثر انسان پر دو راستوں سے ہوتا ہے: ایک نسلی طور پر، کہ یہ خصائص (کمالات اور کمزوریاں) باپ سے بیٹے کی طرف اور مورث سے والد کی طرف منتقل ہوتے ہیں، دوسرے ذہنی و فکری طور پر، کہ خاندانی روایات اور آباء اجداد کے قابلِ فخر کارناموں کا تذکرہ، ان کے اصولِ زندگی، عقائد و مسلمات اور ان معیار و اقدار کا چرچا، جن کو وہ ہمیشہ سینہ سے لگائے رہے، اور جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے، ان محبوب اور معیاری شخصیتوں کے نام، جن کی عقیدت و عظمت ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی، اور ان مقاصد کا ذکر جن کے لئے انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے

دریغ نہیں کیا، بچپن سے انسان کے کان میں پڑتا رہتا ہے، اور اس کے دل ودماغ کی سادہ تختی پر "نقش کالحجر" ہوجاتا ہے اور یہ سب چیزیں شعوری اور غیر شعوری طریقہ پر (اور اکثر غیر شعوری طریقہ پر) اسکی شخصیت وسیرت کی تعمیر اور اس کی صورت گری کرتی ہیں۔

اسی حقیقت کے پیشِ نظر قدیم وجدید سوانح نگاروں نے صاحبِ سوانح کے خاندان کا تعارف اور اس کے اسلاف وآباء واجداد کا تذکرہ، اس کے حالات وکمالات کے تذکرہ اور اس کی سوانح حیات لکھنے سے پہلے ضروری سمجھا ہے اور اس بارے میں اپنے اپنے زمانہ کے مذاق، صاحبِ سوانح کے درجہ اور پایہ اور اپنی تصنیف کے پیمانہ کے مطابق ایجاز واختصار یا تفصیل واطناب سے کام لیا ہے، یہ محض ایک رسمِ کہن کی پیروی اور مجرد روایت پرستی نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے عمیق ووسیع مطالعہ، اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے، کہ کسی انسان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کا سمجھنا، اس کے پسند و ناپسند، اس کے ترک وانتخاب، اس کی محبت ونفرت کے اندرونی محرکات، اس کی مثالی شخصیتوں اور قابلِ تقلید نمونوں کے اختصار کرنے کے اسباب اور مقاصدِ زندگی کے تعین کی اصل وجہ اس وقت تک نہیں معلوم ہوتی ہے جب تک اس "ماحول" کا جائزہ نہ لیا جائے جس میں اس نے نشو ونما پائی۔

یہ ماحول صرف وہ محلّہ اور بستی نہیں ہے جس میں اس کی پیدائش اور پرورش ہوئی، بلکہ ذہن وخیال، تذکروں اور چرچوں، روایات و واقعات، ترغیب وتحریض، تعلیم وتلقین اور افتخار واعتماد کی وہ فضا بھی ہے جس میں اس نے ہوش سنبھالا اور عقلی و ذہنی ارتقاء کے منازل طے کئے، بعض مرتبہ یہ ماحول ان بیدار فطرت بچوں کے لئے جن کی داشت پرداخت خاص اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہے، محلّہ اور بستی کے ماحول سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

اسی اصول کی بناء پر قدیم اسلاف اور عہدِ قدیم کی شخصیتوں اور بعید العہد اجداد کے مقابلہ میں قریبی اجداد اور قریبی عہد کی شخصیتوں کا اثر دل ودماغ پر زیادہ گہرا ہوتا ہے، کہ قدیم شخصیتوں کے مقابلہ میں (خواہ وہ اپنی شہرت وعظمت کی بناء پر زیادہ بلند مرتبہ اور زیادہ قابل احترام ہوں) قریبی بزرگوں کے تذکرے زیادہ کان میں پڑتے رہتے ہیں اور ان سے متأثر ہونے اور ان کی تقلید وپیروی کرنے کے زیادہ مواقع آدمی کو حاصل ہوتے ہیں، اس لئے ہم یہاں مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے خاندان کا بالاختصار وبقدر ضرورت تعارف کرائیں گے اور ان کے جد امجد اور والد ماجد کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کے خاندان کا تعارف ان ضخیم ومستند کتابوں میں، جو حضرت سید احمد شہیدؒ یا ان کے جد امجد حضرت شاہ علم اللہؒ کے حالات میں لکھی گئی ہیں، (۱) بہت تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، اس لئے اس کا اعادہ چنداں ضروری نہیں۔

خاندان وسلسلۂ نسب

مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ پدری سبط اکبر امام حسن علیہ وعلی آبائہ السلام پر منتہی ہوتا ہے، اس سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی، جس نے ہندوستان کا رشتہ حبل اللہ کے ساتھ استوار کیا، شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی (۲) کی ذات تھی، امیر قطب الدین محمد، شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے تھے، امیر قطب الدین محمد

---

(۱) مولانا غلام رسول مہر کی شہرۂ آفاق کتاب ''سید احمد شہیدؒ'' اور راقم سطور کی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' میں اس خاندان حسنی وقطبی کا تذکرہ، جس سے مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب کا تعلق ہے، بہت تفصیل کے ساتھ مل سکتا ہے۔

(۲) وفات ۳ رمضان المبارک ۶۷۷ھ، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''نزہۃ الخواطر'' جلد اول و ''سیرت سید احمد شہید'' جلد اول نیز ''تاریخ آئینہ اودھ'' وغیرہ۔

ابن رشید الدین احمد بن یوسف بن عیسیٰ بن حسن بن ابی الحسن علی بن ابی جعفر محمد بن قاسم ابن ابی محمد عبداللہ بن حسن الاعور الجواد، نقیب الکوفہ بن محمد ثانی بن ابی محمد عبداللہ الاشتر بن محمد صاحب النفس الزکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن حسن مجتبیٰ بن علی مرتضیٰ بن ابی طالب ﷺ۔ حسن مثنیٰ اپنے عم نامدار، شہید کربلا امام حسین علیہ وعلی آبائہِ وذریاتہِ السلام کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ صغریٰ سے بیاہے ہوئے تھے، اسی لحاظ سے خاندان کے لوگوں کو حسنی وحسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اہلبیت کرام کی طرح اس خاندان کے بزرگوں نے بھی بنی امیہ وبنی عباس کے ہاتھوں خدا کی راہ میں تکلیفیں اٹھائی تھیں، چنانچہ حضرت محمد بن عبداللہ المحض جن کا لقب النفس الزکیہ تھا، جناب رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق مدینہ طیبہ میں شہید کئے گئے تھے، امام محمد النفس الزکیہ کے بنی اعمام افریقہ وعرب کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اوران کی اولاد میں بڑے بڑے ائمہ اور خدا پرست امراء پیدا ہوئے، سنوسی شیوخ اور امرائے مراکش وشرفائے مکہ وامرائے عسیر انہیں حضرات کی اولاد میں ہیں۔

امیر قطب الدین محمد مدنی جلیل القدر اولیاء اللہ میں سے تھے، آپ نے ابتدا میں اپنے ماموں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے استفادہ کیا تھا اوران کی وفات کے بعد شیخ نجم الدین کبریٰ سے بیعت کی اوران کے بڑے خلفاء میں سے ہوئے، آپ کو رویائے صادقہ میں بارگاہ نبویؐ سے حکم ملا کہ ہندوستان جا کر ظلمتِ کفر مٹائیں، چنانچہ آپ چھٹی صدی کی ابتداء میں اپنے ہزارہا مریدین کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اورؔ کڑہ مانک پورؔ کے نواح میں جہاد کرکے اس ظلمت کدہ کو نور اسلام سے منور کیا، آپ کا مزار کڑہ میں ہے۔

امیر قطب الدین کی اولاد میں اتنے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم

خاندانوں میں ہوئے ہوں گے، آپ کے پوتے قاضی سید رکن الدین کے اوصاف حسنہ کا تذکرہ (مولانا ضیاء الدین برنی) مؤلف "تاریخ فیروزشاہی" نے نہایت ادب اور عظمت سے کیا ہے، قاضی سید رکن الدین کی جو اولاد نصیر آباد، ضلع رائے بریلی میں رہی ان میں حضرت قاضی سید احمد بڑے پایہ کے بزرگ تھے، آپ نے ایک مرتبہ اثنائے فیصلہ میں فرمایا کہ "یہی اللہ اور رسول کا حکم ہے" اس کے جواب میں ایک فریق نے کہا کہ (نعوذ باللہ) میں اللہ ورسول کا حکم کوئی چیز نہیں سمجھتا، یہ سن کر آپ وطن سے ہجرت کر کے رائے بریلی تشریف لے آئے اور یہیں آپ کا مزار ہے۔

آپ کے پوتے حضرت سید محمد فضیل بھی زہد وریاضت اور اتباع سنت میں مرتبۂ عالی رکھتے تھے، آپ بھی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے اور وہاں وفات پائی، آپ کے دوسرے پوتے حضرت سید محمد اسحاق (۱) بھی بڑے عارف کامل تھے۔

حضرت سید محمد اسحاقؒ کے صاحبزادہ دیوان خواجہ احمد زبردست عالم اور صاحب سلسلہ شیخ طریقت تھے، آپ کی اولاد میں حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ بڑے نامور بزرگ گزرے ہیں، آپ سے جس قدر رسوم شرک وبدعت کی بیخ کنی ہوئی ہے اور اسلام کی جتنی اشاعت آپ نے کی ہے وہ نواحِ مشرق میں جا کر دیکھی جا سکتی ہے۔

حضرت سید محمد فضیلؒ کے صاحبزادہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے، (۲) آپ حضرت سید آدم بنوری کے اجل خلفاء میں سے تھے، حضرت

---

(۱) انہیں کی شاخ میں صاحب سوانح مولانا سید عبدالحی گزرے ہیں۔

(۲) تفصیلی حالات وکمالات کے لئے ملاحظہ ہو "سید احمد شہید" از مولانا غلام رسول مہر، "سیرت سید احمد شہید" از مصنف و "تذکرہ شاہ علم اللہ" از مولوی سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی۔

شاہ پیر محمد لکھنوی، ملا جیون امیٹھوی، شاہ عبد الشکور مجذوب اور مولانا غلام مصطفیٰ جائسی اور دوسرے معاصر علماء ومشائخ آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، جناب شاہ صاحب ممدوح کی اولاد میں بڑے بڑے نامور علماء واولیاء گزرے ہیں، ازاں جملہ حضرت مولانا سید محمد جی، حضرت مولانا سید محمد عدل عرف شاہ لعل، حضرت مولانا سید محمد حیا، حضرت مولانا شاہ سید محمد ضیا، حضرت مولانا شاہ محمد صابر، حضرت مولانا شاہ ابو سعید، حضرت مولانا شاہ محمد واضح، حضرت مولانا سید قطب الہدیٰ، حضرت مولانا سید محمد ظاہر، حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی، مولانا سید مصطفیٰ، مولانا سید محمد اسحاق، جناب ارشاد مآب امیر المؤمنین سید احمد شہید مجدد مائۃ ثالث عشر کے برکات سے وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو علم وعرفان کی روشنی سے لذت یاب نہیں۔

مجاہد جلیل ومصلح کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ کے انفاس قدسیہ سے جو فائدہ مسلمانوں کو پہنچا ہے اس کی کوئی مثال اور خانوادوں میں نہیں مل سکتی، ہندوستان میں شرک وبدعت کی جو تاریکی پھیل گئی تھی اور جس سے یہاں کا کوئی خانوادہ اور کوئی شہر وقریہ مشکل سے بچا تھا، وہ آپ نے دور فرمائی اور ہندوستان میں دوبارہ نورِ اصلاح چمکا دیا، آپ نے ہندوستان میں جہاد اور احیائے خلافت کا عظیم الشان کام شروع کر کے اس عہد میں اس سنت مردہ کو زندہ کیا، جناب ممدوح کے صدہا خلفاء تھے، مشہور ترین خلفاء کے اسمائے گرامی یہ ہیں: جناب مولانا عبد الحی بڈھانوی، جناب مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی، جناب مولانا سید محمد علی رامپوری، جناب مولانا سید اولاد حسن قنوجی، (والد نواب سید صدیق حسن خان صاحب) جناب مولانا ولایت علی عظیم آبادی، جناب مولانا سخاوت علی جونپوری، جناب مولانا سید جعفر علی بستوی، جناب کرامت علی صاحب ولایت بنگالہ، حضرت حاجی عبد الرحیم ولایتی، جناب میاں جی

نور محمد جھنجھانوی، جناب پیر مرتضیٰ خاں جمعدار، جناب نواب وزیر الدولہ فرماں روائے سابق ریاست ٹونک، یہ سب حضرات صاحبِ ارشاد و صاحبِ سلسلہ ہیں، جناب ممدوح نے ان حضرات کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بھیج کر کفر و بدعت کی بیخ کنی کی، جناب میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے خلفاء میں جناب شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور جناب شیخ محمد تھانوی جیسے بزرگ ہوئے، جن کے خلفاء میں جناب مولانا رشید احمد گنگوہی، جناب مولانا محمد قاسم نانوتوی، قاضی محمد اسماعیل بنگلوری اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی جیسے بزرگ ہوئے، جن کی ذات بابرکات سے ہزارہا مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

جناب مولانا سید عبدالحی صاحب کا سلسلۂ نسب امیر قطب الدین تک اس طرح منتہی ہوتا ہے، مولانا سید عبدالحی بن فخر الدین بن عبدالعلی بن علی محمد بن اکبر شاہ ابن محمد شاہ بن محمد تقی بن عبدالرحیم بن ہدایت اللہ بن محمد اسحاق بن محمد معظم بن قاضی احمد بن قاضی محمود بن قاضی علاء الدین بن امیر قطب الدین محمد ثانی بن صدر الدین ابن زین الدین بن احمد بن علی بن قیام الدین بن صدر الدین بن قاضی رکن الدین ابن امیر نظام الدین بن شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی۔

مولانا مرحوم والدہ ماجدہ کی طرف سے زیدی الواسطی تھے، آپ کا سلسلۂ مادری حضرت شہیدِ کربلا امام حسین تک منتہی ہوتا ہے، اس سلسلہ میں بھی علاوہ ائمہ اہلِ بیت کے کبار اولیاء اللہ گزرے ہیں، ازاں جملہ حضرت مولانا خواجگی کروی، (۱) سید العارفین حضرت سید جیو، حضرت سید احمد محی الدین، حضرت شاہ سید محمد مہدی الواسطی، ان کے علاوہ آپ کے ننھیال میں حضرت مولانا شاہ ابوالقاسم الواسطی اور

---

(۱) وفات ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۳ء حالات وکمالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ثالث۔

ان کے صاحبزادہ حضرت شاہ عبدالسلام الواسطی جو آپ کے ماموں کے چچازاد بھائی تھے، بڑے جلیل القدر مشائخ گزرے ہیں۔(۱)

جدامجد مولانا سید عبدالعلی صاحب

''جناب مولانا مرحوم کے جدامجد مولانا میر عبدالعلی ایک درویش سیرت، فاضل بزرگ تھے اور باوجود تحصیلداری کے فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ سید احمد شہیدؒ کے مرید ومجاز تھے، خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب سرکاری ڈاک آپ کے ہاتھ میں دی جاتی تو روز قیامت میں حساب وکتاب کا پرچہ یاد کرکے رو پڑتے تھے، آپ کو آرٹ کا بہت اچھا مذاق تھا، نقّاشی وخوشخطی کے بہت اچھے نمونے موجود ہیں، آپ کبھی کبھی زیور نیز لکڑی اور لوہے کا سامان شوقیہ بناتے تھے اور نہایت نفیس بناتے تھے، آپ بے روزگار احباب واعزہ کا ملجا وماویٰ تھے، آپ کے اخلاق کریمہ کا تذکرہ اکثر گھرانوں میں اب تک عزت واحترام سے کیا جاتا ہے، آپ شاعر بھی تھے اور عربی میں علیؔ اور فارسی میں ہجرؔ تخلص کرتے تھے''(۲) چونکہ ایک ذہین وذکی اور ہونہار پوتے پر ایک ستودہ صفات اور بلند پایہ دادا کا اثر پڑنا ہر طرح قرین قیاس اور مطابق فطرت ہے، کہ بچپن ہی سے ان کے اخلاق وعادات کا تذکرہ، ان کے خصائل حمیدہ اور اوصاف حسنہ کا چرچا کانوں میں پڑا ہوگا اور لوحِ دل پر نقش ہوگیا ہوگا، اس لئے ہم یہاں ذرا تفصیل سے مولانا کے جدِّ بزرگوار مولانا میر عبدالعلی صاحب کے مزاج ومذاق کا نمونہ اور ان کی زندگی کی تصویر جو ان کے صاحبزادہ مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب نے اپنے قلم سے کھینچی ہے، پیش کرتے ہیں، حکیم صاحب مرحوم ''مہر جہانتاب''

---

(۱) ماخوذ از ترجمہ مصنف (مقدمہ یاد ایام) از مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم (چند لفظی ترمیموں کے ساتھ)

(۲) ترجمہ مصنف ص ۵۔

میں اپنے والد بزرگوار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے دور کے بہت بڑے زاہد ومتقی انسان تھے، تعلقات دنیاوی اور سلسلۂ ملازمت کے باوجود باہمہ، ''دل بیار، دست بکار'' کا نمونہ تھے اور''ہوش دردم، سفر دروطن اور نظر برقدم'' پر عامل تھے، روزانہ نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن کریم اور دلائل الخیرات کے دور کا معمول تھا، اشراق پڑھنے کے بعد مصلےٰ سے اٹھتے، اور عصر تک سرکاری کاموں میں مشغول رہتے، ظہر کی نماز کچہری میں ادا کرتے، نماز عصر کے بعد ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور زبان دعاوتسبیح میں مشغول، مغرب تک اسی حالت میں رہتے اور کسی سے کلام نہ فرماتے، عشاء کی نماز کے بعد احباب واعزہ کے ساتھ کھانا تناول فرماتے (جو اکل حلال سے ہوتا) اگر کسی کا مقدمہ ان کے یہاں ہوتا تو احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکی ضیافت یا نذر وتحفہ قبول نہ فرماتے، منہیات شرعیہ سے غایت درجہ مجتنب تھے...... جہاں تشریف لے جاتے وہاں کے لوگ بھی صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوجاتے اور ان کی برکت سے دینداری کی فضا قائم ہوجاتی، بیعت وخلافت حضرت سید احمد شہید قدس سرہ سے حاصل تھی، بکمال فیاضی وسخاوت، تمام مشاہرہ مستحقین ومسافرین پر صرف کردیتے، اپنے لئے ایک یا دوسادہ جوڑے سے زیادہ کچھ پسند نہ فرماتے، اگر کوئی حاجتمند اُن سے ملتا تو اس کو حتی الامکان نوکر رکھوادیتے اور اسکے

خورد و نوش کی فکر رکھتے، اکثر پیدل چلتے، دوسروں سے خدمت کے روادار نہ تھے، مجلس میں صدر نشین ہوتا اور گفتگو میں اپنی بات اونچی رکھنا پسند نہ کرتے تھے، کسی معمولی آدمی پر بھی غصہ نہ کرتے، غلطیوں سے اکثر و بیشتر اغماض کرتے، ان کے سامنے ان کی دینداری اور خوف الٰہی کے رعب و ہیبت کی وجہ سے کسی میں غلط کام کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ؎

ہیبت حق است ایں از خَلق نیست

ہیبت ایں مرد صاحب دَلق نیست(۱)

غیبت اور جھوٹ سے کوئی واسطہ نہ تھا، کھانے میں کبھی عیب نہ نکالتے، جو چیز سامنے آجاتی کھالیتے، یہاں تک کہ اگر نمک نہ ہوتا تب بھی کچھ نہ کہتے، جب دوسرے شرکائے طعام اظہار کرتے تو معلوم ہوتا، طبیعت میں سادگی اور انکسار اس درجہ تھا کہ کبھی فرشِ نفیس اور بسترِ نرم کے پابند نہ ہوئے، کبھی تخت پر کبھی کرسی پر اور کبھی زمین پر پیر پھیلا لیتے اور تھوڑی دیر سو لیتے، زیرکی، صناعی اور خوشنویسی میں یکتائے زمانہ اور فرید عصر تھے، خط نسخ و نستعلیق بہترین لکھتے اور نفیس طغریٰ بناتے، صنعت نجاری، زرگری اور ترصیع سے بھی واقف تھے، شعر گوئی سے بھی ذوق تھا اور عربی و ریختہ میں اشعار کہتے تھے، عربی میں عَلی تخلص اور ریختہ میں ہجرؔ، حاصل یہ کہ بہ تمام آگہی اتباع احکام شرعی اور فقر و زہد میں زندگی گزار دی اور دمِ واپسیں تک اسی حالت پر قائم رہے، وفات سے پہلے آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ ''هو الرّفيق الأعلىٰ'' تھا، جو ہمارے پیغمبر ﷺ کی زبان مبارک پر ارتحال کے وقت جاری تھا، انتقال مرضِ

(۱) (ترجمہ) خدا کی ہیبت ہے، خلق کی یا کسی صاحب دلق کی نہیں۔

فالج میں ہوا۔

"۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں ناگود(۱) میں انتقال فرمایا اور ظہر کے قریب مسجد عبدالسبحان میں (جو قلعہ کے نیچے واقع ہے اور اس کفرستان میں پہلی مسجد ہے جو خود ان کی سعی سے تعمیر ہوئی) مدفون ہوئے، مولوی سید سراج احمد نصیر آبادیؒ نے جو آپ کے دوستوں میں تھے،ان کی تاریخ وفات حسب ذیل قطعہ سے کہی۔

سید عبدالعلی نیکو سرشت　　رفت چوں از دار دنیا در بہشت

برمزارش نقشبندِ کاف دنوں　　عاش مجداً مات اشواقاً نوشت

انتقال کے وقت آپ کی عمر ۴۸ سال تھی، جو مجداً کے لفظ سے نکل آتی ہے، علاّم الغیوب واقف ہے کہ حاشا میں نے انکی سیرت وتعریف میں باپ ہونے کی وجہ سے کوئی مبالغہ کیا ہو!"(۲)

مولانا کے جدّ مادری مولانا سید سراج الدّین ہسوی

آپ نے اپنے نانا سید سراج الدین ہسوی کا زمانہ نہیں پایا، وہ آپ کی ولادت سے ۹ رسال پہلے ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں وفات پا گئے تھے،لیکن جیسا کہ آپ نے "نزہتہ الخواطر" میں لکھا ہے،آپ نے اپنے نانیہال میں، جہاں آپ کا اپنے بچپن میں اکثر رہنا ہوتا تھا، ان کے اوصاف وکمالات اوران کے خصائل

---

(۱) یہ بگھیل کھنڈ میں ایک ہندوریاست تھی، اب بھی اسی نام سے یہ شہر ہے، جو باندہ (یوپی) سے جانب جنوب ۴۷ میل اور ستنا اسٹیشن سے جانب غرب سولہ میل پر واقع ہے، ناگود اب مدھیہ پردیش میں ہے،اس سے مراد ناگور نہیں ہے جو راجپوتانہ کا ایک مردم خیز شہر تھا اور جس سے حضرت شیخ حمید الدین ناگوری اور ابوالفضل فیضی کے نامور باپ ملاّ مبارک کا تعلق ہے۔

(۲) مہر جہاں تاب (فارسی)

وعادات کا تذکرہ کثرت سے سنا تھا اور جب پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو ان کی تصنیفات سے استفادہ کیا،(۱) اس لئے آپ کے دل ودماغ پر اس کا اثر پڑنا بھی لازمی اور قدرتی تھا کہ ماں کی گود اور زیادہ بچپن کے سنے ہوئے واقعات کا مختصر تعارف وتذکرہ بھی ضروری ہے۔

''مولانا سید سراج الدین، مولانا سید مہدی کے صاحبزادہ تھے اور ہسوہ ضلع فتحپور کے مشہور خاندان سادات کے چشم وچراغ تھے، اس خاندان کا پدری سلسلہ حضرت زید شہید اور مادری سلسلہ حضرت اسماعیل بن جعفر صادق پر منتہی ہوتا ہے، یہ حضرات زیدی واسطی مشہور ہیں، کہ ان کے مورث واسط سے ہندوستان منتقل ہوئے، والد مرحوم کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہو گیا، حصول علم کے شوق میں کم سنی میں لکھنؤ چلے گئے، مولانا حکیم حیات اور دوسرے علمائے لکھنؤ سے درسیات کی تعلیم حاصل کی، بیعت حضرت سید احمد شہیدؒ سے کی، جن کے خاندان سے اس خاندان کی قرابتیں چلی آرہی تھیں، پھر حضرت سید صاحب کی تعلیمات اوران کے طریق کی خصوصیات کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور مدت العمر اسی مسلک اور ذوق پر قائم رہے، ان کی زندگی میں تورّع اور زہد، مردانگی اور بلند ہمتی، بذل وسخا، نمایاں اوصاف تھے، اللہ تعالی نے اس جوار میں بڑا اعزاز واقتدار عطا فرمایا تھا، ان کی بہت سی خوبیاں اور واقعات ان اطراف میں زبان زد خلائق

(۱) نزہۃ الخواطر ج ہفتم ص/۱۹۶۔

تھے، عبادت وزہد اور خدمت وافادہ میں بڑی نیک نامی کے
ساتھ زندگی گزار کر ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۷۷ھ ۱۲ نومبر ۱۸۶۰ء کو
وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے، ان کے
نواسہ مولانا سید عبدالحی صاحب کی نکالی ہوئی تاریخ ہے۔

رضي الله عن عبده (۱)

مولانا سید سراج الدین اور ان کے سب گھر والوں پر حضرت سید صاحب کی بیعت وتعلق اور صحبت کے اثرات نمایاں تھے، اور خدا کی راہ میں جہاد وشہادت، زندگی کا ایک ایسا مقصد اور آرزو بن گئی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لئے جو لوریاں اور موزوں الفاظ کہتی تھیں، وہ بھی اس جذبہ اور تمنا سے خالی نہیں تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب فرماتے تھے کہ میری نانی صاحبہ (جو خود بھی حضرت سید صاحب سے بیعت تھیں) مجھے یہ لوری سنا سنا کر سلاتی تھیں (۲)۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

آپ کی نانی صاحبہ کو جن کا نام سیدہ حمیرا تھا اور سید علم الہدیٰ حسنی نصیر آبادی کی صاحبزادی تھیں، یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ ان کو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کی صاحبزادی سے (جن سے غالباً سفر حج میں ملاقات ہوئی تھی، شاہ صاحب کی مقبول عام تفسیر موضح القرآن کی روایت واجازت تھی، ان کے نواسہ مولانا سید عبدالحی

---

(۱) ''نزہۃ الخواطر'' جلد ہفتم ترجمہ سید سراج الدین ہسوی ص/۱۹۶

(۲) روایت الحاج منشی محمد خلیل صاحب نہٹوری مرحوم (منشی صاحب، مرحوم مولانا عبدالحی صاحب کے مخصوص ترین احباب اور ہم نشینوں میں تھے۔)

صاحب کوانہیں سے روایت واجازت حاصل ہوئی (۱)

مولانا سید عبدالحی صاحب کی یہ نانیہالی شاخ مولوی سید عبدالعزیز (فرزند مولانا سید سراج الدین صاحب) کی ہوشمندی، حسن انتظام اور لیاقت کیوجہ سے صاحب جائداد واملاک تھی اور آپ کے بچپن میں یہاں نسبتاً آسودہ حالی اور فارغ البالی تھی اور قرب وجوار میں اس حیثیت سے وہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

والد ماجد مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب

آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید فخر الدین کے تذکرہ وتعارف کے سلسلہ میں ہم اس تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں، جوخود ان کے فرزند مولانا سید عبدالحی صاحب نے اپنے قلم سے کیا ہے، کہ ایک صاحب نظر مؤرّخ اور کہنہ مشق سوانح نگار ہی اپنے موئے قلم سے کسی باکمال شخصیت کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے، اوراس کے چہرے کے حقیقی خط وخال کونمایاں کرسکتا ہے، خصوصیت کے ساتھ جب کہ اس کوتعلق فرزندی کی وجہ سے قرب واختصاص بھی حاصل رہا ہو جوکسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوسکتا، مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

> ''والد مرحوم کی ولادت تکیہ شاہ علم اللہ، بیرون شہر رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں ہوئی، کم سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ ناگود تشریف لے گئے جہاں ان کے والد ماجد تحصیلدار تھے، وہیں فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں مولوی سید محمد طٰہٰ نصیرآبادی اور حکیم احمد جان دہلوی سے پڑھیں، تیرہ برس کا سن تھا کہ ان کے

(۱) ''نزھۃ الخواطر'' جلد ہفتم ص/ ۲۹۶۔ اس زمانہ میں علاوہ کتب حدیث کے، دوسری تصنیفات کی بھی سند لینے اوران کے مصنفین تک اس کو پہنچانے کا اہل علم میں رواج تھا۔

والد کا انتقال ہو گیا، سرکار نے ان کی خدماتِ جلیلہ پر نظر کر کے کچھ وظیفہ تعلیم مقرر کر دیا، جو عرصہ تک والد مرحوم کو ملتا رہا۔

ناگود سے آنے کے بعد اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر مرحوم کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی اور شرح وقایہ تک ان سے اور مرزا رحیم اللہ بریلوی سے وطن میں رہ کر تعلیم پائی، اپنے نانا کی وفات کے بعد لکھنؤ تشریف لائے اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے شروع کیں، شعر وسخن کا ذوق ناگود میں حکیم احمد جان کی صحبت میں پیدا ہوا تھا، پھر اپنے نانا سید محمد ظاہر کی صحبت میں ترقی ہوئی، وہ علمی فضل وکمال کے ساتھ فارسی واردو خاص کر بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے، لکھنؤ پہنچ کر وہ شوق تازہ ہو گیا، شیخ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہوئے اور تین برس مسلسل لکھنؤ میں رہ کر متعدد علوم وفنون کی تحصیل کی، اور خطاطی میں بھی کمال پیدا کیا، نسخ ونستعلیق وشفیعہ بہت اچھا لکھتے تھے، اور ان کے شکست میں عجیب طرح کی شیرینی تھی۔

لکھنؤ سے وطن گئے اور چند روز وہاں رہے، اس کے بعد وجہ معیشت حاصل کرنے کو باہر نکلے، چند روز راجپوتانہ اور چند روز ساگر میں رہے، ساگر میں مہتمم بندوبست کے اجلاس میں نائب سرشتہ دار ہو گئے تھے، مگر شاید سال ڈیڑھ سال کے بعد کسی بات پر برہم ہو کر نوکری چھوڑ دی اور وطن چلے آئے، کچھ

دنوں رہ کر حیدرآباد روانہ ہوگئے۔

اس زمانہ میں ہر جگہ ریل نہیں تھی، یہاں سے حیدرآباد تک کہیں گھوڑے پر کہیں ریل پر، کہیں بہلی اور تانگہ پر، شاید بیس دن میں امراوتی پہنچے تھے، حیدرآباد میں چند روز کی امیدواری کے بعد کسی اسکول میں صدر مدرس مقرر ہوگئے، اور تقریباً آٹھ برس تک مختلف اضلاع میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔

ضلع بیدر میں سید محمود اصفہانی حریف متخلص سے شناسائی ہوئی، یہ وہاں صدر مدرس تھے اور وہ صدر تعلقہ دار (کمشنر) کے میر منشی تھے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ان سے فارسی زبان اور محاورہ کی تصحیح کی اور جب تک وہاں رہے ان کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔

حیدرآباد سے بوجہ بُعد مسافت ترک تعلق کر کے وطن آگئے، اور ڈیڑھ سال وطن میں رہ کر بھوپال تشریف لے گئے، وہاں بھی چند سال رہے، جب وہاں سے آئے تو عرصۂ دراز تک کہیں نہیں گئے، مرحوم کی عادت تھی کہ رخصت لے کر بہت کم آتے تھے، جب کہیں رہتے رہتے دل گھبرا جاتا تو نوکری چھوڑ کر چلے آتے تھے۔

عرصۂ دراز تک وطن میں رہتے رہتے جب دل گھبرایا تو ٹونک تشریف لے گئے، وہ بھی مثل وطن کے تھا، اکثر اعزہ دو دو چار چار پشت سے رہتے رہتے وہیں کے ہوگئے تھے، نواب ابراہیم علی خاں نے صیغۂ طبابت سے تنخواہ مقرر کردی، ڈیڑھ

سال رہنے کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں زندگی پوری کردی، بیعت وطریقت اپنے پھوپھا مولانا سید خواجہ احمدؒ سے کی تھی، ان کی طرف سے نیز اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر صاحب کی جانب سے خلیفۂ مجاز تھے، اور ذکر و شغل خاندانِ نقشبندیہ کے طریقہ پر کرتے تھے، مگر پیری مریدی نہیں کرتے تھے۔

مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی، انتہا درجہ کی تھی، برادرانہ جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں تھا، ہر شخص سے دوست یا دشمن اچھی طرح سے ملتے تھے، اور کسی سے پرخاش نہ رکھتے، صبر وقناعت کی صفت ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور، انکو چھو کر نہیں گیا تھا، ایک چمار یا کولی رات کے وقت آتا تو گھر سے نکل کر اس کا حال پوچھتے، اگر وہ کسی مریض کے دکھانے کو لے جانا چاہتا تو اسی وقت اس کے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اس کو دیکھتے اور دوا بتاتے، ایک زمانہ میں طاعون بڑی شدت سے پھیلا ہوا تھا، گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہوئے تھے، مرد وعورت، لڑکے بوڑھے، سب جھونپڑوں میں پڑے ہوئے تھے، ان جھونپڑوں میں خود جاکر بیمار کو دیکھتے اور دوا بتاتے، ایک مرتبہ اتفاق سے میں بھی حاضر تھا، مجھے ساتھ لے کر تشریف لے گئے اور دیر تک گنواروں کو سمجھاتے اور دوا بتاتے رہے، اس تنگ جھونپڑی میں دیر تک

مریض کے پاس کھڑے رہنے سے جو تکلیف مجھے ہوئی تھی، وہ آج تک یاد ہے۔

طبیعت میں کاہلی نام کو نہ تھی، جو کام جس وقت کرنے کا ہوتا، اسی وقت انجام کو پہنچاتے، ایک شخص نبض دکھا رہا ہے، اس کے مرض کی تشخیص کر کے نسخہ لکھ دیا، ایک نے کہا مجھے تعویذ لکھ دیجئے، اس کو تعویذ لکھ دیا، ایک کھڑا ہے کہ اس طرح پر مجھے غزل لکھ دیجئے، کوئی کسی کی ولادت یا وفات کی تاریخ یا شادی کی منظوم نوید لکھوانے آیا ہے، ہر ایک کی فرمائش پوری کر رہے ہیں، پڑھنے والے کتاب لئے بیٹھے ہیں، انکے سبق شروع ہو گئے، گھر میں ان کا خلوت خانہ علاحدہ تھا، وہاں صرف ایک مشغلہ تھا، کتب بینی اور تصنیف و تالیف۔

تصنیفات کا ایک دفتر بے پایاں تلف ہو چکا ہے، جو نام مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں: "تاریخ بگھیل کھنڈ" (اردو) ناگود میں لکھی تھی، "چمنستان اردو" اردو صرف و نحو کی بسیط کتاب، ناگود یا ساگر میں لکھی تھی، "جوش دل" اردو کا پہلا دیوان، "پریم راگ" بھاشا کا دیوان، "دیوان فارسی" اور "رقعات فخریہ" دونوں حیدر آباد میں لکھے تھے، کیا عجب ہے کہ ان دونوں کی نقلیں ان کے حیدر آبادی شاگردوں کے پاس ہوں، "دیوان خیالی" تیسرا دیوان اردو کا جس کو بھوپال میں ترتیب دیا تھا، "مثنوی بہار تسلیم جان فخر" "فغان فخر" تینوں مثنویاں لکھنؤ میں یا وہاں سے آنے

کے بعد وطن میں لکھی تھیں، ان میں سے ''فغان فخر'' ذو بحرین تھی، ان کے مسودے میرے بچپن تک موجود تھے۔

والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ عجیب کتاب ''مہر جہاں تاب'' ہے، فارسی زبان میں فل اسکیپ کی تقطیع میں پہلی جلد تیرہ سو صفحوں پر تمام ہوئی، دوسری جلد آدھی تھی، کہ عمر نے وفا نہ کی، پہلی جلد میں تین دفتر ہیں، دفتر اول میں علوم وفنون، متعارف وغیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں، جس طرح سے سیوطی نے ''نقایہ'' اوراس کی شرح میں لکھے ہیں، دوسرے دفتر میں انبیائے کرام، اہل بیت، صحابہ، تابعین، محدثین، علماء وحکماء اور مشائخ کے حالات جدا جدا قلمبند فرمائے ہیں، تیسرے دفتر میں عربی فارسی اردو اور بھاشا کے شاعروں کے تذکرے علاحدہ علاحدہ درج کئے ہیں۔

دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی، جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا، یہ جلد آدھی ہو چکی تھی کہ ان کو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کا زمانہ نے ورق الٹ دیا ہے اور چند دنوں میں کوئی اس کا سمجھنے والا بھی نہ رہے گا، اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہوگئی، چند دنوں کے لئے قلم رکھ دیا، پھر اپنی گزشتہ محنت پر تأسف ہوا اور اردو میں ازسر نو لکھنا شروع کیا، دس بارہ جز لکھ

چکے کہ داعی حق کو لبیک کہہ کر خلد بریں کو سدھارے۔

ایک کتاب ان کی ''سیرۃ السادات'' فارسی میں ہے، اس میں بھی بڑی تفصیل کے ساتھ سادات کی بہت سی شاخوں کا نسب نامہ دیا ہے، اور جن بزرگوں کے حالات ملے ہیں، ان کو بھی ساتھ ساتھ لکھتے گئے ہیں، اس کتاب کا شمار بھی ان کی بہترین تصنیفات میں ہے۔

ایک اور کتاب فارسی ''سیرت عَلَمیہ'' ہے، اس میں سید شاہ علم اللہؒ کے حالات اور ان کے خاندان کے تمام علماء و مشائخ اور سادات کے حالات بیان کئے ہیں، یہ بھی بہت مفید اور عمدہ کتاب ہے۔

ایک کتاب عربی میں ''سبیل النجاۃ'' ہے، اس میں ہر قسم کی دعائیں جمع کی ہیں، اور بطور حزب الاعظم کے اس کو احزاب پر تقسیم کیا ہے اور بین السطور ترجمہ اس کا اردو میں کر دیا ہے، ایک کتاب ''مجربات خیالی'' اردو میں ہے، اس میں وظیفے، دعائیں اور خاندانی اعمال، ہر ایک مرض اور ہر ایک حاجت کے جمع کئے ہیں، ''فخر المطالب'' سیوطی کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہے، ''ایمان ابوین'' کی بحث میں، یہ کسی کی فرمائش سے کیا تھا، شاہ ولی اللہؒ کی ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' کا ترجمہ بھی اردو میں کسی کی فرمائش سے کیا تھا، اور حاشیہ پر فوائد لکھے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں ''شرح وقایہ'' کا حاشیہ عربی میں لکھنا

شروع کیا تھا، اس کے اجزاء بطور مسودہ کے موجود ہیں۔

شعروسخن میں جو کتاب میں نے پائیں یا چھپ گئی ہیں، ان میں "دیوان فخر" حضرت کا دوسرا دیوان ہے، جو لکھنؤ میں مرتب کیا تھا، یہ مجھے اتفاقاً ان کے ایک شاگرد سے مل گیا، اس میں چند قصیدے، غزلوں کا دیوان، نامے، مسدس، رباعیاں، اخیر میں مناظرۂ شب وروز، اردو نثر میں ہے، مثنوی "ماہ خورشید" بھوپال میں غلام احمد فروغی کی فرمائش سے لکھی تھی، تقریباً پانچ ہزار شعر کی کتاب ہے، اس کا ناتمام مسودہ میرے پاس ہے، کتاب صاف کر کے فروغی کو دیدی تھی، معلوم نہیں انھوں نے کیا کی، "مثنوی نگار خانہ چین" فروغی کی فرمائش سے بھوپال میں لکھی تھی، یہ بھی "ماہ وخورشید" کے برابر ہے، اس کو فروغی نے چھپوالیا تھا، "مسدس خیالی"، "مسدس حالی" کے جواب میں مولوی عبدالعلی آسی مدراسی نے لکھوائی تھی، اور انھیں نے اس کو چھاپ دیا ہے، "نثر خیالی" سہ "نثر ظہوری" کے طرز پر لکھی گئی تھی، فروغی نے احمد جان صوفی کے مطبع میں چھپوایا تھا، مگر اب ملتی نہیں، "منجیات خیالی" کا ایک مختصر مجموعہ نعت کی غزلوں کا میں نے چھپوایا تھا، اس کے اور ٹکڑے مثلاً "واردات خیالی" وغیرہ ابھی رکھی ہوئی ہیں، یہ اخیر زمانہ کی تصنیفیں ہیں، جب کہ ان کی شاعری کا ذوق جاتا رہا تھا، بچوں اور عورتوں کی فرمائش سے ان کے مناسب حال کچھ فرمادیا کرتے تھے۔

شروع میں اردو فارسی اشعار میں فخرؔ اور بھاشا میں میرؔ تخلص تھا، حیدرآباد میں اردو فارسی میں خیالیؔ تخلص قرار دیا، جو اخیر زمانہ تک قائم رہا، عربی میں بھی کبھی کبھی تغزل یا مناجات کے اشعار نظم فرمایا کرتے تھے، "مہر جہاں تاب" میں اس کا بھی انتخاب کیا ہے، مگر وہ بہت تھوڑا ہے، شاید تیس، چالیس شعر ہونگے، راجپوتانہ کی کسی ریاست میں جب چند روز رہنے کا اتفاق ہوا تو ہندی بھی سیکھ لی تھی اور بے تکلف اس میں لکھتے پڑھتے تھے۔

ان کے حالات زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے ذہین وذکی تھے، جس طرف توجہ کرتے تھے اس کو بآسانی حاصل کر لیتے تھے، حافظہ کمزور تھا، مقرر بھی نہ تھے، اس کے ساتھ طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا، اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا اور بایں ہمہ کمالات علمی وعملی، وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے اور آخر کار ۱۰؍ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ مطابق ۶؍ اکتوبر ۱۹۰۸ء سہ شنبہ کو تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ کر وفات پائی۔" (۱)

ان علمی کمالات کے ساتھ (جن کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ مولانا سید عبدالحی صاحب کے مضمون میں آگیا ہے) باطنی کمال سے بھی مالا مال تھے، اور وہ ان علمی کمالات سے زیادہ مستور ومخفی رہے، حضرت مولانا سید خواجہ احمدؒ نے بڑی

(۱) تذکرہ گل رعنا ضمیمہ ۱۲؍ از ص ۵۲۴ تا ص ۵۳۷ طبع چہارم (انتخاب واختصار کے ساتھ)

خصوصیت وتوجہ سے ان کی باطنی تربیت کی تھی، ''مہر جہاں تاب'' میں لکھتے ہیں کہ ''بعض اوقات میری طبیعت کچھ خراب ہوتی اور مجھے ضعف وتعب ہوتا تو میری تکلیف کا بغیر میرے اظہار کئے ہوئے، اپنے وجدان وفراست سے ادراک فرما لیتے اور فرماتے کہ ''آج میرے سر میں درد ہے آج حلقہ نہیں ہوگا''

رمضان کے عشرۂ اخیر میں حلقۂ مراقبہ تہجد کی نماز کے بعد ہوتا تھا، ایک رات آپ نماز کے بعد کچھ دیر آرام فرمانے لگے، خواجہ فیض اللہؒ نے جو آپ کے خلیفۂ اعظم اور سر حلقہ تھے، فرمایا جس کا جی چاہے حضرت سے اجازت لے کر آجائے حلقہ ہوتا ہے، چنانچہ سب رفقاء آپ کے حلقہ میں شریک ہوگئے میں بھی شریک ہوا لیکن مجھے قلق تھا کہ میں تو دامنِ خاص سے وابستہ ہوں، آج یہ بے التفاتی کیوں فرمائی گئی، میں حلقہ میں شریک رہا، لیکن اس فکروتردد سے مجھے خاطر خواہ فائدہ اور انشراح قلب حاصل نہ ہوا، حلقہ کے اختتام کے بعد جیسے میرے اس خیال کا انعکاس ہوا، حضرت نے مجھے فرمایا کہ آؤ کچھ دیر میرے پاس بیٹھو، آپ نے خاص توجہ دی، دوسرے رفقاء بھی شریک ہوئے اور مجھے خاص حظ اور لطف حاصل ہوا اور دل کی گرہ کھل گئی۔

''ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب (۱) صاحبؒ کا بڑے ذوق ووجد کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم بیعت کی دوبارہ تجدید کرو اور وہ نسبت جو مجھے پیر معنوی مولانا محمد یعقوب نوراللہ مضجعہ سے پہنچی ہے، تمہیں عطا کروں، بندہ نے عرض کیا حبًا وکرامۃً، فرمایا اس ماہ مبارک کی ستائیسویں شب کو جو شب

---

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے اور استاد الہند حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے چھوٹے بھائی جن سے مولانا خواجہ احمد صاحب کو اجازت طریقت حاصل تھی۔

قدر ہے اس کو لکھ کر دوں گا اور اس طریق کے صیغے جو دوسرے
طریقوں سے ہیں زبانی بتلا دوں گا، چنانچہ اس شب مبارک میں
یہ وعدہ پورا ہوا اور وعدہ سے بڑھ کر مجھ پر الطاف ہوئے جو میں
اپنی پر تقصیر زبان سے ظاہر نہیں کر سکتا۔" (۱)

باوجود اس کے کہ حضرت مولانا خواجہ احمد صاحبؒ سے خلافت واجازت رکھتے تھے، منازل وسلوک سے بخوبی آگاہ اور ہمیشہ ذکر وشغل اور نوافل میں مشغول رہے مگر کبھی کسی کو بیعت نہیں کیا، اور نہ اپنے کو مشیخت اور ارشاد کا اہل سمجھا۔

"سیرۃ السادات" میں اپنے برادر طریقت حضرت سید ضیاء النبیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ اس خاکسار راقم اور شاہ ضیاء النبی صاحبؒ نے ایک ہی دن میں حضرت مولانا خواجہ احمد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ تو اپنی مراد کو پہنچے اور میں ناکام ونامراد بیٹھا ہوں، باوجود اس کے کہ مجھے حضرت مولانا سے خلافت واجازت حاصل ہوئی اور ان کو صرف بیعت کا شرف حاصل تھا، لیکن ۔

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت وما در کو چہار سوا شدیم

اسی کتاب میں اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) سیرت السادات

''عمر کا آفتاب چھیاسٹھویں منزل پر پہنچا، بظاہر اس کے غروب کا وقت قریب ہے، بیعت وطریقت مقتدائے زمانہ حضرت مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی کے دست حق پرست پر ہوئی، لیکن اس سلسلہ کی نسبت بھی آپ سے کرتے ہوئے ایسی شرم آتی تھی جیسا کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ سے خاندان ونسب کی نسبت کرتے ہوئے اپنی ناخلفی کا شدت سے احساس ہوتا ہے، کیونکہ ساری عمر بے عملی اور نا اہلی میں گزاری اور اب جب کہ زندگی کا آفتاب لب بام ہے، اب بھی نافرمانیوں اور گناہوں سے رہائی نہیں ہوئی، ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا کہ دل گناہوں کے خیال سے خالی ہو، اگر طاعات میں سے کسی چیز کی توفیق بھی ہوئی تو کردہ ناکردہ برابر ہے اور ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ منہ پر نہ ماردی جائے، اس یاس میں اگر کچھ آس بنتی ہے تو محض اس سے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ﴿قل یا عبادي الذین أسرفوا علیٰ أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله﴾ نیز یہ ارشاد ربانی ہے ﴿إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات ألحقنا بهم ذریّتهم﴾ اور یہ ارشاد نبوی ﷺ ہے ''الطالحون لي'' اگر آخری وقت میں حسنِ خاتمہ نصیب فرمادیں تو محض ان کا لطف وکرم ہے، ورنہ دوزخ کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ﴿کل امرئ بما کسب رهین﴾''

یہ تمنا کس طرح پوری ہوئی، اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے، خوش قسمتی سے

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی ایک فارسی تحریر قدیم کاغذات میں مل گئی جو غالباً بطور یادداشت کے اپنے والد مولوی حکیم سید فخرالدین صاحب کی وفات کے دوسرے ہی دن لکھی گئی ہے، جس میں ان کی بیماری کا مختصر حال اور ان کی وفات کا چشم دیدہ واقعہ اور اس وقت کی کیفیت درج کی گئی ہے، اس تحریر سے ان کا روحانی پایہ اور ان کے تعلق باللہ کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور بزرگان سلف کے دنیا سے ارتحال کے حالات و واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، مولانا مرحوم فرماتے ہیں:

''۴ر رمضان المبارک کو بخار لرزہ کے ساتھ آیا، عادت کے مطابق اسہال کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا، دوسرا دن یوم الراحۃ تھا، تیسرے روز پھر تپ لرزہ کے ساتھ ہوا، اس قدر اسہال واستفراغ آئے کہ ضعف وناطاقتی سے شدید بے ہوشی ہوئی، بالکل غافل ہوگئے، یوم الراحۃ کو بھی نقل وحرکت کی طاقت نہ تھی، اسی طرح سے دن بدن ضعف جسمانی کا غلبہ ہوتا چلا گیا، ساتواں دن جو یوم الراحۃ اور جوڑی نہ آنے کا دن تھا، تمام دن ہوشیار و بیدار رہے اور اپنے ہاتھ سے گولیاں اور دوا قلم دان سے نکال کر مریضوں کو دیتے رہے، جیسا کہ ہمیشہ کا معمول تھا اور بیری کی لکڑی جس پر کچھ لکھا ہوا تھا، بازو پر باندھنے کے لئے عنایت فرماتے رہے، شام کو پھر اسہال کا سلسلہ شروع ہوگیا، ہر اسہال نئی کمزوری پیدا کر دیتا تھا، یہاں تک کہ مغرب کے بعد نبض ساقط ہوگئی اور سوائے سانس کی آمد وشد کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہی، رات کو دس بجے یک بیک جنبش پیدا ہوئی

اور دائیں پہلو کی طرف خود بخود جھک گئے اور قلب جاری ہوگیا، اور اس میں اتنی شدت وحدت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلہ سے لفظ مبارک ''اللہ'' سنا جاسکتا تھا، قلب مبارک میں ایسی جنبش تھی کہ گویا ایک ایک بالشت اچھلتا تھا، یہ حال رات کے ایک بجے تک رہا، اس کے بعد اضمحلال پیدا ہوگیا، اس وقت فقیر نے حاضر الوقت اصحاب سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھیں، اس کے شروع ہوتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہوگیا، دوبارہ پڑھنے کی نوبت آئی، پھر حاضرین نے تلقین شروع کی، حضرت نے ذکر لسانی شروع فرمادیا، لبوں اور زبان کی حرکت دیکھنے سے اور آواز قریب جانے سے سمجھ میں آتی تھی، لفظ مبارک ''اللہ'' پوری تجوید کے ساتھ ادا فرمارہے تھے، جیسا کہ زندگی میں عادت مبارک تھی، آخر حالت تک ذاکر رہے، دمِ واپسیں کے وقت فک اسفل (نیچے کا جبڑا) اوپر ہوگیا اور زبان اسمِ ذات کے ادا کرنے کے لئے متحرک ہوئی مگر پورے طور پر وہ ادا نہیں ہوسکا تھا کہ جان، جان آفریں کے سپرد کردی ۔

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار
دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

وہ رات ہم لوگوں کے لئے شب قدر تھی، محسوس ہوتا تھا کہ ملائکۂ رحمت ہر طرف سے ہجوم کئے ہوئے ہیں، تنہائی سے کوئی وحشت اور ایسے شفیق باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کوئی صدمہ نہ تھا، قلب

میں صاف بسط وانشراح محسوس ہوتا تھا، بے ساختہ الحمد للہ، الحمد للہ زبان پر جاری تھا، احباب تسبیح وتہلیل میں مصروف تھے اور نماز تہجد پڑھ رہے تھے، ایک ایسی حالت تھی کہ تحریر میں اس کو لانا مشکل ہے، فقیر نے ایسی کیفیات تمام عمر مشاہدہ نہیں کیں، یہ چہار شنبہ کی شب ۱۰ ررمضان المبارک ۱۳۲۶ھ مطابق ۶ را کتوبر ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے، اس وقت والد مرحوم کی عمر ۷۱ رسال تھی۔"

مولانا نے اپنے پسماندگان میں پہلی بیوی عزیز النساء بنت مولوی سراج الدین ہسوی سے ایک صاحبزادہ مولانا سید عبدالحی اور ایک صاحبزادی شمس النساء، جنہوں نے نوجوانی میں ناکتخدہ انتقال کیا اور دوسری بیوی بی بی حلیمہ بنت مولوی سید عبدالقادر سے ایک صاحبزادہ حافظ سید محمد صابر (۱) اور دو صاحبزادیاں، شمس النساء زوجہ مولوی سید طلحہ صاحب حسنی ٹونکی، فاطمہ بی بی زوجہ سید محمد یوسف مرحوم کو چھوڑا۔

خاندان کا اصل اثاثہ اور سرمایۂ فخر

مولانا سید عبدالحی صاحب کے خاندان اور قریبی اجداد کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے اس بات کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے مولانا کی اس پدری شاخ کا امتیاز وسرمایۂ فخر، جائداد، املاک اور مرفہ الحالی کبھی

---

(۱) حافظ سید محمد صابر ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں دیو بند گئے اور وہاں قرآن شریف حفظ کیا، ان کے ساتھ ان کے بھتیجے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جو ان سے پانچ سال بڑے تھے اور شیخ الہند سے درسیات کی تعلیم حاصل کی، سید محمد صابر صاحب کا عنفوان شباب تھا کہ ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۴ رسال تھی، مولانا محمود حسن صاحب کے متعدد خطوط میں جو ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے نام ہیں، سید محمد صابر مرحوم کا بڑی محبت کے ساتھ تذکرہ ہے۔

نہیں رہا، زیادہ تر بزرگوں اور آبائے کرام کی زندگی، کفاف اور قوت مالا یموت پر بسر ہوئی، زہد وایثار اس شاخ پر ثمر کا شیوہ رہا، خاندان میں یہ گھرانہ مولویوں کا گھرانہ کہلاتا تھا، آپ کے جد امجد مولانا میر عبدالعلی صاحب اگرچہ اس زمانہ کے معیار وعرف کے مطابق (متوسط درجہ کے) ایک معزز عہدہ پر فائز تھے، لیکن ان کا حصہ ان کے مشاہرہ میں (جو اس زمانہ کی عام ارزانی اور برکت کے لحاظ سے معقول تھا) بہت قلیل اور محدود تھا، تنخواہ کا بڑا حصہ مہمانداری اور اہل خاندان کے ساتھ حسن سلوک میں صرف ہوتا تھا، آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ عسرت اور بے اسبابی میں بسر ہوا، اپنی طبیعت کی افتاد ومزاج کے مطابق ساری عمر آراستہ مزاج اور آزاد رہے، حصولِ معاش کے لئے کبھی جد وجہد نہ کی، میری والدہ مرحومہ اکثر بیان کرتی تھیں کہ ان کی آمد تک اس گھر میں فاقہ ہو جانا اور صبر وتوکل کے ساتھ وقت گزار دینا، کوئی نئی بات نہ تھی۔

باغات وجائداد کے بجائے اس گھر کا سب سے قیمتی اثاثہ اور بزرگوں کا عطیہ وہ کتابی ذخیرہ تھا، جو کئی پشتوں سے اس خاندان میں محفوظ چلا آرہا تھا، اور اس کے افراد اس کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے، اس خاندان کے جد امجد مولانا سید ہدایت اللہ صاحب جن کی آٹھویں پشت میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب ہوئے ہیں، خود عالم وصاحب تصنیف تھے، (۱) ناچیز راقم سطور نے خود بعض قلمی رسائل پر جو بعض فقہی مسائل کے موضوع پر ہیں، والد مرحوم کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر پڑھی کہ "یہ رسائل

(۱) مولانا سید ہدایت اللہ صاحب کے متعلق خاندان کے بعض تذکروں میں یہ تحریر ہے کہ وہ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں وزیر اوقاف اور صدر الصدور امور مذہبی تھے، لیکن یہ امر ابھی علمی اور تاریخی طور پر ثبوت کا محتاج ہے، اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

ہمارے جدامجد مولانا سید ہدایت اللہ صاحب کے تحریر کئے ہوئے ہیں، فرزندانِ سعادت مند سے امید ہے کہ ان کی حفاظت ونگہداشت سے غفلت نہ برتیں گے۔''

جہاں تک اندازہ ہے، اس شاخ میں دینی علم نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا، مولانا سید عبدالعلی نصیرآبادی کی شادی حضرت مولانا سید محمد ظاہر صاحب کی دو صاحبزادیوں سے یکے بعد دیگرے ہوئی، اور اسی تعلق سے وہ نصیرآباد سے ترک سکونت کر کے دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی منتقل ہوئے، جہاں گیارہویں صدی کے آخر سے ان کے خاندان کی ایک مقتدر شاخ اور ان کے بنی اعمام سکونت پذیر تھے، مولانا سید محمد ظاہر حسنی، حضرت شاہ علم اللہؒ کی پانچویں پشت میں ہیں، وہ علوم ظاہری وباطنی میں یکساں کمال رکھتے تھے، بلند پایہ فقیہ اور اس دیار میں مرجع فتاویٰ تھے، ان کے فتاویٰ مشرقی اضلاع میں سند اور مسئلہ میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے تھے، اور فصلِ خصومات میں ان کا قول، قولِ فیصل مانا جاتا تھا، بھاشا کے قادر الکلام شاعر تھے، کلام تمام تر عارفانہ اور عاشقانہ تھا، جو محض عشق الٰہی کے جذبات کا ذریعہ تھا، وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفائے کبار میں تھے، سید صاحب کے طریق تربیت وسلوک میں ان کا رسالہ ''خیر المسالک'' یادگار ہے، (۱) فنون سپہ گری اور طب وحکمت میں بھی ان کو دستگاہ حاصل تھی، مولانا محمد ظاہر صاحب کو ان کے حقیقی چچا مولانا سید قطب الہدیٰ محدث نے، جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے ممتاز شاگردوں میں

---

(۱) حضرت سید صاحب کو آپ سے خصوصی تعلق تھا، مولانا سید جعفر علی نقوی نے ''منظورۃ السعداء'' میں ذکر کیا ہے کہ میں جب ہندوستان سے جہاد کی نیت سے ہجرت کر کے مرکز مجاہدین اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے لشکر گاہ میں پہنچا تو سلام ومصافحہ کے بعد مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ ''تکیہ پر سب خیریت ہے؟'' دوسرا سوال یہ تھا کہ ''مولوی سید محمد ظاہر صاحب اچھے ہیں؟'' اس واقعہ سے اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے جو سید صاحب کو مولانا محمد ظاہر صاحب سے تھی۔

تھے، اور علم و فضل کے ساتھ بڑے خطاط اور خوشنویس بھی تھے، اور انھوں نے حدیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی کو اپنے قلم سے لکھ کر حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلسِ درس میں تقریروں اور ان کی تحقیقات سے مزین کیا ہے اور خود بھی متعدد رسائل کے مصنف ہیں، (لاولد ہونے کے سبب) اپنے پورے کتب خانہ اور علمی متروکات کا وارث بنایا، یہ تاریخی ہبہ نامہ(۱) جس پر حضرت سید احمد شہیدؒ اور تمام بزرگان خاندان کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، ہمارے خاندانی قلمی مرقع کی ابھی تک زینت بنا ہوا ہے، اس کتابی ذخیرہ میں جو زیادہ تر قلمی کتابوں اور نادرالوجود مخطوطات پر مشتمل تھا، صاحب علم ورثاء برابر اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مولانا حکیم سید عبدالحی کی زندگی میں اس نے ایک وسیع اور مستقل کتب خانہ کی شکل اختیار کرلی، اس خاندان کو اس قیمتی ذخیرہ پر ہمیشہ ناز رہا، اور ہر دور میں اس کے افراد اس کو سینہ سے لگائے رہے، قدرتاً ان کتابوں کی دیکھ بھال ان کے دھوپ دکھانے اور کتاب کے دشمن کیڑوں، موسم کے اثرات وغیرہ سے بچانے اور ان کی فہرست بنانے کے سلسلہ میں مطالعہ کا ذوق، عام معلومات، قلمی کتابوں کی اہمیت کا اندازہ، بوسیدہ اور کرم خوردہ کتابوں کی قدر و قیمت سمجھنے کا ذوق اور ان کے پڑھنے کی عادت، وہ قدرتی عطیے اور نفسیاتی اثرات تھے، جو ایسے قدیم کتابی ذخیروں کے اہل اور ہونہار وارثوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، دائرہ شاہ علم اللہ بالکل دریا سی کے کنارے واقع ہے اور وہاں ہر چند سال کے بعد طغیانی اور سیلاب کا آنا ایک دستور بن گیا ہے، ایسی افراتفری اور پریشانی کے عالم میں جب نقل وسکونت کرنا ضروری ہوجاتا تھا، اس خاندان کے افراد کو سب سے زیادہ اسی قیمتی ذخیرہ کی حفاظت کی فکر ہوتی تھی اور خاندان کے ان مختلف کتابوں کے ذخیروں

---

(۱) اس ہبہ نامہ پر ۲۸ ربیع الاول ۱۲۲۶ھ کی تاریخ درج ہے۔

میں جو اس زمانہ کے شرفاء ورؤساء کے دستور کے مطابق ہر شاخ اور تقریباً ہر گھر میں تھا، یہی کتابی ذخیرہ زمانہ کی دست برد اور بار بار آنے والے سیلابوں اور نقل مکانی کے اثرات سے محفوظ رہا اور اس کی وجہ سے خاندانی حالات وتبرکات، قلمی تحریروں اور دستاویزوں کا بڑا قیمتی ذخیرہ تلف ہونے سے بچ گیا۔

مولانا کی زندگی اور شخصیت میں آبائی وموروثی اثرات

اجداد قریب کی امتیازی صفات کا بیٹوں اور پوتوں کی طرف منتقل ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے، اسی بناپر بجا طور پر "الولد سرّ لأبيه" کہا گیا ہے، مولانا کے جد امجد کے جو حالات اوپر درج کئے گئے ہیں ان کو سامنے رکھ کر مولانا کی سیرت وشخصیت اور ان کے مختلف (اور بعض اوقات متضاد) اوصاف وکمالات اور مزاجی خصوصیات کا سمجھنا دشوار نہیں، قدیم ماحول، خالص دینی تعلیم اور دولت باطنی کے ساتھ، ادب وانشاء، اور شعروشاعری کا اعلیٰ مذاق اور نقدِ سخن کا ملکۂ راسخ، تاریخ وسوانح کی طرف خصوصی توجہ، طبقاتِ علماء ومراتب رجال سے خصوصی مناسبت اور گہری واقفیت، زندگی کے ضروری کاموں کے ساتھ تصنیفی اشتغال وعلمی انہماک، عربی میں صاحبِ درس اور اہلِ قلم ہونے کے ساتھ ملکی زبان کی طرف توجہ اور سلیس وصاف، شیریں وشگفتہ اردو تحریر، علوم وفنون کی جامعیت اور کمالات کی رنگارنگی، مذہبی پابندی (ایک حد تک تقشّف کی حد تک) کے ساتھ نفاست پسندی ونستعلیقی، احساسِ جمال اور رعنائی خیال، فقر وسادگی میں خیالات کی رفعت اور مقاصد کی عظمت، مکمل یکسوئی اور باطنی مشغولی کے ساتھ دین وملت کی خدمت کا جذبہ اور اجتماعی کاموں کا ذوق اور صلاحیت، مطالعہ اور تصنیف کی محویت اور استغراق کے ساتھ، جو ہمیشہ سے شرکت ودوئی کا دشمن ہے، ایک بڑی دینی وعلمی تحریک

وادارہ (انجمن ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی ذمہ داری اور سربراہی اور اسلام کی سربلندی کا جذبہ، یہ سب زندگی کے وہ پہلو اور سیرت وشخصیت کی وہ نمود ہے جس کو ایک کوتاہ نظر شخص محض اتفاقات پر بھی محمول کرسکتا ہے، اور اس سے آگے بڑھ کر ایک سوانح نگار اس کو محض علوئے استعداد وسلامت طبع اور خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ بھی بتلاسکتا ہے، لیکن زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس سب میں کئی نسلوں اور پشتوں کے اثرات اور خاندانی ماحول، تعلیم وتربیت اور خاندانی روایات کی کارفرمائی بھی دیکھی جاسکتی ہے، اور انسانی نفسیات کے ایک بالغ نظر طالب علم کے نزدیک ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

والد مرحوم کی صفات میں سے (جن کا اثر لائق فرزند پر قدرتاً سب سے زیادہ پڑنا چاہئے تھا) دولتِ دنیا کی حقارت، زہد وقناعت کی عادت، کم آمیزی، خلوت پسندی، جاہ طلبی اور شہرت ونمائش سے تنفر، اظہار کمال اور اپنے علمی کاموں اور کارناموں کے ذکر وتشہیر سے گریز، کم سخنی اور میدانی وعمومی سرگرمیوں کے مقابلہ میں خاموش خدمات اور ٹھوس کاموں کو ترجیح دینا، زندگی کے ہر ہر لمحہ کی قدر کرنا اور اس کو مفید ونتیجہ خیز اور باقی رہنے والے کاموں میں صرف کرنا، اسلاف کے کارناموں اور ان کی باقیات صالحات کی حفاظت اور ان کے نیک نام کو باقی رکھنے کا جذبہ، ان کی سرشت اور طبیعت ثانیہ بن گئی اور ان سب اثرات وعناصر سے ان کی اس شخصیت وسیرت کی تشکیل ہوئی، جس کا تفصیلی تعارف اور جس کے نقوش کو اجاگر کرنا آئندہ صفحات کا موضوع ہے۔

□□□

باب دوم

ولادت، طفولیت، ماحول وخارجی اثرات، تکمیل علم، دینی رسوخ، توازن وجامعیت

ولادت

مولانا سید عبدالحیؒ ۱۸/رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ (۲۲/دسمبر ۱۸۶۹ء) میں دائرہ شاہ علم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے، آپ کا نام سید احمد رکھا گیا (۱) لیکن مشہور عبدالحی کے نام سے ہوئے۔ (۲)

بچپن میں آپ کا سیاسی ودینی ماحول

مولانا سید عبدالحیؒ کی ولادت ہوئی تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رستخیز اور انگریزی حکومت کے استقرار کو تیرہ ہی برس ہوئے تھے، اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا تھا، لیکن مسلمانوں کے دینی، علمی، اخلاقی اور تہذیبی اثرات کے چراغ کی

---

(۱) غالباً سید احمد شہیدؒ کے نام پر۔

(۲) خاندان میں سید احمد صاحب کے بعد سے دستور چلا آرہا ہے کہ جس کا نام سید احمد ہوتا ہے اس کو سید میاں یا سید کے عرف سے یاد کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے مولانا سید عبدالحی صاحب کی عرفیت بھی ''سید'' تھی، والد ماجد مولانا سید فخر الدین صاحب کے بعض خطوط میں ان کو صرف ''نور چشم سید'' کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔

روشنی (مدھم پڑ جانے کے باوجود) گل نہیں ہوئی تھی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ چراغ گل ہونے سے پہلے جس طرح بھڑک اٹھتا ہے، اس کی روشنی اس پھیلتے ہوئے اندھیرے کا زیادہ ہمت وعزم کے ساتھ مقابلہ کر رہی تھی، اور ایک ذی شعور و باغیرت وجود کی طرح تیل کے ذخیرہ ختم ہو جانے اور فتیلہ کے جل جانے کی کمزوری کو چھپا رہی تھی، کچھ قلندر صفت درویش ایسے تھے جو ہوا کے ان تیز و تند جھونکوں میں اس چراغ کو اپنے دامن کے نیچے لے کر بجھنے سے بچا رہے تھے اور انھوں نے جا بجا اپنے سوزِ دل اور نورِ باطن سے ایسی روشنی پیدا کر دی تھی کہ شامِ غریباں میں بزمِ چراغاں کا دھوکہ ہوتا تھا۔

یہ دو تہذیبوں، دو تعلیمی نظاموں اور زندگی کے دو فلسفوں کے تبادلہ اور دو موسموں اور فصلوں کے تداخل کا زمانہ تھا، اور ایک موسم کے چل چلاؤ اور دوسرے موسم کی آمد آمد کے مشترک زمانہ میں مزاجوں میں جو ناپائیداری، صحت کے نظام میں جو اختلال اور طبیعتوں میں جو بے یقینی اور بے ثباتی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اس معنوی عزل ونصب اور آمد ورفت کے مواقع پر پیدا ہونا لازمی تھی، نیز وہ سب بیماریاں اور عوارض بھی قدرتی تھے، جو دو موسموں کے تداخل کے زمانہ میں پیدا ہو جاتے ہیں، ایک بڑھتے ہوئے اقتدار کا نیم دلی بلکہ بددلی کے ساتھ استقبال، دوسرے ختم ہوتے ہوئے اقتدار وعہد کو شکستہ دلی اور مجبوری اور ناگواری کے ساتھ الوداع کہنے کی تیاری، بدلے ہوئے حالات کا مجروح دل اور اشک آلود آنکھوں سے جائزہ لینا اور نئے حالات کے چوکھٹے میں چار و ناچار اپنے کو فٹ کرنے کی کوشش کرنا، اس عہد کا ایک نمایاں پہلو تھا۔

انگریزی حکومت (جو اب تک ایک تاریخی حقیقت بن گئی تھی) اپنے ساتھ جو تہذیب ومعاشرت، فلسفۂ زندگی، معیار واقدار اور جو نظامِ تعلیم لائی تھی، اس کا سب

سے زیادہ مقابلہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے بچے کھچے افراد اور ان کے ہم خیال و حلقہ بگوش علماء و مشائخ نے کیا تھا، اور یہ بات بالکل قدرتی تھی کہ حمیت اسلامی اور غیرت ملّی کا سب سے بڑا ذخیرہ دور آخر میں اسی جماعت میں آ کر مرکوز ہو گیا تھا، اور گویا یہ جماعت ہندوستان اور مسلمانوں کو جب سیاسی غلامی کی لعنت سے (ان اسباب و واقعات کی وجہ سے جن کی شرح و تفصیل سید صاحبؒ کے سوانح نگاروں اور اس تحریک کے مؤرخوں کا موضوع ہے) نہیں بچا سکی، تو ہندوستان کو روحانی و اخلاقی، تہذیبی و معاشرتی اور ذہنی و تعلیمی غلامی سے بچانے کی ذمہ داری کو اس نے اپنا فرض سمجھا اور اس نے درحقیقت ایک ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنے کے لئے جان کی بازی لگا دی، اس وقت شاملی کی جنگ، اہل صادق پور کے مصائب و محن اور قصۂ دار و رسن، انڈمان کی جلا وطنی، پھر اس کے بعد شریعت اسلامی اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کے لئے حصاروں اور قلعوں کی تعمیر، دیوبند و ندوۃ العلماء کی تعلیمی تحریکیں، جا بجا تربیتی مرکزوں اور زندہ و متحرک خانقاہوں کا قیام، سب اسی کوشش کے نمونے اور اسی طلائی زنجیر کی کڑیاں ہیں، اس لئے یہ بالکل قدرتی امر تھا، کہ جس خاندان سے سید احمد شہیدؒ کا نسبی تعلق تھا اور جس کے متعدد افراد نے میدان شہادت تک ان کی رفاقت کی تھی اور حمیت و حمایت اور رشتہ و قرابت دونوں کا حق ادا کیا تھا، اس کے افراد نے اس حکومت اور اس حکومت کی جلو میں جو تہذیب و معاشرت اور جو تعلیم و تربیت آ رہی تھی اس کو سخت ناگواری و بیزاری اور سخت مجبوری و ناچاری کے ساتھ برداشت کیا تھا۔

سلوک و تصوف کا عام مذاق

مولانا سید عبدالحی صاحب نے جس دور میں ہوش سنبھالا اور انھوں نے

شعور کی آنکھیں کھولیں، ہندوستان میں جا بجا علماء تدریس و افتاء اور مشائخ تربیت وارشاد میں منہمک تھے اور ان مرکزوں اور خانوادوں میں پہونچ کر تھوڑی دیر کے لئے آدمی بھول جاتا تھا کہ اس ملک میں ایک ایسی قوم کی حکومت اور عملداری ہے جس کا مذہب، زبان وتہذیب اور رہنے سہنے کا طریقہ سب مسلمانون کے مذہب وتہذیب اور زبان ومعاشرت سے مختلف ہے، یہاں کی معیاری شخصیتیں جو قابل تقلید سمجھی جاتی ہیں، زندگی کے نمونے جو قابل پیروی ہیں، کمالات جن کا حصول ہر حوصلہ مند کے لئے قابل افتخار، مقاصد جن کی تکمیل ہر شریف وحساس نوجوان کی سعادت وکامیابی کی دلیل تھی، اس بیرونی دنیا سے بالکل مختلف تھے، جہاں حصول معاش، طلب جاہ واعزاز اور حکمراں قوم کی نقل وپیروی کے سوا کوئی مطمح نظر اور کوئی مقصد زندگی نہیں تھا، یہاں اسلامی علوم وفنون اور درسیات میں کمال پیدا کرنا، عربی وفارسی میں مہارت حاصل کرنا، ایمانی واحسانی کیفیات کا حصول، تزکیۂ نفس اور قطعِ منازل سلوک اور کم سے کم خدا طلبی اور فقیر دوستی کو ضروریات زندگی میں سمجھا جاتا تھا۔

آپ نے جس زمانہ میں آنکھیں کھولیں سارے ہندوستان میں تصوف وسلوک کا مذاق عام تھا، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے خلفاء کی کوششوں اور سلسلۂ چشتیہ کے صاحب عشق اور صاحب درد مشائخ کی مساعی کی بدولت جا بجا بلند مرتبہ مشائخ طریقت موجود تھے، اور انھوں نے تیزی سے زوال کی طرف جانے والی اس سوسائٹی میں ایک حرارتِ باطنی اور ایک سوز دروں کی کیفیت پیدا کردی تھی اور مشکل سے ان سے کوئی قابل ذکر بستی خالی تھی، ایک طرف خاندانِ مجددیہ کے چشم و چراغ مولانا شاہ احمد سعید صاحب مہاجر مدینہ اور حضرت شاہ محمد آفاق کے شہرۂ آفاق خلفاء، دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مجدد وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

کے باکمال مسترشدین، تیسری طرف سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کو دوبارہ زندگی وفروغ بخشنے والے حضرت شاہ فخر دہلویؒ کے جانشین، چوتھی طرف سلسلۂ قادریہ رزاقیہ کے شیوخ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، اور طالبین خدا کا مرجع بنے ہوئے تھے، آپ کا بچپن جن دو مقامات (ہسوہ، ضلع فتحپور و دائرہ شاہ علم اللہ، ضلع رائے بریلی) میں گزرا، حسن اتفاق سے خاندان کی ان دونوں شاخوں کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ ہی سے تھا، (۱) اور دونوں جگہ دو بڑے شیوخ ومربی، جن سے آپ کو تعلق خاندانی کے علاوہ قرابت قریبہ حاصل تھی، موجود تھے، ہسوہ میں حضرت شاہ احمد صاحب دہلوی کے خلیفۂ اجل مولانا سید عبدالسلام صاحب واسطی جو آپ کی والدہ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے، اور دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی میں حضرت شاہ ضیاء النبی (۲) صاحب جو آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب کے رشتہ میں ماموں اور روحانی رشتہ سے پیر بھائی تھے، ان دونوں بزرگوں کو قرابت قریبہ نیز آپ میں آثار رشد وترقی دیکھ کر آپ سے خصوصی تعلق اور آپ کے حال پر اولاد کی طرح شفقت تھی، اس وقت ان دونوں شخصیتوں کو زیادہ سے زیادہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور گھر اور باہر کی مجلسیں ان کے حالات وکمالات اور ان کے فیوض وبرکات کے تذکروں سے

---

(۱) حضرت مجدد الف ثانیؒ کا سلسلہ دو واسطوں سے ساری دنیائے اسلام میں پھیلا، ایک ان کے خلف الرشید اور ان کی تعلیمات وکمالات کے شارح وترجمان حضرت خواجہ محمد معصومؒ، دوسرے ان کے نامور خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ، یہ حسن اتفاق ہے کہ خاندان علم اللّٰہی کا تعلق شروع سے حضرت سید آدم بنوری کے سلسلہ سے رہا، اور ہسوہ میں سلسلہ معصومیہ کے شیخ مولانا سید عبدالسلام تھے، جو حضرت شاہ احمد سعید صاحب دہلوی کے خلفاء کبار میں ہیں، اس طرح مولانا سید عبدالحی صاحب کو عہد طفولیت ہی میں جن خاندانی مشائخ کی صحبت نصیب ہوئی ان کا تعلق سلسلۂ مجددیہ ہی سے تھا۔

(۲) حضرت شاہ ضیاء النبی، آپ کی دادی فاطمہ بی بی بنت مولانا سید محمد ظاہر صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔

معمور تھیں، مولانا سید عبدالسلام صاحب کا انتقال ہوا تو آپ کی عمر چودہ سال کی تھی، جو اچھے خاصے شعور و تمیز کا زمانہ ہے، اور مولانا شاہ ضیاء النبی صاحب نے جب وفات پائی تو آپ سن کہولت کو پہنچ رہے تھے، اور صاحب اولاد تھے، وہ عزیز قریب اور بزرگ خاندان ہونے کے علاوہ آپ کے خسر بھی تھے، اور آپ نے سلوک کے منازل بھی ان سے طے کئے تھے اور بیعت و تلقین کی اجازت بھی پائی تھی، اس لئے ان دونوں بزرگوں کا مختصر تذکرہ جن سے ان کے مرتبہ اور پایہ اور مزاج و مذاق کا اندازہ ہو سکے، مناسب معلوم ہوتا ہے، مولانا سید عبدالحی صاحب کے سیرت و اخلاق اور دل و دماغ پر ان کے نقوش بہت گہرے تھے، اور وہ مدت العمر قائم رہے۔

مولانا سید عبدالسلام ہنسوی

مولانا سید عبدالسلام حسینی واسطی، مولانا سید ابوالقاسم کے بیٹے اور مولانا سید مہدی کے پوتے تھے، ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء میں ولادت ہوئی، ابتدائی درسیات کی تعلیم مولانا سید سراج الدین صاحب (جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے) سے حاصل کی، پھر لکھنؤ جا کر مولانا معین الدین کڑوی اور مولانا معین (جو ملاّ مبین فرنگی محلی کے صاحبزادے تھے) سے اور دوسرے علماء سے تکمیل علم کی، وطن واپس آ کر پہلے اپنے والد سے بیعت و استفادہ کیا جو مولانا شاہ غلام علی دہلوی کے مجاز تھے، پھر دہلی کا سفر اختیار کیا اور حدیث و تفسیر کا درس حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے لیا، اور ان کے برادرِ اکبر اور شیخ وقت حضرت شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں تین سال رہ کر منازلِ سلوک طے کئے، اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے، اہل نظر کا خیال ہے کہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے خلفاء میں جو مقام ان کو حاصل تھا وہ کمتر خلفاء کے

حصہ میں آیا، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے ہجرت کر جانے سے یہ خانقاہ جو تقریباً دو سو سال تک مشرق و مغرب کے طالبین کا مرجع وماویٰ تھی اور جس کے مسند ارشاد پر حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت شاہ غلام علیؒ جیسے سرآمد روزگار شیوخ متمکن رہ چکے تھے، خالی ہوگئی، اور ہندوستان کے اہل تعلق نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے اپنے اس صدمہ اور قلق کا اظہار کیا کہ خانقاہ آپ دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد اب سونی پڑی ہے تو انھوں نے مدینہ طیبہ سے یہ خط لکھا کہ تم لوگ مولانا سید عبدالسلام کو ہسوہ سے لاکر ہماری جگہ بٹھاؤ اور اس خانقاہ کو دوبارہ آباد کرو، (۱) پھر حجاز جا کر حرمین کے مشہور محدث احمد بن زینی دحلان اور شیخ علی بن یوسف باشلی حریری سے سند حدیث واذکار حاصل کی۔

مولانا سید عبدالسلام صاحبؒ نہایت قوی النسبت (۲) شیخ اور نسبت مجددیہ

(۱) ناچیز راقم نے مولانا عبدالسلام صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ خط ہسوہ کی قلمی کتابوں اور تحریروں کے انبار میں دیکھا ہے، جس میں انھوں نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے اپنی بے بضاعتی وفرومائیگی کا تذکرہ کرکے اس حکم کی تعمیل سے معذرت کی ہے۔

(۲) حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی کے والد مولوی حافظ ناظر علی صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب کے خلفاء وعشاق میں سے تھے، اس تعلق سے مولانا عبدالشکور صاحب جنھوں نے بچپن میں حضرت مولانا کی زیارت کی تھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کا حلیہ مبارک میرے ذہن پر ایسا مرتسم ہے کہ اگر میں مصور ہوتا تو ان کی تصویر ہو بہو کھینچ دیتا۔
مولانا مرحوم حضرت مولانا کے بہت سے واقعات سناتے تھے، ان میں سے یہاں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کیا جاتا ہے، جس کا تعلق خود صاحب سوانح مولانا سید عبدالحی صاحب سے ہے، مولانا فرماتے تھے کہ جب میرے والد مولوی حافظ ناظر علی صاحب بیماری میں مبتلا ہوئے جس میں انھوں نے انتقال کیا تو میں آپ کے والد سید عبدالحی صاحب کو لکھنؤ سے ان کو دکھانے کے لئے کاکوری لے گیا، انھوں نے ملاحظہ فرمایا اور نسخہ لکھا، میں نسخہ بندھوانے کے لئے مولانا کے ساتھ کاکوری سے لکھنؤ آیا، مولانا نے راستہ میں مجھ سے فرمایا کہ "ہمارے ماموں صاحب (مولانا سید عبدالسلام صاحب) بڑے زور کے تھے، جیسے ہی میں نے آپ کے والد صاحب کی نبض پر ہاتھ رکھا میرے سب لطائف جاری ہوگئے، راقم الحروف نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب سے انھیں لفظوں میں بے کم وکاست کئی بار سنا۔

نقشبندیہ کے کمالات کے حامل اور امین تھے، علوئے مرتبہ اور کمال باطنی کے باوجود مستور الحال اور بے نام ونشان رہنا پسند کرتے تھے، اس طریق کے کاملین وواصلین کی طرح فنا وشکستگی کا سخت غلبہ تھا، بے ضرورت بات نہیں کرتے تھے، لایعنی سے سخت محترز تھے، کف لسان وقلت کلام شیوہ تھا، زہد وورع اور قناعت واستغنا، زندگی بھر کا شعار تھا، کسی سے بحث ومباحثہ کرنے اور اعتراض ومخالفت سے بغایت مجتنب تھے، اعتدال وتوازن ہر چیز میں ملحوظ تھا، غلو ومبالغہ سے نفرت تھی، کینہ وحسد اور شکوہ وشکایت سے بہت دور تھے، اگر کسی امر کی تحقیق نہیں ہوتی تھی تو بے تکلف اپنی لاعلمی کا اظہار کردیتے تھے، اذکار واوراد میں نہایت درجہ استقامت واستغراق تھا، اتباع سنت ہر امر میں ملحوظ تھا، باطنی اشتغال کے ساتھ درس وافتا کی مشغولیت بھی رہتی تھی، اندرونی درد وسوز کے ساتھ ہمیشہ خندہ پیشانی اور متبسم نظر آتے، انکے باطنی کمالات وکرامات کے لئے ایک دفتر چاہئے، اللہ تعالیٰ نے پورے جوار میں ایسی محبوبیت عطا فرمائی تھی کہ لوگ پروانہ وار آتے تھے اور حد درجہ عقیدتمند تھے، ۴ر شوال ۱۲۹۹ھ مطابق ۲۰ر اگست ۱۸۸۲ء شنبہ کے دن ۶۵ر سال کی عمر میں انتقال فرمایا، خلفاء میں مولوی حکیم امین الدین صاحب، قدرت علی صاحب، شاہ نجم الدین صاحب فتحپوری اور مولوی حافظ ناظر علی صاحب کاکوروی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سید شاہ ضیاء النبی صاحب

مولانا سید عبدالحیؒ ''نزہۃ الخواطر'' (عربی) کی آٹھویں جلد میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت سید ضیاء النبی، مولوی سعید الدین کے صاحبزادہ

قطب الاقطاب شیخ اجلّ حضرت سید شاہ علم اللہ نقشبندی کی چھٹی پشت میں ہیں، دنیا کی برکت، خلقت انسانی کے مقصد کامل (وما خلقت الإنس والجن إلا ليعبدون) کی سچی تصویر و عملی تفسیر اور معرفت کے لب لباب تھے، ان کا وجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، رائے بریلی میں اپنے جد امجد حضرت شاہ علم اللہ کے دائرہ میں ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے، اختیار ونگہداشت عفت وطہارت اور للّٰہیت میں نشو ونما ہوا، کچھ ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی، پھر پیدل دہلی کا سفر کیا، بیس دن میں پہنچے، حضرت شاہ احمد سعید صاحب اور مولانا شاہ عبدالغنی صاحب کا زمانہ تھا، ان کی خانقاہ (خانقاہ مجددیہ) میں قیام کیا، دو سال ٹھہر کر لکھنؤ گئے، دبیر الدولہ کی مسجد میں مفتی سعد اللہ صاحب مرادآبادی کے پاس قیام کیا اور ان سے اور بعض دوسرے علماء سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں، پھر وطن واپس تشریف لائے، اور مولانا خواجہ احمد نصیرآبادی سے طریقت کی تعلیم حاصل کی، اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہے، پھر وطن واپس آئے، ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ خواجہ فیض اللہ اورنگ آبادی سے مزید تربیت حاصل کی اور ان کے مجاز طریقت ہوئے۔

۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں حج سے مشرف ہوئے، حج سے واپسی پر علماء و مشائخ کا بکثرت رجوع ہوا، اور انھوں نے حاضر

ہوکر طریقت کی تعلیم اور فیوض روحانی حاصل کیے، مریدین میں سے مولانا ابوالخیر مکی جونپوری بن مولانا سخاوت علیؒ، مولانا بردوانیؒ، مولانا محمد ابراہیم آروی صاحب ''طریق النجاۃ''، مولانا عبدالقادر بن عبداللہ ساکن مئو، مولانا سید محمد امین نصیر آبادی وغیرہ ہیں، راقم الحروف کو بھی صحبت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، میں نے آپ سے طریقہ احسنیہ (۱) کی تعلیم حاصل کی اور بعض ابتدائی کتابیں پڑھنے کا بھی شرف حاصل ہے، آپ کو مجھ سے بڑی محبت تھی، اور مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ہندوستان کے اساتذۂ حدیث کی خدمت میں حاضر ہونے کی توفیق بخشی اور وطن واپس ہوا تو آپ نے مجھے حصن حصین سنائی، اور اس کی اجازت لی، یہ میرے لئے اتنا بڑا فخر اور اتنی بڑی سعادت ہے کہ میں امید کرتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے میری مغفرت فرمادے۔''(۲)

حضرت سید ضیاء النبیؒ کے دینی امتیاز کو بیان کرنے کے لئے (مشہور حدیث قدسی کے الفاظ) ''قرب بالفرائض'' سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی، اخلاص واستقامت، فرائض ادا کرنے کا اہتمام، عبادت میں خشوع وخضوع، نماز وتلاوت کا سچا عشق اور ان میں محویت واستغراق، یہ ان کا امتیاز تھا اور اسی امتیاز نے ان کو اپنے زمانہ میں بہت ممتاز کردیا تھا، ان کے خشوع فی الصلوٰۃ کے قصے سن کر اکابر سلف کی یاد

---

(۱) حضرت سید آدم بنوریؒ کے طریقہ خاص کو کہتے ہیں، جو حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے یہاں رائج تھا۔ (۲) نزہۃ الخواطر ج ۸/

تازہ ہوتی ہے۔

مولوی سید فخر الدین صاحب جوان کے عزیز اور برادر طریقت ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حق تعالیٰ کی طرف غایت درجہ التفات اور اتباع سنت میں اس قدر اشتغال تھا کہ اور کاموں سے دلچسپی نہ رہ گئی تھی، اذکار واشغال مراقبہ واوراد، نوافل (روزہ ونماز دونوں) کے التزام، جماعت اور اول وقت ادائیگی نماز اور حضور مسجد کے سوا کوئی کام نہ تھا، ابتدائے شعور اور مرید ہونے سے پہلے ہی سے منہیات سے مجتنب اور طاعات میں مستعد تھے، عبادات میں غایت خلوص، نماز میں خشوع وخضوع وطمانینت، رمضان وغیر رمضان دونوں میں غیبت وغلط بیانی سے پرہیز ان کو حاصل تھا۔''(۱)

سیرۃ السادات میں لکھتے ہیں:

''آج کل حضرت خیر الانام ﷺ کی اتباع اور اسلاف کرام کی پیروی میں پورے خاندان میں ان کی نظیر نہیں، ان کی صحبت میں قال اللہ وقال الرسول، اچھے تذکروں اور نصائح کے سوا اور کوئی آواز کانوں میں نہیں آتی، ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار میں رہتے ہیں، جوکہ اولیاء مقبولین کی پہچان ہے، جس قدر خشوع وخضوع ان کو نماز میں میسر ہے وہ کسی اور جگہ نہیں دیکھا، شریعت کے معاملہ میں کسی کی رورعایت نہیں کرتے، خواہ

---

(۱) مہر جہاں تاب ص ۱۲/۷

وہ کتنا ہی عزیز وقریب ہو، بہت سے علماء وسادات اور شیوخ دور ونزدیک سے تکیہ حاضر ہوکر ان سے فیضیاب ہوتے ہیں، اور بیعت ہوکر اور ان کی صحبت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ اس خاندان کے اسلاف اور بزرگوں کا نام ان ہی سے روشن ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔"

تربیت سلوک اور فیض باطنی میں شیخ کامل تھے، نسبت قوی اور توجہ بڑی مؤثر تھی، قوت نسبت وتاثر کے واقعات آپ کے مریدین ومستفیدین بیان کرتے ہیں، مولانا سید عبدالحیؒ جو خود مشائخ ہندوستان سے فیضیاب اور علم باطن میں صاحب بصیرت تھے، فرماتے تھے کہ:

"حضرت شاہ ضیاء النبی اور جناب والد ماجد (حضرت سید فخر الدین صاحب، صاحب مہر جہاں تاب) کی توجہ سے جو مدارج گھنٹوں میں حاصل ہوئے وہ اور طریق کے مطابق برسوں میں نہ حاصل ہوئے، بات یہ ہے کہ حضرت سید صاحب (شہیدؒ) کو بارگاہ خداوندی سے جو مجددیت کا شرف حاصل ہوا تھا، اس کا منشا یہی تھا کہ اس متمدن زمانہ کے کثیر الاشغال، وضعیف البنیان نفوس کے لئے سلوک راہ عبودیت کو آسان بنادیا جائے۔"(۱)

آپ کے ایک خلیفہ حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی سے جو نفع پہنچا اور

---

(۱) ترجمۂ مصنف (مقدمہ یاد ایام)

عقائد، اعمال کی جو اصلاح ہوئی، اس کے اثرات رائے بریلی، پرتاپ گڑھ، سلطان پور، جونپور، اعظم گڑھ کے قصبات و دیہاتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے مریدین میں جو تشرع و استقامت، فرائض کی پابندی اور دینی پختگی ہے، اس کی مثال کم ملے گی، گوجر قوم کی اصلاح و تربیت، ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، آپ اپنے زمانہ میں حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیرآبادی (جن سے آپ حضرت سید ضیاء النبیؒ کے واسطہ سے بیعت ہیں) کے جانشین اور ان کے نمونۂ کامل تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ شریعت پر استقامت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں آپ اپنے زمانہ کے امام تھے۔(۱)

ابتدائی نقوش واثرات

خاندان کی یہ دو ممتاز ترین شخصیتیں تھیں جن کے سایۂ عاطفت میں، مولانا سید عبدالحی صاحب کا بچپن گزرا، خاندان کا بچہ بچہ ان دونوں بزرگوں کا نام محبت و عظمت کے ساتھ لیتا تھا، وہ چھوٹی عمر سے اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ لوگ دور دور سے آتے ہیں، علماء بھی اور امراء ورؤساء بھی، ادب واحترام کے ساتھ ان کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور اس مجلس پر وقار واحترام کی فضا چھائی رہتی ہے، وہ کم عمری اور خردسالی کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ سکتے تھے، کہ ان مجالس میں کیا باتیں ہوتی ہیں، اور استفادہ وفائدہ کا کیا طریقہ ہے لیکن اس آمد ورفت اور ان مبارک مجالس کی وجہ سے دین واہل دین کی عظمت اور اس بات کا یقین ان کے لوح دل پر نقش ہوگیا کہ دین و روحانیت سب سے بڑی عزت کی چیز ہے، اور جو اعزاز وشرف اس راہ کے کاملین کو حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور طبقہ کو حاصل نہیں۔

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "یادگار سلف" مؤلفہ مولانا نجم الدین اصلاحی۔

أتـانـي هـواهـا قبل أن أعرف الهوىٰ
فـصـادف قـلـبـا فـارغـا فتـمـكنـا

اس وقت گھروں کا ماحول بھی خالص دینی اور ایک حد تک علمی تھا، مولانا سید عبدالحی صاحب کی دادی فاطمہ بی بی حضرت مولانا محمد ظاہر صاحب کی صاحبزادی تھیں، مولانا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس لئے انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کی تھی، اور اس زمانہ کے عرف و معیار کے مطابق اردو فارسی کے ذریعہ دینیات اور حسن معاشرت کی جو بہتر سے بہتر تعلیم دی جاسکتی تھی، وہ انھوں نے دی تھی، ان کے صاحبزادہ مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب ''تذکرۃ الابرار'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری والدہ ماجدہ اپنے والد بزرگوار کی تربیت یافتہ تھیں، ابتدائے شعور سے وفات تک فرائض و سنن کے علاوہ، اوابین، چاشت، اشراق، شش عید، عشرہ محرم و ذوالحجہ اور دیگر ایام کے روزے ان کی زندگی کے معمولات میں داخل تھے، نیز تلاوت قرآن، فقہ و حدیث کی کتابوں کا مطالعہ، دلائل الخیرات، حزب الاعظم، حزب البحر، اور دوسری کتابوں کا ورد پورے اہتمام سے تھا، اس کے علاوہ ترجمہ مشارق الانوار و مشکوٰۃ المصابیح، مفتاح الجنۃ، ضمان الفردوس، حکایات الصالحین، طب احسانی، طب نبوی، معدن الجواہر، شفاء، رسالہ خوان نعمت و ہنس جواہر وغیرہ بھی برابر مطالعہ میں رکھتی تھیں۔

امور خانہ داری، حسن انتظام، کھانے پکانے کا سلیقہ اور عورتوں

اور چھوٹے بچوں کا علاج ومعالجہ میں بھی ان کو بہت ملکہ تھا، اعزہ کے ساتھ حسن سلوک اور محتاجوں اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی وغمخواری، اصابت رائے، وجاہت ورعب اور اطمینان قلب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا حصہ عطا فرمایا تھا۔"

مولانا عبدالحی صاحب نے اپنی دادی صاحبہ کا اچھا خاصہ زمانہ پایا، ان کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر ۲۳ سال کی تھی، تکیہ پردادی صاحبہ اور ہسوہ میں نانی صاحبہ (جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے) کی مادرانہ شفقتیں اور دانشمندانہ تعلیم وتربیت، ان کی اخلاقی وذہنی نشو ونما میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

علمی وتہذیبی ماحول

ہر خاندان میں باضابطہ عالم دین وفارغ التحصیل اور صاحب درس وافتا تو چند ہی افراد ہوتے ہیں، مولانا نے جس عہد میں ہوش سنبھالا اس زمانہ میں بھی پورے خاندان میں مشکل سے سات ہی آٹھ آدمی علوم متداولہ کی تکمیل کا شرف رکھتے تھے، اور علمی اور تعلیمی مشاغل میں منہمک تھے، لیکن علم وشائستگی، عام واقفیت اور مذاق سلیم عام تھا، جس کو مجموعی طور پر ثقافت کے ایک مفرد لفظ سے ادا کیا جا سکتا ہے، جن لوگوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی اور باقاعدہ علوم متداولہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے، وہ بھی اس عمومی ثقافت کے حامل اور شائستہ اور تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہونے کے قابل تھے، ہر پڑھا لکھا آدمی ایک منتخب کتابی ذخیرہ کا مالک تھا، ایک مقررہ وقت مطالعہ اور علمی مذاکرہ میں گزارتا تھا، بعض لوگوں کو بیاض رکھنے کا اہتمام تھا، اور بعض روزنامچہ لکھنے کے شدت سے پابند تھے، بعض حضرات کو تاریخ نکالنے میں بڑا ملکہ

حاصل تھا، کچھ لوگ اردو یا فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے، غرض کوئی پڑھا لکھا اور قابل ذکر آدمی کسی ہنر اور عام ثقافت کے کسی نہ کسی شعبہ سے تعلق رکھتا تھا، بیاض کی ترتیب اور اس کی نگہداشت وحفاظت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید عبدالحی صاحب اپنی تصنیف "تذکرہ گل رعنا" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے بچپن میں بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا، ان میں کا ہر ایک، ایک ایک بیاض کا مالک تھا، اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا، سید عبدالجلیل مرحوم ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے، ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے آتے، وہ بیاض کیا تھی، جام جہاں نما تھا، ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ، ناموران ملک کی موت وحیات کا ابھرا ہوا خاکہ، فقہ وحدیث، نوادر ومشکلات کا حل، شعرا کے نتائج فکر کا بہترین نمونہ، غرض کہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگوں کیلئے دلچسپی کا بڑا ذریعہ تھی۔ میں نے ان ہی بزرگوں کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، مجھ کو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا، جب زمانہ نے آنکھیں کھولیں اور کاموں میں لگ گیا، پھر خبر نہیں رہی کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔''(۱)

اسی طرح قادر الکلام شاعر اور اصناف سخن پر یکساں طور پر حاوی اور شاعری

(۱) اسی کو دیکھ کر مولانا کو شعرائے اردو کا مکمل تذکرہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا جس نے تذکرہ گل رعنا کی صورت اختیار کر لی۔

سے شب وروز اشتغال رکھنے والے اشخاص بھی ہر زمانہ میں چند ہی ہوتے ہیں، لیکن اس زمانہ میں شعروشاعری کا ذوق عام تھا، طبیعتوں میں عام طور پر موزونیت پائی جاتی تھی، جو لوگ شعر گوئی اور سخن سنجی پر قادر نہ تھے، وہ سخن فہمی اور اچھے شعر سے ذوق لینے اور صحیح طور پر اس کی داد دینے کے جوہر سے محروم نہ تھے، تصوف اور شاعری کا ہندوستان میں بہت عرصہ سے چولی دامن کا ساتھ چلا آرہا تھا، خانقاہیں اس دور آخر میں بہت بڑا ادبی مرکز بن گئی تھیں، سلسلۂ چشتیہ جس کا خمیر پہلے دن سے درد و عشق سے اٹھا ہے، کا ذکر نہیں کہ اس کی خانقاہیں سماع کی مجلسوں سے ہمیشہ گرم رہتی تھیں، طریقۂ نقشبندیہ میں بھی جو اپنے تقشّف میں مشہور اور سماع و وجد و حال سے شدت سے محترز رہا ہے، حضرت مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسے صاحب طرز غزل گو پیدا ہوئے جن کو ہندوستان کا خواجہ حافظ کہنا صحیح ہوگا، اس لئے اس پر کوئی تعجب نہیں کہ اس زمانہ میں ارشاد و تربیت کے ان دونوں مرکزوں میں جن میں سے ایک سے آپ کا دادیہالی اور دوسرے سے آپ کا نانیہالی تعلق تھا، شعروسخن کا چرچا رہتا تھا، اور بڑوں اور بزرگوں کو دیکھ دیکھ کر بچوں اور کمسنوں کے دل میں بھی کسی خاص موقع پر شعر کہنے اور طبع آزمائی کا ذوق پیدا ہوتا تھا، مولانا سید عبدالحی صاحب اپنے والد ماجد کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

> ''میرے ماموں مولانا سید عبدالسلامؒ نے جب رحلت فرمائی تو ان کے شاگردوں اور مریدوں نے فارسی، اردو اور بھاشا میں ان کے حالات لکھے، کسی نے مثنوی لکھی، کسی نے نثر میں لکھا، میرا سن اس وقت چودہ برس کا تھا، دیکھا دیکھی ان کی وفات کی تاریخ فارسی میں، میں نے بھی لکھی اور اردو میں مثنوی لکھنا چاہی، مگر اس کا سلیقہ نہ اس وقت تھا نہ اب ہے، اس لئے میں

نے والد مرحوم سے استدعا کی، انھوں نے "نظم عالی" کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو میری طرف منسوب ہے۔"

ابتدائی شوق اور بچپن کے پسندیدہ مشاغل

والد ماجد مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کو تصنیف وتالیف سے جو شغف تھا اور جس طرح ان کے اوقات کا بیشتر حصہ لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا اس کا اثر اس کے ذہین اور ہونہار بچے پر پڑنا قدرتی تھا، جس کے مقدر میں خود اپنے دور کا ایک عظیم مصنف بننا لکھا ہوا تھا، وہ دیکھتے تھے کہ ان کے والد ماجد کو لکھنے پڑھنے کے سوا دنیا کے کسی کام سے سروکار نہیں، صبح ہوئی اور وہ اوراد ووظائف سے فارغ ہوئے، جو کچھ گھر میں میسر آیا اس کا ناشتہ کر کے باہر آ گئے، اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے، اس لئے مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کا یہ لکھنا مبالغہ اور فرزندانہ عقیدت پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ "بچپن میں آپ زیادہ کھیل کود کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، آپ کا کھیل کود قلم، دوات، کاغذ تھا" (۱) کہ بچوں کو بزرگوں کی نقل کرتے ہوئے بارہا دیکھا گیا ہے، ان علماء کے بچے جن کے یہاں کتابوں کا ذخیرہ پایا جاتا ہے اور ہر طرف ان کا اہتمام نظر آتا ہے، اپنے سن وتعلیم کے مطابق اپنا چھوٹا کتب خانہ بناتے اور اس کو سجاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں، حکماء واطباء کے بچوں کو بڑی معصومیت کے ساتھ لوگوں کی نبض دیکھتے اور نسخہ بولتے پایا گیا ہے، اساتذہ اور مدرسین کے بچوں کو شاگردوں کا پرا جما کر پڑھانے کی نقل کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اور مشائخ کی کمسن اولاد کو اپنے ہم عمروں میں شیخ بن کر توجہ دیتے دیکھا گیا ہے۔ (۲)

---

(۱) ترجمۂ مصنف (یاد ایام)

(۲) بعض مرتبہ اس نقل نے اس کی اصل شکل اختیار کر لی اور کسی کیمیا نظر ہستی کی توجہ کو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بزرگوں کی زبانی بچپن میں آپ کا جو نمایاں وصف معلوم ہوا وہ سنجیدگی، متانت اور بے آزاری اور دوسرں کو ایذا نہ پہنچانے کا وہ وصف ہے جو آپ کے سن وعلم کے ساتھ برابر ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ آپ کی سیرت وشخصیت کا نمایاں پہلو بن گیا، بزرگوں اور اہل اللہ کے پاس بیٹھنے کا ذوق اس عمر سے شروع ہو گیا تھا، جس میں عام طور پر اس عمر کے بچے ایسی سنجیدہ اور باوقار صحبتوں سے گھبراتے اور کتراتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم

مولوی حکیم سید عبدالعلی صاحب لکھتے ہیں:

''آپ کے بزرگ تعلیم سے زیادہ تربیت کا لحاظ رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ فطری جوہر جلا پا گئے، مولانا مرحوم کے بچپن میں آپ کے والد ماجد تلاش معاش میں اکثر وطن سے باہر، بندیل کھنڈ، مالوہ، راجپوتانہ اور حیدرآباد میں رہے، اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم آپ ہی کے شوق اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کی توجہ کا نتیجہ تھی۔

اس زمانہ میں اکثر آپ کا قیام نانیہال میں رہتا تھا وہاں آپ کی نشو ونما آپ کے ماموں مولوی سید عبدالعزیز صاحب اوران کے بھائی حضرت شاہ عبدالسلام صاحب کے دامن تربیت میں ہوئی،

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اس طرح اپنی طرف متوجہ کرلیا کہ اس سے وہ دولت جاوید حاصل ہوگئی جو تاریخ میں یادگار رہ گئی، حضرت ابومحذورہ صحابی انہیں خوش نصیب افراد میں ہیں جو غزوہ کے موقع پر اذان کی نقل کر رہے تھے، آنحضرت کی خدمت میں پیش کیے گئے، آپ نے انکو اذان کے کلمات تلقین فرمائے، اور وہ بارگاہ نبوی کے ایسے مؤذن بن گئے کہ ان کی اذان آج تک (حضرت بلالؓ کی اذان کے ساتھ) سند اور درس حدیث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔

> فارسی آپ نے شاہ عبدالسلام صاحب کے ایک مرید منشی محمد علی طلیق اور ابتدائی عربی تعلیم غالباً حضرت شاہ عبدالسلام صاحب اور ان کے بعض ارادتمندوں سے پائی تھی، دادیہال میں بھی ابتدائی تعلیم اپنے بعض بزرگ اعزا سے پائی تھی، چنانچہ ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں حضرت شاہ ضیاء النبیؒ صاحب سے پڑھی تھیں، رائے بریلی کے دوران قیام میں کچھ دن آپ نے مڈل اسکول میں پڑھا تھا، اس زمانہ میں آپ کے پھوپھا مولوی سید رشید الدین صاحب ایک ہوشمند و باخبر بزرگ تھے، غالباً انھیں کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مڈل اسکول میں انگریزی شروع کی تھی، اسی زمانہ میں صبح کو مولوی یحییٰ صاحب سے آپ صرف ونحو پڑھتے تھے، یہ صاحب قلعہ رائے بریلی کے مدرسہ اسلامیہ میں ملازم تھے۔"(۱)

اسی زمانہ میں سرسید احمد خان مرحوم کے نامور فرزند آنریبل سید محمود ڈسٹرکٹ جج ہو کر رائے بریلی آئے، (۲) ان کی کوشش سے یہاں انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک مجلس قائم ہوئی، ضلع کے نامور وکیل و رئیس شیخ شہاب الدین صاحب اس کے سکریٹری اور مولوی سید رشید الدین (۳) رئیس رائے بریلی، اس کے صدر منتخب

---

(۱) ترجمۂ مصنف۔ (۲) آنریبل سید محمود جولائی ۱۸۷۹ء، شعبان ۱۲۹۶ھ میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ پر مقرر کیے گئے، تین سال بعد یعنی ۱۸۸۲ء میں ان کو ہائی کورٹ کی ججی پر ترقی دی گئی، اور انھوں نے الہ آباد ہائی کورٹ میں اس عہدہ کا چارج لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ رائے بریلی میں ڈسٹرکٹ جج تھے تو مولانا عبدالحی صاحب کی عمر ۱۲/۱۳ سال کی تھی، اسی زمانہ میں مدرسہ اسلامیہ قائم ہوا اور سرسید احمد خان اس کے افتتاح کے لئے رائے بریلی آئے۔ (۳) مولوی سید رشید الدین صاحب، مولوی سید سعید الدین صاحب کے صاحبزادہ اور مولانا سید عبدالحی صاحب کے پھوپھا تھے، ان کا شمار ضلع کے بڑے زمینداروں اور عمائد میں تھا، وجاہت و اعزاز دنیاوی کے ساتھ بڑے دیندار اور متشرع اور باخدا بزرگ تھے۔

ہوئے، اس انجمن نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو مدرسہ اسلامیہ کے نام سے سالہا سال تک قائم رہا، اس مدرسہ کے افتتاح کے واسطے سرسید، علی گڑھ سے تشریف لائے، اس موقع پر انھوں نے ایک بڑی مؤثر تقریر کی جس کی صدا برسوں تک رائے بریلی میں گونجتی رہی، راقم سطور نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ سرسید نے کچھ طالبعلموں اور بچوں کا امتحان بھی لیا تھا جن میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب بھی تھے، سرسید اس خاندان سے بخوبی آشنا تھے، ان کی والدہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے مرید تھیں اور وہ خود ایک زمانہ میں حضرت سید صاحبؒ اور ان کے مسلک سے بہت متأثر رہ چکے تھے اور انھوں نے ان کی حمایت و مدافعت میں متعدد رسائل تصنیف کئے تھے۔

اس زمانہ میں خطّاطی ورقعہ نویسی اور فارسی خط و کتابت پر بہت زور دیا جاتا تھا، آپ کے والد ماجد اور جد امجد دونوں بڑے خطاط تھے، اس لئے آپ کو بھی بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی تعلیم دی گئی، اس کے نتیجہ میں آپ کا خط نہایت عمدہ اور پختہ ہو گیا تھا، اور آپ بچپن اور طالب علمی کے دور میں بے تکلف فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔

الہ آباد، فتح پور اور بھوپال

تعلیمی سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب اور آگے تحریر فرماتے ہیں:

> "یہاں سے آپ الہ آباد تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال وہاں رہ کر مولانا محمد حسین (۱) الہ آبادیؒ اور دوسرے علماء کی خدمت میں تعلیم حاصل کرتے رہے، الہ آباد میں شاہ عبدالسلام صاحب

(۱) نزہۃ الخواطر میں مولانا کے تذکرہ میں ہے کہ آپ نے ان سے شرح جامی اور شرح تہذیب کا کچھ حصہ پڑھا۔

کے ایک مرید نائب کوتوال تھے اور مولانا محمد حسین صاحب سے بھی نانیہال والوں کے تعلقات تھے، اسی سلسلہ سے آپ الہ آباد تشریف لے گئے تھے، الہ آباد سے آپ چند مہینوں کے لئے فتحپور گئے اور وہاں رہ کر مولانا نور محمد صاحب (۱) سے فقہ کی کوئی کتاب پڑھی تھی یہاں سے آپ غالبا ۱۳۰۱ھ میں اپنے والد ماجد کے پاس بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء کی خدمت میں تعلیم حاصل کرتے رہے، اس زمانہ میں مدارالمہام مولوی جمال الدین خاں صاحب کی توجہ سے بھوپال میں علماء کا مجمع تھا اور وہ شہر علوم مذہبی ودینداری کا مرکز بنا ہوا تھا۔"

لکھنؤ و کانپور

"۱۳۰۳ھ کے وسط میں آپ بھوپال سے واپس آئے، اور کچھ دن وطن میں رہ کر تحصیل علم کے لئے روانہ ہوئے، لکھنؤ میں جب آپ آئے تو قطبی اور شرح وقایہ پڑھ چکے تھے، یہاں پہلے آپ کا قیام میر ابوالحسن صاحب (۲) مصنف "آئینہ اودھ" کے

(۱) مولانا نور محمد صاحب شاہ پور پنجاب کے رہنے والے تھے، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی سے درسیات کی تکمیل کی، حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ سے سلوک کی تکمیل کی اور اجازت پائی، مدت العمر مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں جوان کے برادر طریقت مولانا سید ظہور الاسلام صاحب نے قائم کیا تھا، نہایت توکل وقناعت کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، حضرت مولانا کے لوگوں میں بلند پایہ اور ممتاز تھے، ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

(۲) میر ابوالحسن صاحب خاندان قطبی ہی سے تعلق رکھتے تھے، اصل وطن کڑا تھا، آخر میں مانک پور نقل سکونت کر لی تھی جو کڑے کے بالمقابل دریائے گنگا کے دوسرے کنارے پر ہے، خاندانی تعلق کی بنا پر غالبا مولانا کا وہاں قیام ہوا، وہ ریاست بلرام پور میں ایک بڑے عہدہ پر فائز تھے اور اسی سلسلہ میں لکھنؤ میں ان کا قیام رہتا تھا۔

یہاں دُر بجے گنج میں مہاراجہ بلرام پور کی کوٹھی پر رہا۔‘‘(۱)

اسی زمانہ کے آس پاس آپ نے کچھ عرصہ کانپور میں قیام کیا، اس وقت (حکیم الامت) مولانا اشرف علی صاحب جامع العلوم پٹکاپور میں صدر مدرس تھے، آپ نے مولانا سے کچھ حصہ اصول الشاشی کا اور کچھ حصہ شرح جامی اور قطبی کا پڑھا،(۲) یہیں آپ نے مدرسہ جامع العلوم کے دوسرے استاد مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے بھی شرح شافیہ اور اصول الشاشی کا کچھ حصہ پڑھا۔(۳)

لکھنؤ میں مہاراجہ بلرام پور کی کوٹھی سے جہاں آپ اپنے ایک بزرگ خاندان میر ابوالحسن صاحب کے یہاں مقیم تھے، آپ بازار جھاؤلال میں مسجد نوازی (۴) میں اٹھ آئے، جہاں تحصیل علم کے بعد سے زندگی کا بقیہ حصہ گزارنا اور وہیں سے سفر آخرت اختیار کرنا تقدیر الٰہی میں مقدر تھا، اس محلّہ میں زیادہ تر بکر قصاب برادری کے گھر تھے، اس برادری کے سربرآوردہ اشخاص نہایت باوضع، صحیح العقیدہ اور متشرع لوگ تھے، اور یہ محلّہ اپنی دینداری اور نماز روزہ کی پابندی میں ممتاز تھا، میر ابوالحسن صاحب

---

(۱) ترجمۂ مصنف

(۲) ماخوذ از حالات مولانا اشرف علی تھانوی، نزہۃ الخواطر جلد ۸، مولانا تھانوی کو مولانا سید عبدالحی کا زمانہ، جب وہ کانپور میں طالب علم تھے، باوجود امتداد زمانہ کے یاد تھا اور ان سے تعلق خاطر تھا، وہ مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے نام ایک خط میں جو رمضان ۱۳۵۰ھ جنوری ۱۹۳۲ء کا لکھا ہوا ہے، ان کے خط کی رسید دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ’’نامہ محبت شمامہ نے مولانا مرحوم یعنی جناب کے والد صاحب کے بچپن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا، ان کی یاد سے جیسی بے چینی ہوئی تھی آپ کے بدل ہونے نے اس بے چینی کو چین سے بدل دیا، فسلسکم اللّٰہ تعالیٰ من مونس مریح لقلوبنا.‘‘

(۳) ماخوذ از حالات مولانا فتح محمد تھانوی، نزہۃ الخواطر جلد ۸۔

(۴) یہ مسجد بکریا والی مسجد کے نام سے بھی مشہور ہے، محلّہ کا قدیم نام بازار جھاؤلال تھا اب محمد علی لین کے نام مشہور ہے، جو گوئن روڈ اور کچہری روڈ (لکھنؤ) کے درمیان واقع ہے۔

کے مکان سے یہاں منتقل ہونے کا محرک یہ ہوا کہ آپ کے وہاں قیام کے زمانہ میں وطن سے والدہ ماجدہ کے فوت ہونے کی اطلاع آئی، آپ جب وطن سے واپس آئے تو آپ کا وہاں دل نہیں لگا، غالباً قلق وصدمہ کی وجہ سے آپ کو کسی پرسکون اور الگ تھلگ جگہ کی تلاش ہوئی، ممکن ہے کہ اسکے کچھ اور بھی اسباب ہوں جن کی وجہ سے آپ کو وہاں مطالعہ میں یکسوئی اور تنہائی نہ حاصل ہوتی ہو، اس زمانہ میں عام طور پر طلبہ مسجدوں کے حجروں میں قیام کرتے تھے اور محلّہ والے ان کی کھانے سے خدمت کرتے تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب کے ایک ہمنشین وصحبت یافتہ منشی عبدالغنی صاحب مرحوم نے جو اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے، وہ ان کے بڑے مخلصین عشاق میں سے تھے، اس نقل وسکونت کا واقعہ مجھ سے خود بیان کیا، وہ غالباً اس وقت موجود تھے وہ فرماتے تھے کہ میرے بڑے چچا عبداللہ چودھری صاحب مرحوم مسجد کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے تھے، کہ ایک صاحبزادہ جو طالبعلم صورت تھے، تشریف لائے (۱) اور کہا کہ ہم رائے بریلی کے دو طالبعلم ہیں، ہم کو ایک حجرہ کی تلاش ہے، لیکن میرے ساتھ جو عزیز رفیق ہیں ان کی شرط یہ ہے کہ ہم کھانے کے مصارف خود ادا کریں گے، ہم کو پکا پکایا کھانا مل جائے، ان کی دوسری شرط یہ ہے کہ کھانا وہیں آئے ہم کہیں جائیں گے نہیں، اور کسی دعوت یا شادی غمی کے کھانے میں بھی ہم نہیں جائیں گے، چودھری صاحب نے کہا کہ ہم کو تینوں شرطیں منظور ہیں لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے کہ ہم کھانا دونوں وقت نہ دے سکیں گے، دونوں وقت کا کھانا ایک ہی وقت میں دے دیا کریں، اور جو کچھ کم یا زیادہ وہ دے سکیں گے، ہم قبول کرلیں گے، چنانچہ وہ دونوں طالبعلم جن میں سے ایک

(۱) یہ حکیم سید محمد اسحاق صاحب تھے جو مولانا سید عبدالحی صاحب کے عزیزوں میں سے تھے اور لکھنؤ میں اکٹھا طالب علمی کرتے تھے، حکیم صاحب مرحوم گنج مرادآباد کے سفر میں بھی رفیق تھے اور حضرت مولانا ہی سے بیعت ہوئے۔

مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب تھے اور ایک یہ قاصد، مولوی حکیم سید محمد اسحٰق صاحب اس مسجد کے حجرہ میں آ گئے اور یہیں رہنے لگے۔

آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں ہوا، اس لئے آپ کے محلہ میں منتقل ہونے کا زمانہ یہی ۱۳۰۵ھ ہوگا، منشی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب اس وقت بھی متین و سنجیدہ اور خاموش و کم گو تھے، ان کو پڑھنے لکھنے کے سوا کسی کام سے سروکار نہ تھا، ان کے ہم عمر اعزا جو لکھنؤ میں طالب علمی کرتے تھے یا وطن سے آتے تھے ہنسی مذاق کرتے اور نوعمری کے تقاضہ سے بہت کچھ ہنگامہ ہوتا، لیکن مولوی صاحب ان ہنگاموں میں شریک نہ ہوتے اور اپنے مطالعہ اور تیاری میں مشغول رہتے۔

راقم سطور نے معمر بزرگوں سے سنا ہے (اور اس کی تصدیق کے لئے متعدد قرائن موجود ہیں) کہ لکھنؤ میں آپ کی طالب علمی عسرت اور جفاکشی کے ساتھ گزری، والد ماجد جن کا مستقل کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور خود قناعت پر ان کی بسر اوقات تھی، کم وبیش جو کچھ بھیج دیتے ہونگے اسی پر صبر وشکر کے ساتھ گزارا کرنے پر مجبور تھے، ممکن ہے کہ نانیہالی بزرگ (جو نسبتاً خوشحال تھے) کچھ خبر گیری کرتے ہوں، اس دور میں طالب علمی اور جفاکشی توام سمجھے جاتے تھے اور زمانہ طالب علمی میں جتنی عسرت اور تنگی ہوتی اتنی ہی ترقی اور درجہ کمال پر پہنچنے کی امید کی جاتی تھی۔

لکھنؤ کے اساتذہ

مولوی حکیم سید عبدالعلی صاحب لکھتے ہیں:

"اس کے بعد آپ بازار جھاؤلال میں مسجد نوازی میں اٹھ

آئے، یہاں دو ڈھائی برس آپ کا قیام رہا، یہاں بھی آپ کو اچھی صحبت ہاتھ آئی، اس محلّہ کے ایک پیر مرد عبداللہ چودھری بہت دیندار اور متبع سنت آدمی تھے، اس زمانہ میں آپ مختلف اساتذہ کے پاس روزانہ قصائی باڑہ، فرنگی محل، جھوائی ٹولہ اور قندھاری بازار جایا کرتے تھے، لکھنؤ سے جو لوگ واقف ہیں، وہ ان محلوں کے جائے وقوع اور فاصلہ کو دیکھ کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ طلب علم میں کتنی محنت برداشت کرتے تھے، لکھنؤ میں آپ نے مولانا امیر علی صاحب (۱)، مولوی الطاف حسین صاحب، مولوی فتح محمد صاحب (۲) تائب، اخوند مولانا احمد شاہ صاحب (۳) ولایتی، مولانا فضل اللہ صاحب (۴) اور مولانا

(۱) مولانا سید امیر علی صاحب کے والد کا نام معظم علی اور وطن ملیح آباد تھا، حدیث و علم رجال اور تفسیر میں کم لوگ ان کے پایہ کے اور ان جیسے صاحب نظر قرب وجوار میں تھے، ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء میں ولادت ہوئی، مولانا حیدر علی مہاجر اور مولانا بشیر الدین قنوجی اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے خاص تلمذ تھا، عرصہ تک منشی نولکشور کے مطبع میں تصحیح و مقابلہ کا کام کیا، پھر اس سے مستعفی ہو کر کچھ عرصہ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور پھر جدہ میں عرصہ تک تدریس کے فرائض انجام دیئے، آخر کار ارکان ندوۃ العلماء کی درخواست پر ندوہ کی صدر مدرسی قبول فرمائی، ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف کا ایک دفتر بے پایاں چھوڑ کر وفات پائی، مولانا نہایت رواں قلم، کثیر التصانیف عالم تھے، ہزاروں صفحات ترجمہ اور تصنیف کے یادگار ہیں، نہایت ذکی، قوی الحفظ اور کریم النفس انسان تھے، تقلید کے پابند نہ تھے، عمل بالمذہب میں توسیع سے کام لیتے تھے اور کبھی دلیل کی بنا پر کسی دوسرے امام کے مسئلہ یا حدیث پر عمل کرتے تھے، تصنیفات میں تنہا ''تفسیر مواہب الرحمٰن'' ہی ان کا عظیم کارنامہ ہے جو تیس جلدوں میں ہے، اور ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ بھی یادگار ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! نزہۃ الخواطر جلد ہشتم۔

(۲) مولانا فتح محمد تائب لکھنوی نومسلم تھے، مولانا عبدالحی صاحب سے درسیات کی تحصیل کی، رفاہ المسلمین کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور درس وافادہ میں عرصہ تک مشغول رہے، تصانیف میں ''خلاصۃ التفاسیر'' جس کی چار ضخیم جلدیں ہیں، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں وفات پائی، (نزہۃ الخواطر جلد/۸)

(۳) اخوند احمد شاہ صاحب ولایتی، فاضل درس، صائم الدہر، ایک مرتاض، صاحب کرامات (بقیہ آگلے صفحہ پر)

محمد نعیم صاحب (۱) فرنگی محلی سے کتب درسیہ پڑھیں۔" (۲)

نزہۃ الخواطر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مولانا امیر علی صاحب سے تفسیر جلالین مکمل پڑھی اور مولانا فضل اللہ صاحب فرنگی محلی سے میبذی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ اور حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد پڑھا، مولانا محمد نعیم صاحب سے ہدایہ، سراجی، شرح عقائد اور نخبۃ الفکر پڑھی۔

لکھنؤ کے اساتذہ میں مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے تلمذ خاص رہا، مولانا کو بھی خصوصی شفقت تھی، آپ کے لکھنؤ کے زمانہ قیام میں آپ کے جلیل القدر و نامور ہمنام مولانا عبدالحی فرنگی محلی بھی حیات تھے، آپ نے ان کی زیارت کی، ان کی مجالس میں بھی شریک ہوئے، لیکن غالباً ابتدائی کتابیں ہونے کی وجہ سے ان سے پڑھنے کی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) بزرگ تھے، دس بارہ سال قصائی باڑہ کی مسجد میں قیام رہا، منتہی طلبا ان سے پڑھتے تھے، لکھنؤ کے لوگ آپ کے بڑے معتقد تھے، آخر عمر میں حج کو گئے، حج وزیارت سے فراغت کے بعد حرمین شریفین کے درمیان بدوؤں کے ہاتھ سے زخمی ہوکر وہیں ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی۔ (مہر جہاں تاب)

(۴) مفتی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے اور فرنگی محل کے ممتاز اساتذہ و مدرسین میں تھے، کنگ کالج لکھنؤ میں استاد مقرر ہوئے، مزاج میں سادگی اور معصومیت نمایاں تھی، نہایت خوش اعتقاد اور فقیر دوست تھے، زواہد ثلاثہ، ہیئت و ریاضی کی تعلیم میں ید طولیٰ حاصل تھا، ۱۶ر ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸ر اکتوبر ۱۸۹۴ء میں انتقال کیا۔

(۱) حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی، بانی درس نظامیہ حضرت ملا نظام الدین اور ان کے قابل فخر فرزند مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کی شاخ کے گل سرسبد تھے، اور دور آخر میں فرنگی محل کی علمی، تدریسی اور روحانی کمالات کی آخری یادگار، زہد و ورع، توکل و استغنا میں ان کی نظیر دور دور نہ تھی، اپنے والد بزرگوار مولانا عبدالحکیم صاحب سے اول سے آخر تک تلمذ تھا، تمام علوم متداولہ میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور ساری کتب درسیہ کو یکساں قوت اور مہارت کے ساتھ پڑھاتے تھے، اسی کے ساتھ حالات سے بڑے باخبر، طبقات علماء و مشائخ سے نہایت درجہ واقف، علم مجلسی میں بڑے سلیقہ مند، مناقب و کمالات کے تذکرہ کے لئے ایک دفتر درکار ہے، ضروری معلومات کے ملاحظہ ہو! "نزہۃ الخواطر"، جلد ۸۔ ۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۸ر اگست ۱۹۰۰ء کو وفات پائی۔

(۲) ترجمۂ مصنف۔

نوبت نہیں آئی مولانا کے جنازہ اور تدفین کے موقع پر بھی آپ موجود تھے۔(۱)

خوش قسمتی سے پرانے کاغذات میں مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کا ایک فارسی خط جو اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے، دستیاب ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید عبدالحی صاحب اپنی والدہ مرحومہ کے انتقال سے بہت زیادہ دلگیر اور متاثر تھے اور نوعمری اور صدمہ کی شدت کی وجہ سے طبیعت دنیا سے بالکل اچاٹ ہوگئی تھی، اور ایسے علوم وفنون میں محنت کرنا اور ان پر طویل وقت صرف کرنا ان کو بے فائدہ اور تضییع اوقات کے مرادف نظر آتا تھا، جو خالص دینی علوم کی فہرست میں نہیں تھے اور جن پر سعادت ابدی ونجات اخروی کا انحصار نہیں تھا، مولوی سید فخر الدین صاحب نے یہ خط ان کے اس صدمہ کو کم کرنے اور تحصیل علم اور حصول کمال میں ان کی ہمت بلند کرنے کے لئے لکھا ہے، اس خط میں وہ فرماتے ہیں:

"تم نے علم دین کی طلب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس پر عمل کرنے کی تم کو توفیق اور قوت عطا فرمائیگا، فلسفہ وکلام کی اس کے سوا کوئی قدر وقیمت نہیں کہ ان سے دین کی تائید ہوتی ہے، بہر حال جو مضامین بہتر اور مناسب سمجھو وہ پڑھو، اگر ملاّ حسن، ملاّ جلال اور میر زاہد رسالہ، جس کو اکابرین دین نے بھی پڑھا ہے، کا کچھ حصہ پڑھ لو تو بہتر ہے، اس بارے میں میں تم پر زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہتا، اور اصرار نہیں کرتا، کہ تم بفضلہٖ تعالیٰ خود پوری سمجھ رکھتے ہو، مقصد یہ ہے کہ علوم

(۱) مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا انتقال ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ ۲۶ دسمبر ۱۸۸۶ء شنبہ کو ہوا، آپ نے نزہۃ الخواطر میں ان کی قلمی تصویر کھینچنے اور ان کی مجالس کا چشم دید حال لکھنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ ہو! جلد ۸۔

دینی اور کتاب وسنت کا فہم ناقص نہ رہ جائے، اللہ تعالیٰ تم کو علم و عمل اور جاہ واقبال ارزانی فرمائے۔

تم نے دنیا کی بے ثباتی اور ہر چیز کے فانی ہونے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب صحیح ہے، لیکن تمہارے دینی پیشوا اور اسلاف کرام، حضرات پیغمبر اور صحابہ کرامؓ سب اہل وعیال اور مال ومتاع رکھتے تھے، اور جب تک اس دنیا سے انھوں نے سفر اختیار نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اس کا حق ادا کرتے رہے، یہاں تک کہ انھوں نے خدا کی خوشنودی پورے طور پر حاصل کی، آنحضرت ﷺ کی جب اس دنیا سے رحلت ہوئی، صحابہ کرامؓ کو سخت امتحان پیش آیا، بعض صحابی بالکل مبہوت تھے، لیکن ان میں کوئی بھی تارک الدنیا نہیں بن گیا، دراصل اللہ کے ذکر سے غفلت، وہ دنیا ہے جس کی مذمت آئی ہے، اہل وعیال اور مال ومتاع اس ''مذموم دنیا'' کی تعریف میں نہیں آتے، مولانا فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دوبارہ بھوپال

لکھنؤ میں آپ چار پانچ برس تحصیل علم میں مشغول رہے، غالباً ۱۳۰۹ھ ۹۲-۱۸۹۱ء میں آپ وطن تشریف لے گئے، اور نکاح کے بعد کچھ دن وطن میں مقیم رہے، اس کے بعد

تکمیل علم کے لئے بھوپال تشریف لے گئے، بھوپال میں مولانا قاضی عبدالحق صاحب (۱) سے باقی کتب درسیہ اور مولانا سید احمد دہلوی (۲) سے ریاضی اور مولانا شیخ محمد عرب (۳) سے ادب اور مولانا شیخ حسین بن محسن الیمانی سے حدیث کی تحصیل کی۔ (۴)

(۱) مولانا قاضی عبدالحق کابلی نزیل بھوپال محمد اعظم کے صاحبزادہ ہیں، منطق وفلسفہ میں ملا ترنج کے شاگرد تھے، قاضی مبارک کی شرح مشہور تھی، ہندوستان آکر انھوں نے مولانا عبدالعلی رامپوری سے منطق وفلسفہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں، حج وبلاد اسلامیہ کی سیاحت کے بعد بھوپال آئے، ریاضی مولانا فتح اللہ نائب مفتی اور حدیث مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب بڑھانوی سے پڑھی، مدرسہ شاہجہانی بھوپال میں مدت تک درس وافادہ میں مشغول رہے، ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں افتاء کی خدمت سپرد ہوئی، پھر قاضی مقرر ہوئے اور ساری عمر اس عہدہ پر فائز رہے، فقہ، اصول کلام میں پایہ بلند رکھتے تھے، منطق وفلسفہ، ریاضی اور الٰہیات میں ان کی نظر بہت دقیق تھی، بہت سے علمی کمالات اور انسانی اوصاف سے آراستہ تھے، تصنیفات میں قاضی کی شرح ''القول المسلم'' ہے، دوسری کتب درسیہ پر بھی ان کے فاضلانہ حواشی ہیں، ۲۲ر رمضان المبارک ۱۳۲۱ھ، ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۳ء میں بھوپال میں انتقال کیا۔

(۲) سید احمد نام، ابوالخیر کنیت، مولوی امام الدین صاحب (خلف فرزند علی) کے فرزند ارجمند، مرحوم دہلی کے نامی گرامی مولویوں کے خاندان کے فرد اور خانوادہ سادات کے چشم وچراغ تھے، مولوی امام الدین صاحب ملکہ زینت محل اور مغل شہزادوں کے استاذ واتالیق ہونے کی وجہ سے دہلی میں بڑی شہرت وعزت رکھتے تھے، مولانا سید احمد صاحب مولانا میر سید محبوب علی صاحب جعفری کے بھانجے تھے، جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، مولانا سید احمد صاحب کو علوم عقلیہ بالخصوص ریاضی وہیئت میں ید طولیٰ حاصل تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے تھے کہ ''مولوی سید احمد صاحب کو خداوند کریم نے فنون ریاضی میں وہ استعداد ومناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان فنون کے موجدوں کو شاید اتنی ہی ہو۔'' دارالعلوم دیوبند کے قیام کو تیسرا ہی سال تھا کہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں دارالعلوم میں مدرس دوم مقرر ہوئے، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدرالمدرسین کے انتقال پر ۱۳۰۲ھ میں مسند صدارت پر فائز ہوئے، اور چھ سات سال تک وہیں تدریس وافادہ میں مصروف رہے، ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء میں نواب شاہجہاں بیگم کی درخواست اور طلبی پر بھوپال تشریف لائے اور مدرسہ جہانگیری کی صدر مدرسی واہتمام کے عہدہ کو قبول کیا، لیکن یہ فیضان علمی زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا اور چار سال بعد ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں آپ نے اس دارفانی سے کوچ فرمایا، مولانا نہایت خاموش، کم آمیز اور باوقار عالم تھے۔

(افادہ مولانا قاضی وجدی الحسینی صاحب بھوپالی)۔

(۳) شیخ محمد عربی مشہور محدث شیخ بن محسن کے صاحبزادہ تھے جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے، فن عروض وقوافی، معانی بیان اور فنون عربیت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، عربی کے قادر الکلام شاعر تھے، ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاد اعلیٰ رہے، ان کے صاحبزادہ شیخ خلیل عرب اپنے زمانہ کے نامور استاد وادیب تھے، راقم سطور کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (۴) ترجمۂ مصنف۔

بھوپال کے قیام کی بڑی غرض وغایت اوراس کا سب سے بڑا ثمرہ اور فائدہ شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی کے درس حدیث میں شرکت اوران سے استفادہ تھا، شیخ حسین بن محسن کا وجود اوران کا درسِ حدیث ایک نعمت خداوندی تھا، جس سے ہندوستان اس وقت بلاد مغرب ویمن کا ہمسر بنا ہوا تھا، اوراس نے ان جلیل القدر شیوخ حدیث کی یاد تازہ کردی تھی، جو اپنے خداداد حافظہ، علوئے سند اور کتب حدیث ورجال پر عبور کامل کی بنا پر خود ایک زندہ کتب خانہ کی حیثیت رکھتے تھے، شیخ حسین بہ یک واسطہ علامہ محمد بن علی شوکانیؒ صاحب ''نیل الاوطار'' کے شاگرد تھے، اوران کی سند حدیث بہت عالی اور قلیل الوسائط سمجھی جاتی تھی، (۱) یمن کے جلیل القدر اساتذۂ حدیث کے تلمذ وصحبت، غیر معمولی حافظہ، جو اہل عرب کی خصوصیت چلی آرہی ہے، سالہا سال تک درس وتدریس کے مشغلے اور طویل مزاولت اوران یمنی خصوصیات کی بنا پر جن کی ایمان وحکمت کی شہادت احادیث صحیحہ میں موجود ہے، حدیث کا فن گویا ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرگیا تھا، اوراس کے دفتر ان کے سینہ میں سما گئے تھے، (۲) وہ ہندوستان آئے تو علماء وفضلاء (جن میں سے بہت سے صاحب درس وصاحب تصنیف بھی تھے) نے پروانہ وار ہجوم کیا، اورفن حدیث کی تکمیل کی اوران سے سند لی، تلامذہ میں نواب سید صدیق حسن خان، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا عبداللہ غازیپوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا سلامت اللہ

---

(۱) شیخ صاحب کو یمن کے حدیث کے تین شیوخ کبار سے تلمذ اور اجازت تھی، ایک حضرت علامہ سید عبدالباری الاہدل، دوسرے علامہ سید محمد بن ناصر الحازمی، تیسرے علامہ شیخ احمد بن محمد بن علی الشوکانی۔

(۲) میرے استاد حدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکیؒ (شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) جو شیخ صاحب کے شاگرد تھے، فرماتے تھے، کہ فتح الباری (جس کی ۱۳ ضخیم جلدیں ہیں اور ایک مقدمہ کی علاحدہ جلد ہے) شیخ صاحب کو تقریباً حفظ تھی۔

جیراج پوری، نواب وقارنواز جنگ مولوی وحید الزماں حیدرآبادی، علامہ محمد طیب مکی، شیخ ابوالخیر احمد مکی، شیخ اسحٰق بن عبدالرحمٰن نجدی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا سید عبدالحی صاحب نے ان سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد، اول سے آخر تک لفظ بلفظ پڑھیں، اور خود ان کتابوں کی قرأت کی، نیز سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی اور مشکوٰۃ ومؤطا کی سماعت کی، اساتذہ اور علمائے بھوپال کی ایک خصوصی مجلس میں شیخ صاحب نے آپ کو آخری سبق پڑھایا اور سند فراغ دی، اور تمام علوم میں آپ کو درس وتدریس کی تحریراًوتقریراًاجازت دی، یہ واقعہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء کا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ آپ نے شیخ صاحب سے حصن حصین اور بلوغ المرام وغیرہ بھی پڑھی اور مسلسلات کی اجازت لی، شیخ صاحب نے اپنی تمام مرویات اور ساری کتابوں کی اجازت دی، اور بعض رسائل ان کے لئے تصنیف فرمائے، نزہۃ الخواطر میں مولانا سید عبدالحی صاحب نے لکھا ہے کہ ''وہ مجھ سے اولاد کی طرح محبت فرماتے تھے، لکھنؤ تشریف لاتے تو میرے یہاں قیام فرماتے، بعض اوقات مہینہ مہینہ بھر قیام فرمایا۔''(۱)

شیخ حسین عرب کے علاوہ مولانا سفر دہلی کے موقع پر، جو ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں پیش آیا، تقریباً دو ہفتے مولانا سید نذیر حسین صاحب کے درس حدیث میں شریک رہے، میاں صاحب نے آپ کو صحاح ستہ اور ان کے ملحقات کی سند اور ان کے پڑھانے کی اجازت عطا کی، اور سند پر الفاظ لکھے: ''فأجزت له باقراء الكتب المذكورة وتدريسها لأنه أهلها وأحق بها." (میں نے صحاح ستہ اور ان کے

---

(۱) تفصیلی حالات وکمالات کے لئے ملاحظہ ہو! نزہۃ الخواطر جلد ر ۸۔

ملحقات کے درس وتدریس کی ان کو اجازت دی، اس لئے کہ وہ اس کے ہر طرح سے اہل اور اس کے نہایت مستحق ہیں۔) یہ سند ۲۶؍رجب ۱۳۱۱ھ کو عطا فرمائی۔

اسی طرح سے آپ نے مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی، جو حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے ممتاز ترین تلامذہ میں تھے، کو بھی صحاح ستہ کے اوائل سنائے اور انھوں نے اجازت دی، نیز حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے بھی، جن کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے براہ راست اجازت تھی، حدیث مسلسل بالاولیہ اور حدیث مسلسل بالمحبہ کی اجازت حاصل تھی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بھی مسلسلات کی اجازت حاصل ہوئی۔

بھوپال کے زمانۂ قیام میں آپ قاضی ایوب (۱) صاحب پھلتی، جن کا شمار اکابر علمائے حدیث وصلحائے وقت میں تھا، کی مجالسِ درس میں بھی شریک ہوئے، قاضی صاحب (غالبًا) حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندانی نسبت سے آپ سے بڑی محبت فرماتے تھے، اور خصوصی عنایت تھی، نزہۃ الخواطر میں ہے کہ مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی نے قاضی صاحب کی خدمت میں جب حدیث کا آخری سبق پڑھا اور فراغت وتکمیل کی سند لی تو آپ اس موقع پر موجود تھے۔

فن طب کی تکمیل

اس زمانہ میں عام دستور تھا کہ علوم دینیہ کے وہ طلباء جو طبعاً ملازمت اور اس

(۱) قاضی صاحب کے والد حکیم قمرالدین پھلتی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، خود قاضی ایوب صاحب، مولانا مفتی عبدالقیوم برہانوی کے خالہ زاد بھائی تھے، جو حضرت مولانا عبدالحی برہانوی (خلیفہ خاص حضرت سید احمد شہیدؒ) کے فرزند ارجمند تھے، قاضی ایوب صاحب کی وفات ۱۳۱۵ھ کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی یحییٰ صاحب ان کے مسند درس وافتا پر بیٹھے، اور عرصہ تک بھوپال میں افتا وقضا کی خدمت انجام دے کر ۱۳۵۰ھ میں وفات پائی۔

قسم کی پابندیوں کو پسند نہیں کرتے تھے جن سے ان کی آزادی میں فرق پڑے اور عزت نفس پر حرف آئے، باعزت طریقہ پر معاش حاصل کرنے کے لئے فن طب کی تحصیل کرتے تھے، عرصہ تک درس نظامی میں طب کی بعض کتابیں بھی داخل رہی ہیں جن سے ایک گونہ اس فن سے مناسبت پیدا ہوجاتی تھی، پھر جو لوگ اس میں مہارت پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ درسیات سے فارغ ہوکر کسی استاد فن یا نامی طبیب سے اس فن کی تکمیل کرتے تھے، نصف صدی سے پیشتر کے اکثر علماء وفضلاء نے فراغت کے بعد طب پڑھی تھی، ان میں سے بہت سے لوگوں کو اس سے اشتغال کا موقع ملا اور بہت سے حضرات نے اس سے اشتغال پسند نہیں کیا، مولانا سید عبدالحی صاحب نے بھی جو شروع میں نہایت غیور طبع اور خوددار واقع ہوئے تھے، اسی بنا پر بھوپال کے زمانۂ قیام میں طب کی کتابیں لکھنؤ کے نامور طبیب جھوائی ٹولہ کے حکیم عبدالعلی صاحب سے، جو اس زمانہ میں بھوپال میں افسر الاطباء تھے، پڑھی تھیں، مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھتے ہیں:

''۱۳۱۱ھ میں آپ بھوپال سے لکھنؤ تشریف لے آئے اور جھوائی ٹولہ کے قریب چوپٹیوں میں قیام کرکے طب کی تکمیل میں مصروف ہوئے، طب کی ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے والد سے پڑھیں تھیں، اور شرح اسباب ونفیسی حکیم عبدالعلی سے پڑھ چکے تھے، یہاں آپ نے قانون حکیم عبدالعزیز صاحب سے پڑھنا شروع کیا، اور حکیم عبدالعلی صاحب مرحوم کے یہاں مطب شروع کیا تھا، اس زمانہ میں جھوائی ٹولہ میں ہفتہ واری طبی جلسے ہوتے رہتے تھے، اس میں آپ مضامین سناتے تھے، اور

آپ کے مضامین بہت بلند پایہ سمجھے جاتے تھے، یہاں آپ ۱۳۱۲ھ کے آخر مطابق ۱۸۹۵ء کے اوائل تک مقیم رہے، اس کے بعد فراغت حاصل کر کے وطن تشریف لے گئے۔"(۱)

سرسید احمد خان کے نام ایک تاریخی خط

یہ وہ زمانہ ہے، کہ سارا ہندوستان سرسید کے نام اور انکے اصلاحی کارناموں اور ان کی عظیم الشان تعلیمی تحریک کے آوازہ اور غلغلہ سے گونج رہا تھا، اور پڑھے لکھے مسلمانوں کا کوئی گھر، کوئی دینی و علمی مجلس، یہاں تک کہ شادی وغمی کی کوئی تقریب بھی جہاں چند مسلمان جمع ہوں، بالعموم اس تذکرہ سے خالی نہیں جاتی تھی، کہیں تنقید و اعتراض کے ساتھ، کہیں تحسین واعتراف کے ساتھ، اور کہیں حیرت واستعجاب کے ساتھ اور جدید حلقوں میں تمام تر تحسین واعتراف بلکہ عقیدتمندی کے غلو ومبالغہ کے ساتھ، جہاں تک انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم کی ضرورت کا تعلق ہے، اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور اس کو بہت سے اہل قلم لکھ چکے ہیں، کہ علماء نے اس کی یکسر مخالفت نہیں کی اور نہ اس بنا پر کسی نے سرسید مرحوم کی تکفیر و تفسیق کی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب انگریزی زبان کے سیکھنے کے جواز کا فتویٰ دے چکے تھے، سرسید کے شدید ترین مخالفین (مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی سید امداد العلی صاحب ڈپٹی کلکٹر وغیرہ) نے بھی کبھی اس کی (مطلق) حرمت کا اعلان نہیں کیا تھا۔

لیکن سرسید مرحوم کی تحریک (بدقسمتی وسوئے اتفاق سے) خاص تعلیمی تحریک اور مغربی زبانوں اور جدید علوم کے حصول کی دعوت نہیں تھی، اگر ایسا ہوتا تو صورت

---

(۱) ترجمۂ مصنف

حال قطعاً مختلف ہوتی، اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوتا، لیکن اس میں چند ایسے اجزاء وعناصر شامل ہو گئے جو نہ صرف یہ کہ اس تحریک کو کامیاب اور مقبول بنانے کے لئے ضروری نہ تھے، بلکہ اس کے لئے مضر اور اس کی کامیابی کی راہ میں حائل ہو گئے تھے، اور انھوں نے مسئلہ کو ایسا پیچیدہ بنا دیا کہ اچھے اچھے وسیع خیال اور انصاف پسند علماء کو بھی اس بارے میں اپنا رویہ اور پالیسی متعین کرنے کی راہ میں مشکلات پیدا ہو گئیں، اور لسان العصر میر سید اکبر حسین الہ آبادی اور مولوی امداد العلی کو بھی کلی یا جزوی مخالفت پر مجبور ہونا پڑا، اور عقائد وتحقیقات میں ان کے مخلص ترین رفیق ومؤید نواب وقار الملک مرحوم بھی ان کے ہمنوا نہ تھے۔(۱)

ان میں دو عنصر بہت اہم تھے، اور وہ دونوں تقریباً بانی تحریک کے ذاتی رجحان، افتادِ طبع اور ان کی غیر معمولی ذکاوتِ حس، مسلمانوں کی مادی ترقی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش وجذبہ اور انگریزوں کے تمدن وتہذیب اور ان کی صنعتی وسائنسی ترقی سے ضرورت سے زیادہ مرعوبیت کا نتیجہ تھا، ایک انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزوں کی تہذیب ومعاشرت اختیار کرنے کی دعوت، جو سر سید کے مضامین، خطبات اور ''تہذیب الاخلاق'' کی فائل سے بخوبی نمایاں ہے، دوسرے قرآن پاک کی وہ عقلی اور جدید تفسیر، جو قدیم مسلّمات واصول موضوعہ سے آزاد، لغت، تواتر، تعامل، حدیث وسنت اور اجماعِ امت سے بے نیاز اور جدید تحقیقات وانکشافات بلکہ رجحانات ومیلانات کو (جو مغربی تہذیب کے اثر سے اس دور میں پھیلے ہوئے تھے) قرآن مجید کے فہم وتفہیم میں اساس قرار دینا اور اگر ان کا تقاضہ ہو تو بے تکلف کسی بڑے سے بڑے قطعی

(۱) مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ''وقار حیات'' میں لکھتے ہیں: ''باوجود ان تعلقات کے وہ کسی مذہبی مسئلہ میں سر سید کے ہم خیال نہ تھے اور سر سید کو بھی یہ بات معلوم تھی۔'' ص ر ۲۳۷۔

الثبوت اور اجماعی مسئلہ اور عقیدہ کی نہ صرف تاویل اور نہ صرف انکار بلکہ استخفاف واستہزاء، اس بنا پر وہ تمام غیبی حقیقتیں جو تمام آسمانی مذاہب اور صحف سماوی کی بنیاد ہیں، اور جن پر ایمان لانا ضروریات دین میں داخل تھا، مثلاً جنت ودوزخ کا خارجی وجود، ملائکہ وشیاطین کا (بحیثیت اجسام) وجود، جن کا وجود، وحی اور نبوت کی حقیقت، رؤیت باری، قرآن کا لفظاً ومعنیً منزل من اللہ ہونا، معجزات وخوارق کا صدور، جو عام انسانی طاقتوں اور بشری ذرائع کے بغیر انسانی تجربہ کے خلاف پیش آئے اور مابعد الطبیعیات کا ایک بہت بڑا حصہ، جس کے ماننے اور ایمان لانے کے لئے اللہ کی قدرت کاملہ اور عالم غیب کے وجود پر ایمان لانا ضروری ہے، نہایت بعید تاویلات یا کھلے انکار کا نشانہ بن گئی، (۱) یہ عناصر ان کی دعوت کے ساتھ کچھ اس طرح گھل مل گئے اور انھوں نے اس پورے مجموعہ کی تبلیغ وترغیب اور اعلان وتشہیر میں اور ان کے مخالفین کی تردید میں، اس طرح یکساں جوشِ خطابت سے کام لیا کہ ان کے بہت سے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو بھی ان کی مدافعت اور ان کی تعلیمی تحریک کو ان اجزاوعناصر سے الگ کرنا مشکل ہوگیا اور اس امتزاج نے غیر ضروری طریقہ پر ان کی اس تحریک کے لئے مشکلات پیدا کردیں جو اس دور کے مسلمانوں کے لئے نہ صرف مفید بلکہ ضروری وناگزیر تھی، اور مدافعت ومخالفت میں ملت کی ذہانت اور وقت کا ایک بڑا سرمایہ بلاوجہ ضائع ہوا، جس پر ہر دردمند اور حقیقت پسند مسلمان کو، خواہ وہ قدیم حلقہ سے تعلق رکھتا ہو یا جدید حلقہ سے، افسوس ہونا چاہئے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب خود انگریزی تعلیم کے مخالف نہ تھے، انھوں نے

(۱) حیات جاوید میں مولانا حالی نے سرسید کے ان ''تفردات'' کی فہرست دی ہے، جن میں وہ سواد اعظم اور اہل سنت کے مسلک سے الگ ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، کچھ عرصہ اس کی ابتدائی تعلیم حاصل بھی کی تھی، ان کے خاندان کے ایک مقتدر بزرگ، جن کی انھوں نے بچپن میں زیارت کی تھی، مولوی سعید الدین (۱) صاحب نہ صرف انگریزی داں اور کامیاب وکیل رہ چکے تھے بلکہ اپنے بعض کمسن عزیز بچوں کو انھوں نے انگریزی پڑھنے کی ترغیب بھی دی تھی، اس طرح وہ خاندانی طور پر سرسید کے علوئے خاندان، ان کے خلوص، ان کی ہمدردی اسلامی، ان کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی سے بخوبی واقف تھے، اور اس کے دل سے قدردان تھے، لیکن وہ نہ صرف ایک راسخ العقیدہ بلکہ ایک راسخ العلم اور صاحب نظر عالم کی حیثیت سے ان کی بے اعتدالیوں اور علمی جسارت اور اس غیر محدود اور غیر مقید دینی تاویلات اور انحراف کو ناپسند کرتے تھے، جو انھوں نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا تھا، اور جس میں وہ نہ صرف صحابہ کرامؓ، جو قرآن کے اولین مخاطب اور اہل زبان تھے، بلکہ لغت عرب اور تمام اسلامی نسلوں اور تاریخ کے تمام عہدوں کے متفقہ فہم و عقل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اسی احساس اور حمیت اسلامی نے ان کو باوجود اس کے کہ وہ

(۱) مولوی سید سعید الدین صاحب، مولوی سید غلام جیلانی کے صاحبزادہ اور مولانا سید محمد ظاہر صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، لکھنؤ میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی، پھر تلاش معاش میں حیدرآباد پھر کلکتہ کا سفر کیا، کلکتہ میں اپنے زمانہ کی نامور شخصیت راجہ رام موہن رائے سے تعارف ہوا اور وہ ان کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے، اور اکبر شاہ ثانی کی پیشی میں دو سال رہے، مولوی سعید الدین صاحب دوبارہ کلکتہ واپس آئے، انگریزی زبان اور قانون کی تعلیم حاصل کی، اور اٹھارہ برس تک مظفر پور، بہار میں کمال احتیاط کے ساتھ وکالت کی، غالباً ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۷ء میں وطن واپس آئے اور خدمت و عبادت، حسن سلوک، صلہ رحمی میں مصروف رہ کر ۲۳ر جمادی الاول ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۷ر جون ۱۸۷۶ء میں وفات پائی، صاحب جائداد اور صاحب حیثیت ہونے کے باوجود نہایت سادہ زندگی تھی، دیانتداری، صفائی معاملات، راست گوئی، تواضع، سخاوت و ایثار، ان کی سیرت کے نمایاں پہلو تھے، نوجوانی میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت کی، اور آخر تک ان کے مسلک و طریق پر قائم رہے، مولانا شاہ ضیاء النبی صاحب انھیں کے قابل فخر فرزند تھے۔

ایک گمنام طالب علم تھے، جو تحصیل علم کے آخری مدارج طے کررہا تھا، سرسید جیسی عظیم شخصیت سے خط وکتابت پر آمادہ کیا، جس کی تحریروں، تقریروں اور کارناموں کی سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی، انھوں نے ۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۲ھ میں (سرسید کی وفات سے تین سال پہلے)(۱) ان کو اس زمانہ میں خط لکھا، جب وہ بھوپال میں طالب علمی کررہے تھے، اس خط سے جو خوش قسمتی سے مسودہ کی شکل میں قدیم کاغذات کے انبار میں مل گیا، ان کی بہت سی مزاجی خصوصیات و دینی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے، جو ان کی زندگی اور شخصیت کا خاص جوہر ہے، یہ خط جو انھوں نے ۲۶/ سال کی عمر میں لکھا ہے، نہایت شائستہ اور مہذب انداز میں لکھا گیا ہے اور انتہا پسندی اور خیال آرائی سے بالکل پاک ہے، اس میں اس جھنجھلاہٹ اور تلخ کلامی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، جس کی مولانا حالی کو عام طور پر سرسید کے ناقدین ومعترضین سے شکایت ہے، خط میں سرسید کی بڑائی، ان کے عزائم کی بلندی، ان کے اسلامی درد اور مسلمانوں کی محبت، ان کی خاندانی شرافت اور عظمت کو خوب سراہا گیا ہے، اور انکے جذبات کی پوری قدر کی گئی ہے، انکی کامیابی اور عزت و نیک نامی کی پر خلوص خواہش کا اظہار کیا گیا ہے، اور ان کی تدابیر پر کوئی اعتراض اور ان میں مداخلت نہیں کی گئی، جو وہ مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لئے اختیار کررہے تھے، لیکن مخلصانہ اور نیازمندانہ طریقہ پر مشورہ دیا گیا ہے کہ صرف دنیاوی و مادی ترقی کو مطمح نظر نہ بنایا جائے اور دنیا کو دین سے الگ نہ کیا جائے، کہ مسلمانوں کو حقیقی کامیابی و ترقی دین ہی کی راہ سے ہوسکتی ہے، خط کا مرکزی و بنیادی مضمون یہ ہے، کہ دین کے نصوص وقطعیات کے فہم وتفہیم کے بارے میں ان فطری وعقلی ذرائع اور ان مآخذ پر اعتماد وانحصار کیا جائے، جو عقل صحیح

(۱) سرسید کا انتقال ۱۸۹۷ء مطابق ۱۳۱۵ھ میں ہوا۔

اور فطرت سلیم کے نزدیک ہمیشہ سے ضروری رہے ہیں، یعنی لغت عرب، سنت متواترہ، فہم صحابہؓ اور اجماعِ امت، یہ خط درحقیقت نہ صرف ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے بلکہ اس عہد کے راسخ العقیدہ لیکن وسیع النظر نوجوان علماء کے طریقۂ فکر کے معلوم کرنے کے لئے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

''بخدمت عالی جناب ڈاکٹر سر سید احمد خان صاحب بہادر دام بالقابہ، تسلیم! ہر چند کہ مجھ میں اور آپ میں سابقہ معرفت نہیں، اور آپ مجھ کو نہیں جانتے مگر میں آپ کی ذاتی شہرت کی وجہ سے خوب جانتا ہوں اور آپ کی قومی خدمتوں کو تعظیم واخلاص کی نظر سے دیکھتا ہوں، میں جلد باز لوگوں کی طرح بہت جلد رد وقبول میں پیش قدمی نہیں کرتا، بلکہ غور وفکر کے بعد نتیجہ اخذ کر کے آپ کی عقل وذہانت وخوش تدبیری ونیک نیتی وقومی خدمت وپاک نفسی، اسی قسم کی اور باتوں کو قابل ستائش سمجھتا ہوں، میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے سیادت کو صرف لفاظی وشیریں زبانی پر نہیں چھوڑا بلکہ سچی اور اصل سیادت، خادمِ قوم بن کر حاصل کی ہے، جس کی نسبت ہمارے حضرت روحی فداہ کا ارشاد ہے: ''سید القوم خادمھم'' میں اس کا بھی معترف ہوں کہ آپ کی سچی خدمتوں کی داد دینے میں میرے ناچیز الفاظ قاصر ہیں، بے شک آپ کا جوہر ذاتی اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ کوئی شخص اس کی تحسین وآفریں کرے، بلکہ وہ میری یا کسی کی تحسین وآفرین کا محتاج نہیں ہے اور ان کے اظہار کے واسطے اپنا وقت ضائع کرنا اور

آپ کو سمع خراشی کی تکلیف دینا، بے سود ہی نہیں، تحصیل حاصل ہے، اسی واسطے میں ان باتوں سے قطع نظر کر کے ان افسوسناک باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے مجھ کو بلا سابقہ معرفت خط لکھنے پر آمادہ کیا ہے، اور جن کے اثر سے مجھ کو بعض باتوں میں ایسے بزرگ و تجربہ کار شخص سے اختلاف رائے کرنے میں کچھ باک نہیں، مگر وہ باتیں دنیاوی تدابیر سے نہیں ہیں، کیونکہ میں ان میں اکثر آپ کا ہم خیال ہوں، بلکہ یہ کہنا بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہے، ورنہ میں کیا اور میرا خیال کیا، تجربہ کی حیثیت سے ان امور میں جس قدر آپ کو تفوق ہے، وہ پوشیدہ نہیں ہے۔

وہ باتیں جن سے مجھ کو اختلاف ہے مذہب وملت کے متعلق ہیں، جن میں آپ کو جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا پاتا ہوں اور بے شک ان باتوں میں آپ مخطی ہیں، اگر میرا زعم و خیال ان باتوں میں آپ کا تخطئہ کرتا تو ممکن تھا کہ میں اپنے زعم و خیال کی تغلیط کرتا اور آپ کو برسر حق سمجھتا، مگر افسوس تو یہ ہے کہ جمہور اہل سنت والجماعت کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ سب آپ کے خیالوں کی تغلیط کر رہے ہیں، پس میں کیوں کر آپ کی شخصی رائے کو ان امور میں ان کے سامنے کسی قدر و وقعت کی نظر سے دیکھ سکوں، خصوصاً ان بزرگان قوم کے حضور، جن کی عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ صرف کتاب وسنت کی خدمت میں گزرا ہے، جنھوں نے اپنی آسائش سے بالکل دست بردار ہو کر نشر علوم ہی کو سرمایۂ حیات سمجھا ہے، بہار

زندگی کے وہ دن، جن کو عموماً ہر شخص آرام طلبی میں بسر کرتا ہے، انھوں نے طلب علم کے مصائب اور دور دراز کے سفر کی تکلیفوں کے نذر کردیئے اور علم کو حاصل کیا، حاصل ہی نہیں بلکہ جرح وتعدیل، تخریج وترجیح، اصول وفروع کے قواعد ایسے منضبط کیے، جن سے زیادہ منقح ہونا محال عادی ہے، اور مقتضائے عقل بھی یہی ہے کہ جس نے تمام عمر ایک کام میں صرف کی، اس کے اصول وفروع پر مباحثہ بھی کیا اور بجائے خود بھی ردوقبول کی نگاہ سے اس کو دیکھتا رہا تو وہ اس کے اکثر پوشیدہ رازوں اور باریک راہوں سے واقف ہوجاتا ہے، چہ جائیکہ ایک جم غفیر نے اپنی اپنی زندگیوں کو اس کے نذر کردیا ہو اور قرناً بعد قرن ہر ہر بات پر مباحثے کیے گئے ہوں، اس میں خطا کا گمان کرنا سوءِ ظن نہیں بلکہ ایک حد تک خودرائی ہے۔

مگر اس سے بھی قطع نظر کرکے ایک اور بات کہتا ہوں، جس میں ہم آپ شریک ہیں، قرآن پاک آسمانی منزّل من اللہ وقطعی الثبوت ہے، اس میں ارشاد ہوتا ہے: "فإن تنازعتم في شيئ فردّوه إلى الله والرسول." اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنا، یہی ہے کہ قرآن کو حاکم ٹھہرائیں، اور رسول مقبول ﷺ سے تصفیہ کی درخواست کریں، مگر رسول مقبول ﷺ نے سفر آخرت اختیار فرمالیا ہے، پس ضرور ہے کہ سرورکائنات ﷺ سے جو باتیں منقول ہیں، انھیں کو بجائے آنحضرت ﷺ کے مقتدا تسلیم کریں، تاہم اس قدر ضرورت باقی ہے، کہ احادیث کے صحت وسقم کے

احتمال کو رفع کریں، لیکن جس وقت محدثین نے رواۃ ثقات بحفظ قواعد جرح وتعدیل کے روایت کر کے کتابیں مدون کیں اور وہ متلقی علیہا بالقبول ہو گئیں، تو وہی احادیث بلا شبہہ رفع نزاع وفیصلہ کے واسطے مستند ہیں، پس ان مقدمات سے میں جہاں تک خیال کرتا ہوں، یہ دونوں حاکم عادل، مقبول الفریقین ہیں اور یہ دونوں جو فیصلہ کریں، وہی فیصلہ ٹھیک ہے، اس میں مرافعہ کی گنجائش نہیں ہے، البتہ اس قدر اس مقام میں خدشہ ہو سکتا ہے کہ الفاظ و معانی میں گو شبہہ نہیں ہے، معانی کے تحقیق وتاویل میں گفتگو ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ خدشہ بھی نسج عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، کیونکہ اس کے واسطے بہت کافی معیار ہمارے ہاتھ میں ہے، اگر تھوڑا بھی آدمی غور کرے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ طرز ادا اور اندازِ کلام کو وہی خوب سمجھ سکتا ہے، جس کے سامنے متکلم نے گفتگو کی ہے، دوسرا شخص جو اس موقع پر حاضر نہیں ہے، اس گفتگو کا پورا حظ حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ اکثر باتیں وقت وقرینہ وسیاق سے سمجھی جاتی ہیں اور ان سب باتوں کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس کا اصلی مخاطب ہے۔

اس مقدمہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ صحابہ کرامؓ سے بہتر آپ کی حدیثوں کا مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا، پس اس سے اس امر میں مدد لینا ضروری ہی نہیں بلکہ واجب ہے، کہ ان کے سامنے ہماری رائے مستند نہیں ہو سکتی، اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فہمِ مطالب میں

ہم اور وہ، دونوں برابر ہیں، حاشا ثم حاشا ان کو جو باتیں حاصل تھیں، ہم کو ان کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں، ہاں! اگر کسی بارے میں ان کا کوئی قول منقول نہیں ہے، تو اس وقت ہم اس میں غور کر سکتے ہیں، لیکن یہ بات نہیں ہے کہ صرف شخصی رائے کی پابندی سے بلکہ بلحاظ قواعد مقرر کے، جن کے واسطے علوم آلیہ کی بہت ضرورت ہے، اسی واسطے صرف، نحو، معانی و بیان و بدیع وحفظ اشعار عربِ عربا، ولغت وایام العرب و مصطلحات وغیر ذلک سے کسی طرح شبکدوشی نہیں ہوسکتی، اور ان سب پر عقل سلیم اور ذوق صحیح کی اشد ضرورت ہے، پس جو شخص ان میں بخوبی ماہر ہو اور قوت مجتہدانہ رکھتا ہو، وہ کچھ بحث و تفتیش کی صلاحیت رکھتا ہے، اور جو علوم مذکورہ سے واقف نہ ہو، وہ صرف عقل کی پابندی سے کچھ نہیں کر سکتا، بلکہ ایسا خیال کرنا بوالہوسی وطمعِ خام ہے، جو معانی صحابہ کرامؓ و مجتہدانِ ملت سے منقول ہیں، وہی معمول بہ و مدار علیہ دین وملت کے ہو سکتے ہیں، اس کی شہادت میں یہ حدیث بھی پیش کر سکتا ہوں:

"....وتفترق أمتي على ثلاث و سبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة ، قالوا: من هي يا رسول اللهؐ؟ قال ماأنا عليه وأصحابي" (رواه الترمذي)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ طریقہ مرضیہ وہی طریقہ ہے، جو صحابہ کرامؓ کا ہے، پس کلام کو بغیر صارف قطعی کے مصروف عن الظاہر اور غیر متحمل التاویل کو ماوّل کرنا جرأت ہی نہیں بلکہ توجیہ

الکلام بمالا یرضیٰ یہ قائلہ کا مصداق ہے، اگر کچھ شک ہو، تو اس آیت کی تلاوت فرمایئے:﴿هو الذى أنزل عليك الكتاب، منه آيات محكمات، هن أم الكتاب، وأخر متشابهات، فأما الذين في قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تأويله وما يعلم تأويله إلا الله، والراسخون في العلم يقولون آمنا به، كل من عند ربنا وما يذكر إلا أولو الألباب☆ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة، إنك أنت الوهاب☆﴾

اس سے بھی قطع نظر کیجئے، تیسری بات بھی بداہت کے درجہ پر ہے، کہ انسان مدنی الطبع ہے جس طور پر ہر شخص کی صورت وشکل متخالف ہیں، اسی طور پر ہر ہر ایک کا مزاج مختلف ہے اور سب کی عقلیں یکساں نہیں ہیں، کوئی بلید الذہن ہے اور کوئی ذکی الطبع اور ان صفتوں میں درجات متفاوت ہیں، بعضہا فوق بعض، اس کے ثبوت کے واسطے زیادہ غور کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص بیوقوف اور ہوشمند کے تمایز کو خوب سمجھتا ہے، مثلاً آپ ہی ہیں، کہ میرے زعم میں ہزار دو ہزار میں دقیق النظر وحدید البصر ہیں، ایسی حالت میں اگر احکام وشرع الٰہیہ میں غور وفکر جائز رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی رائے کے موافق رائے زنی کرے گا، اور اس میں ہر رائے زن کی رائے صواب پر نہیں ہوسکتی، اسی واسطے جناب شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ قول بہت صحیح

ہے، کہ الٰہیات میں گفتگو کرنے کی اجازت، بڑی خطرناک ہے، بہرحال قانون شریعت کی پابندی کے سوا کوئی راہ منزل مقصود تک نہیں پہونچا سکتی اور جو شخص اس کے سوا اور راہ موصل الی اللہ سمجھے، وہ الٰہیات سے بالکل بیگانہ ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ می روی بہ ترکستان است

یہ مقدمات جو میں نے ذکر کئے ہیں، وہ مقدمات ہیں، جن کے تسلیم کرنے میں عقل کچھ پس وپیش نہیں کرتی اور چونکہ فی زعمی آپ بہت دانشمند ہیں، اس واسطے ضرور ہے کہ آپ بھی ان کو تسلیم کریں گے، گویا یہ مقدمات مسلمۃ الفریقین ہیں، لہٰذا ان کو میں لطف قریحہ کی تحویل میں دے کر مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں، کہ آپ نے اس وقت جتنی تأویلیں فرمائی ہیں، وہ سب بمنزلہ توجیہ الکلام بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے ہیں، خود ہی اگر آپ مقدمات مذکورہ کی مراعات سے ان میں غور فرمایئے تو آپ ہی کی نگاہ میں ہیچ وپوچ نظر آئیں گے، کسی فاضل کے سامنے ان کی اس سے زیادہ وقعت نہیں ہے، جتنی اس جھوٹ کی ہے، جس کو شیریں بیانی اور لفّاظی کا لباس پہنایا گیا ہے، مگر انجام کیا ہے، وہی جو ظاہر ہے، یعنی دروغ بے فروغ، "الصدق ینجي والکذب یهلك"، مخالف کو جواب دینا اور خدا اور رسولِ خدا ﷺ کے دشمنوں کی زبان بند کرنا، کتنا ہی مقصود ہو، لیکن جب توجیہ الکلام بما لا یرضیٰ بہ قائلہ

ہے ،تو بالکل بے سود، نہ اس سے اللہ خوش، نہ رسول اللہ ﷺ راضی، نہ جن پر سے وہ الزام اٹھائے گئے ہیں وہ شکر گزار۔

خدارا مشکوٰۃِ نبوت سے روشنی حاصل کیجئے، یورپین لالٹینوں کی دھندلی اور نکمّی روشنی، ایسے خطرناک راستہ کام نہیں دے سکتی، آپ تو خاندانِ نبوت میں منسلک ہیں، اگر آپ اپنی طبیعت ایک لحظہ بھر کے واسطے ما و من کے خیالات سے فارغ کر کے غور کیجئے گا تو آپ پر یقیناً حق بات پوشیدہ نہیں رہے گی، قاعدہ کی بات ہے کہ آدمی کو جو دھن بندھ جاتی ہے اسی کو حق سمجھنے لگتا ہے، فلسفی کا یہ قول غلط نہیں ہے، اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی، تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ فلاسفۂ ہند کا قول ہے، اور بہت صحیح ہے، کہ ''انسان کو جس بات کی دھن بندھ جاتی ہے اس کی عکسی تصویر اس کے خانہ خیال میں ایسی متمثل ہو جاتی ہے کہ وہ اسی کو نفس الامر سمجھنے لگتا ہے'' آپ خود جانتے ہیں مگر افسوس! غفلت میں ہیں، زندگی کا مدار علیہ شاید آپ نے یہیں کی بیہودہ سرائے کو سمجھ لیا ہے، مگر یہ بہت بڑی غلطی ہے، یہی غفلت، انجام کار انسان کو ہلاک کر دیتی ہے، یہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں، کاش! آپ اپنے مذہبی عقائد کو صحیح کر کے کرتے تو دنیا میں اس سے زیادہ آپ کو نیک نامی حاصل ہوتی اور آخرت میں اپنے سلف صالحین کے ساتھ ہوتے، مگر میں ڈرتا ہوں کہ اس بہت بڑی غلطی سے آپ نے اخروی توقعات کو خیر باد کہا اور دنیاوی زیب وزینت کو رفیقِ طریق سمجھنے لگے، جس کا انجام

خدانخواستہ وہی ہوتا ہے، جو خدا نے کہا ہے:

﴿قل هل ننبئكم بالأخسرين أعمالاه الذين ضل سعيهم في الحيوٰة الدنيا وهم يحسبون أنهم يحسنون صنعا.﴾

فرمائیے تو سہی، فوز و فلاح کی کیا امید ہے، حقیقت کو چھوڑ کر مجاز پر عمل کرنا کیسی بری بات ہے۔

روزے کہ بارگاہ حقیقت شود پدید
شرمندہ رہرو ے کہ عمل بر مجاز کرد

اس میں شک نہیں کہ کسب معاش و خودداری کسی حد تک شرعاً محمود ہے، لیکن اس کو نہ بھولنا چاہئے کہ یہ سب وسائل ہیں اور مقصود خدا طلبی ہے، وسیلہ کو وسیلہ اور مقصود کو مقصود سمجھنا فرض ولازمۂ انسانیت ہے، اگر کوئی شخص وسیلہ کو مقصود پر ترجیح دے تو سب وہی کہیں گے جو ایک دیرینہ سال تجربہ کار فاضل ریفارمر کہہ گیا ہے۔

نباشد دل آں فرومایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

دنیا اسی کا نام ہے، کسب معاش کا نام نہیں، صحابہ کرامؓ کو دیکھئے کہ کس قدر دولت مند تھے، حضرت عثمانؓ نے اسی دولت مندی کی بدولت ''غنی'' کا لقب حاصل کیا اور حضرت زبیرؓ کا جب انتقال ہوا تو پانچ کروڑ دو ہزار کی دولت چھوڑ گئے، (دیکھو صحیح بخاری) اسی کے قریب قریب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چھوڑا، مگر یہ اکابر صحابہؓ دنیا دار نہ تھے، جس کی مذمت خدا نے جابجا اپنے کلام

پاک میں ارشاد فرمائی ہے، دنیادار ہم ہیں، جو دین کو ارزاں سمجھتے ہیں اور اسی کو قبلۂ ہمت بنائے ہوئے ہیں، ﴿ومن كان يريد حرث الدنيا نؤته منها وما له في الآخرة من نصيب.﴾ سید صاحب! خاکستر اگر چہ نسب عالی دارد کہ آتش جوہر علویست مگر چوں در ذات خود ہنرے نہ دارد باخاک برابر است، ان باتوں کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے، خوب غور کر کے دیکھئے، پھر تنہائی میں دیکھئے اور دل کو تمام وسوسوں سے خالی کر کے دیکھئے، یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کو سن کر باخدا لوگوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دل کانپ اٹھتے ہیں، نور اسلام بڑی عزیز الوجود چیز ہے اور یہ سب نعمائے دنیاوی چند روزہ ہیں، آپ رئیس قوم ہیں تو اپنے خیالات کو درست کر کے قوم کے خیالات درست کیجئے، ہمارے حضرت روحی فداہ ﷺ کی حدیث ہے: "كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته" آپ کے تابعین اور تبع تابعین کا مواخذہ بھی آپ ہی سے ہوگا، میرا دل نہیں چاہتا کہ ابھی قلم روکوں، مگر چونکہ زیادہ سمع خراشی کا کوئی نتیجہ نہیں ہے، اسی وجہ سے اسی پر کفایت کرتا ہوں، آپ یہ نہ خیال فرمائیے گا کہ ایک سن رسیدہ شخص کو دوسرا حدیث السن رہنمائی کر رہا ہے، بلکہ خود ان باتوں کو نظرِ غور سے دیکھئے اور یہ خیال فرمائیے کہ آپ سن رسیدہ ہیں، آپ کو ان باتوں کے سننے کی زیادہ ضرورت ہے، اب زادِ آخرت کی فکر کیجئے اور اعلان

کے ساتھ اپنے خیالات سے رجوع فرمائیے تاکہ گمشدگانِ وادیٔ آخرت راہ پر آئیں، کیا خوب ہو کہ اس کے بعد میں سنوں کہ ہمارا نیک نیت و پاک نفس سید اپنے سلف کرام کا ہم خیال ہو گیا ہے اور اپنی قوم کے واسطے داعی الی اللہ کا کام کر رہا ہے، یہ آپ کا نیاز مند آپ کے واسطے نہایت سچے دل سے دعا کرتا ہے اور ان لوگوں میں نہیں ہے جو کافر و فاسق کہہ کر نرم دل کو بھی گرم کر دیتے ہیں، ﴿ربنا افتح بيننا وبين قومنا بالحق وأنت خير الفاتحين﴾.

میں ہوں آپ کا سچا خیر خواہ
سید عبد الحی رائے بریلوی
۳۰ جنوری ۱۸۹۴ء از بھوپال

سرسید کا جواب

سرسید مرحوم نے بلا تاخیر(۱) اس مفصل خط کا ایک مختصر اور مجمل جواب دیا، جس کو خط کی ایک بزرگانہ اور شریفانہ "رسید" کہنا زیادہ صحیح ہوگا، یہ خط جو ہمارے یہاں کے خطوط کے مرقع سے نقل ہو کر متعدد بار شائع ہو چکا ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) مولانا سید عبد الحی صاحب کے خط پر ۳۰ جنوری ۱۸۹۴ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے اور سرسید مرحوم کا خط ۲ فروری ۱۸۹۴ء کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ میں جہاں ڈاک کی باقاعدگی اور محکمہ ڈاک کی کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں سرسید مرحوم کی خطوط کے جواب دینے کی مستعدی، اہتمام اور انضباط و باقاعدگی کا بھی پتہ چلتا ہے، ایسی شہرت و مشغولیت کے عالم میں وہ ہر خط کا جواب دینا ضروری سمجھتے تھے، خط کے لفافہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

بعالی خدمت جناب مولوی سید عبد الحی صاحب رائے بریلوی، محلہ فاطمہ پورہ، بھوپال۔

ڈاکخانہ کی مہر میں ۲ فروری کی تاریخ پڑی ہوئی ہے اور لفافہ کے اوپر ایک کنارہ پر "نج" لکھا ہوا ہے۔

جناب مولانا ومخدومنا مولوی سید عبدالحی صاحب

آپ کا نوازش نامہ مملواز نصائح ارجمند پہنچا، میں آپ کی عنایت وہمدردی اسلامی کا نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں، میری بھی دعا اپنے لئے اور آپ کے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے خداوند کریم سے یہی ہے ﴿اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضآلّين.﴾

خاکسار سید احمد

علی گڑھ، ۲؍فروری ۱۸۹۴ء

اس مراسلت کا اگرچہ بظاہر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، لیکن مکتوب نگار نے اپنی دینی حمیت وخیر خواہی، وہمدردی اور احقاق حق کا حق ادا کر دیا، اس سے زیادہ اپنے سن وسال اور شخصیت وحیثیت کے اعتبار سے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ع

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس

ایک معنی خیز خواب

مولانا نے طالبعلمی کے زمانہ میں ایک خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر یہ تھی کہ ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مزاج ومذاق سے خصوصی مناسبت حاصل ہوگی، اور ان کو حضرت شاہ صاحب کی جامعیت، تنوع، اعتدال وتوسط کی دولت ونعمت سے ایک حصہ ملے گا، یہ خواب خود مولانا کی زبان سے سنئے، نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں، جب میں کانپور میں

تحصیل علم میں مشغول تھا، خواب میں دیکھا کہ میں ایک کمسن بچہ کی طرح ایک بزرگ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں، جن کا رنگ صاف، کپڑے نہایت اجلے، بڑے بارعب اور صاحب شان وشوکت ہیں، مجھے خواب میں محسوس ہوا کہ یہ میرے آبائے کرام میں سے کوئی بڑی بزرگ ہستی ہے، میں ان کی گود میں کھیل رہا ہوں، کبھی ان کے گھٹنے پر، کبھی سامنے آکر بیٹھ جاتا ہوں اور وہ میرے ساتھ ایسی شفقت وملاطفت فرماتے ہیں جیسے باپ بیٹوں کے ساتھ کرتا ہے، اسی اثنا میں ایک دوسرے بزرگ آگئے جن کا سن مبارک کہولت اور بڑھاپے کے درمیان ہے، مجھے خواب میں القا ہوا کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے فرزند اکبر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ہیں، ان پہلے بزرگ نے، جن کی میں گود میں تھا اور وہ گویا ان دوسرے بزرگ کی آمد کا انتظار ہی کر رہے تھے، ان کو مخاطب کر کے کہا کہ اے عبدالعزیز! یہ میرا بیٹا ہے، اس کو تعلیم کے لئے آپ کے سپرد کرتا ہوں، یہ کہتے ہوئے وہ پہلے بزرگ تشریف لے گئے اور میں اور یہ بزرگ رہ گئے، میں دیکھتا ہوں کہ میں ان کی صحبت سے فیضیاب اور مستفید ہو رہا ہوں اور ان سے پڑھ رہا ہوں یہاں تک کہ میں نے تمام علوم متعارفہ ان سے حاصل کر لئے، پھر میری آنکھ کھل گئی۔" (۱)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی (اپنے تمام ظاہری وباطنی کمالات کے

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۷۲، ۲۷۳۔

ساتھ) سب سے نمایاں صفت ان کی غیر معمولی جامعیت اور ان کی طبیعت کا اعتدال اور سلامت روی ہے، وہ ایک طرف معقول ومنقول پر یکساں طور پر حاوی تھے، تفسیر وحدیث وفقہ کے مانے ہوئے امام اور استاد الکل تھے، دوسری طرف عربی کے نہایت بلند پایہ ادیب وشاعر، فارسی کے نثّار،(۱) شعر وشاعری کے مسلم الثبوت نقّاد اور ادا شناس، کہ دہلی کے نامی گرامی شعراء ان سے مشورہ سخن کرتے اور کھرا کھوٹا پہچانتے، خطاطی، علم موسیقی، تاریخ ومحاضرات کے اور علم مجلسی، اسی طرح سے علم کلام ومناظرہ اور حاضر جوابی میں بے نظیر اور ان تمام طبقوں اور حلقوں کے مرجع وماویٰ تھے، ان کمالات علمی وعملی کے ساتھ طبیعت میں اتنا اعتدال اور سلامت روی تھی کہ ہر طبقہ کے لوگ ان کا ادب واحترام اور ان کے فضل وکمال کا اعتراف کرتے تھے، اور متنازعہ فیہ مسائل میں انھیں کی طرف رجوع کرتے۔

آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مولانا عبدالحی صاحب کی علمی و تصنیفی زندگی میں جو تنوع اور جامعیت اور مزاج میں جو اعتدال ومیانہ روی نظر آتی ہے، وہ اس نسبت عالی کا ایک پرتو ہے، ایک طرف وہ علوم معقول ومنقول کے جامع، محدث اور فقیہ، دوسری طرف مؤرخ وادیب اور نقّاد وسخن شناس ہیں، ایک طرف وہ معقولات کی بلند پایہ کتاب ''شمس بازغہ'' کا درس کامیابی ومہارت کے ساتھ دیتے ہیں، دوسری طرف صحاح ستہ کو ایک صاحب فن کی حیثیت سے پڑھتے پڑھاتے ہیں، ایک طرف انکے قلم سے حدیث میں ''تلخیص الاخبار'' اور اس کی شرح ''منتہی الافکار'' نکلتی ہے تو دوسری طرف تراجم وتاریخ میں ''نزہۃ الخواطر'' اور ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' اور اس کے ساتھ اردو شعر وشاعری کی تاریخ میں ''تذکرہ گلِ رعنا'' جیسی کتابوں

---

(۱) جس پر ان کی کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' شاہد عدل ہے۔

کے مصنف ہیں، نیز طبیعت افراط وتفریط سے دور، جامع اور معتدل، عقائد واصول میں ایک طرف استحکام وتصلب، (جس کا ایک نمونہ سرسید کے نام وہ خط ہے، جو ابھی قارئین کی نظر سے گزرا۔) دوسری طرف فروع وجزئیات میں وہ توسع وتحمل تھا، جو ان کی تمام تحریروں اور ان کے طرزِ زندگی سے عیاں ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ وہ اہل سنت کے تمام مختلف الخیال علمی ودینی حلقوں اور مکاتب فکر میں یکساں طور پر احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور اسی بنا پر وہ تراجم وتاریخ کی پرخار وادی کو کامیابی کے ساتھ طے کر سکے اور ندوۃ العلماء کی ہمہ گیر تحریک کی قیادت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے، جس کا تعلق علماء کے مختلف حلقوں اور جماعتوں اور اہل سنت کے مختلف فرقوں سے رہا ہے، اس سب کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ایام طالب علمی کا وہ خواب خواب پریشاں اور اضغاث احلام نہیں تھا، بلکہ ایک معنی خیز خواب اور رویائے صادقہ تھا، جس کی تعبیر ان کے گوناگوں کمالات اور ایک جامع وہمہ گیر طبیعت ومزاج میں ظاہر ہوئی۔

﴿ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.﴾

□□□

باب سوم

بیعت وارادت، تعلیم سلوک واجازت، دینی مرکزوں کا سفراور مشائخ وعلمائے کبار سے استفادہ

تصوف واصلاحِ باطن کا مذاق عام

اوپر کے صفحات سے بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ مولانا سید عبدالحی صاحب نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، وہ ایک دینی اور روحانی ماحول تھا، ان کے دادیہال (دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) اور نانیہال (ہسوہ ضلع فتحپور) دونوں میں ایک ایک عظیم روحانی شخصیت اور جلیل القدر شیخِ طریقت، مسند آرا اور مصروف ارشاد وتربیت تھے، انھوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو یہی دیکھا کہ لوگ دور دور سے ان دونوں بزرگوں کے پاس اپنی اصلاح وتربیت کے لئے آتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں، خود ان کے والد ماجد مولوی سید فخرالدین صاحب ایک ذاکر وشاغل بزرگ اور اپنے زمانہ کے نامور شیخ حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیرآبادیؒ کے خلیفہ ومجاز تھے، یہ وہ دور تھا کہ تصوف کا مذاق، ایمانی کیفیات اور درجۂ احسان کے حصول کا ذوق اور اس کی فکر، علماء وصلحاء ہی کے طبقہ میں نہیں، امراء وحکام اور اہل دول میں بھی پائی جاتی تھی، اہل حکومت اور والیان ریاست بھی اس ''چاشنی'' سے محروم نہ تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب خود تذکرہ ''گل رعنا'' کے حاشیہ میں خلد مکان، نواب

کلب علی خان والی رامپور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دلی سے حضرت شاہ احمد سعیدؒ کو تشریف لانے کی تکلیف دی، وہ خود تشریف نہیں لائے مگر اپنے فرزند ارجمند، مظہر شریعت وطریقت، حضرت شاہ عبدالرشید صاحبؒ کو بھیج دیا، ان کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ان کی تشریف بری کے بعد سے مرتے دم تک مولانا ارشاد حسینؒ خلیفہ حضرت ممدوح سے اذکار واشغال کی ورزش کرتے رہے۔

حکیم عبدالعلی مرحوم فرماتے تھے کہ مرض الموت میں ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تم پر میرے جس قدر حقوق ہیں وہ تم جانتے ہو اور میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ تم کس قدر محبت ومحنت سے میرا علاج کر رہے ہو، مگر جب وقت آجاتا ہے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اس لئے تم سے صرف ایک امر متعلق کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ جس وقت تم کو یہ معلوم ہوجائے کہ میں اب جانبر نہ ہوسکوں گا، مجھے فوراً مطلع کردو، وہ فرماتے تھے کہ میں اس بات کو سن کر سناٹے میں آگیا اور سوچنے لگا کہ میں اس فرض کو کیونکر ادا کرسکتا ہوں، نواب صاحب مجھ کو فکر مند دیکھ کر سمجھ گئے اور مجھ سے دوبارہ تاکید کی، جب وقت آیا تو میں نے بار بار قصد کیا، مگر زبان نہ ہلتی تھی، خدا جانے کیونکر ان سے کہا، وہ خود سمجھ گئے، حکم ہوا کہ مولانا ارشاد حسین کو بلاؤ، وہ تشریف لائے تو لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور ان سے فرمایا کہ یہ وقت آپ کی ہمت وتوجہ

کا ہے، یہ کہہ کر دونوں مراقب ہوگئے اور اسی حالت میں روح نے جسد عنصری سے مفارقت کی، سبحان اللہ! "دنیا خورد و عقبیٰ برد" کے یہی معنی ہیں۔"

جس دور میں امراء ورؤساء اور اصحاب ریاست وحکومت کے طبقہ میں بھی یہ ذوق پایا جاتا ہو (جس کی یہ ایک تنہا مثال نہیں) اس دور میں علوم دینیہ کے طلباء وفضلاء اور دینی وروحانی خانوادوں کے وارثوں اور فرزندوں میں یہ ذوق وطلب کیوں نہ پائی جاتی، فطری سعادت اور نسلی اثرات کے علاوہ آپ کے تقریباً تمام اساتذہ یا تو خود صاحب باطن اور اہل دل تھے یا اہل باطن و اہل دل کے سچے قدردان اور مداح وثنا خواں، خاص طور پر آپ کے سب سے محبوب استاذ مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی خود فقیر صابر درویش کامل اور صاحب سلسلہ تھے۔

ان تمام اندرونی وبیرونی اثرات کا نتیجہ تھا کہ آپ کو طالب علمی ہی کے دور میں جب کہ آپ نصاب کی متوسط کتابیں پڑھ رہے تھے، سلاسل طریقت سے انتساب اور مشائخ کبار سے استفادہ کا شوق اور اپنی اصلاح وتربیت کا خیال پیدا ہوا۔

عرصۂ دراز سے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ طلباء علوم ظاہری کی تکمیل اپنے دور کے مشہور اساتذہ سے کرتے تھے اور اس سے فارغ ہوتے ہی (اور بعض اوقات اسی دوران میں) کسی ایسے شیخ سے جن سے ان کے اساتذہ منسلک یا ان کے عقیدت کیش ہوتے تھے، دولت باطنی کے حصول اور اخلاقی وروحانی تربیت کے لئے رجوع کرتے تھے، چنانچہ لکھنؤ وعلی گڑھ کے علمی حلقوں کے طلباء وفضلاء علمائے فرنگی محل اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے تلامذہ بالعموم گنج مرادآباد اور دیوبند وسہارنپور کے طلباء وفضلاء عام طور پر تھانہ بھون اور گنگوہ جاتے تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے خط وکتابت اور بیعت عثمانی

یہ وہ زمانہ تھا کہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا آفتابِ رشد وارشاد نصف النہار پر تھا، آپ اگر چہ عرصہ ہوا ہندوستان سے مکہ معظّمہ ہجرت فرما چکے تھے لیکن آپ کے باکمال خلفاء، نواحِ سہارنپور میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، کانپور میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور الٰہ آباد میں مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی، حضرت حاجی صاحب کے نام اور کام کو یہاں زندہ وتابندہ بنائے ہوئے تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب کے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالقاسم صاحب ہسوی (۱) جو آپ سے عمر میں چند سال بڑے اور تعلق ومحبت کے لحاظ سے بالکل حقیقی بڑے بھائی کی طرح تھے، حضرت حاجی صاحب اور مولانا گنگوہی سے مستقل خط وکتابت رکھتے تھے، حضرت حاجی صاحب نے ان کو اجازت بھی عطا فرمائی تھی، غالباً ان کی صحبت کے اثر اور اس چشتی ذوق اور اس رقت ورنگینی کی بنا پر جو شروع سے قلب میں پائی جاتی تھی،

(۱) مولوی سید عبدالعزیز صاحب کے فرزند، مولانا سید سراج الدین واسطی کے پوتے اور حضرت سید عبدالسلام صاحب ہسوی کے بھتیجے تھے، ۵/ربیع الاول ۱۲۷۵ھ (۱۴/اکتوبر ۱۸۵۸ء) ہسوہ میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے باکمال چچا سے پائی اور انھیں سے بیعت ہوئے، پھر ان کے ممتاز خلفاء سے تعلیم کی تکمیل کی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت حاجی صاحب سے مراسلت رکھتے تھے، اور ان دونوں حضرات کے ان کے نام بہت سے خطوط ہیں، جو خاندانی مرقعہ میں موجود ہیں، حضرت حاجی صاحب نے طرق اربعہ میں اجازت بھی مرحمت فرمائی تھی، عمدہ علمی اور تاریخی مذاق رکھتے تھے، ''مکتوب المعارف'' کے نام سے خاندان ولی اللہی کے بزرگوں کے خطوط (جو خاندان علم اللہی کے اکابر کے نام لکھے گئے ہیں) کا ایک بڑا مجموعہ مرتب کیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے رسالہ ''سرور المحزون'' کا ترجمہ ''نور علی نور'' کے نام سے کیا، مولانا سید عبدالحی صاحب سے چھوٹے حقیقی بھائی کی طرح تعلق تھا، اپنے خطوط میں ''روح روانم وقوت بازوئے ناتوانم'' لکھتے ہیں، ۱۲/ربیع الاول ۱۳۲۹ھ (۱۳/مارچ ۱۹۱۱ء) دوشنبہ کو انتقال کیا۔

آپ کو حاجی صاحب کی طرف انجذاب ہوا اور آپ نے ان کی خدمت میں خط لکھ کر ان سے بیعت عثمانی کی درخواست کی، حاجی صاحب نے یہ درخواست نہ صرف قبول کی بلکہ ایک ایسا خط تحریر فرمایا کہ جس کے لفظ لفظ سے شفقت و محبت و یگانگت و تعلق کا اظہار ہوتا ہے، آپ نے جس وقت حاجی صاحب کو خط لکھا تھا اس وقت آپ کی عمر ۱۹؍ سال کی تھی، حاجی صاحب نے ۱۵؍ ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ ۲۵؍ جولائی ۱۸۸۸ء کو مکہ معظمہ سے یہ والا نامہ تحریر فرمایا ہے، جو یہاں من وعن درج کیا جاتا ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

(از فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ)

بخدمت سراپا برکت مولوی ابوالبرکات محمد عبدالحی صاحب حسنی الحسینی نور اللہ قلبہ بنور معرفتہ ومحبتہ، بعد سلام مسنون و دعائے ترقی درجات عالیات، مشہود ضمیر منیر باد مکتوب محبت وارادت ورود ہوا، ممنون و مشکور ہوا اور آپ صاحبوں کی خیریت معلوم ہونے سے مسرور ہوا، آپ نے جو استدعا بیعت عثمانی بسلسلۂ علیہ صابریہ وسلسلۂ نقشبندیہ احمدیہ کی ہے، یہ آپ کا ظن خیر ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم، باقی جن میرے دوستوں اور محبوں کو فائدہ ہوا ہے، وہ بسبب ان کے حسنِ عقیدت وارادت کے، کیونکہ اللہ جل جلالہ کی سنت یوں جاری ہے کہ جیسا بندہ اس کے ساتھ گمان وظن رکھے ویسا ہی حضرت حق اپنی رحمت وعنایت مبذول حال اس کے کرے گا، علاوہ اس کے اب میری طبیعت اس امر عظیم سے بہت گھبراتی ہے، بہر کیف میرے پاس تو کچھ نہیں ہے، آپ کے حسن ظن

و نیک عقیدت و ارادت کے موافق اللہ تعالیٰ عم نوالہ کے فضل و کرم کی امید و بھروسہ پر آپ کو دونوں طریقے یعنی سلسلۂ علیہ چشتیہ صابریہ و سلسلۂ علیہ نقشبندیہ احمدیہ، میں بیعتِ عثمانی کر کے جو کچھ فقیر کے رسالہ ''ضیاء القلوب'' اور رسالہ ''ارشاد مرشد'' میں ہے، اس کی اجازت بخشی کہ جو کوئی اہل و لائق اس کا ہو اس کو بھی اس کی تعلیم و اجازت دیجئے اور خود بھی جو کچھ مناسب حال اپنے سمجھئے عامل ہو جیئے، اللہ تعالیٰ آپ کو حسن عقیدت میں مثمر برکات و فیوض کرے، و درجات عالیات و قرب و مراتب عنایت فرماوے آمین بجاہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ و صحبہ و سلم۔

بسبب کبر سنی کے ضعف جسمانی و ضعف بصارت بہت ہو گیا ہے، اس لئے اپنے ہاتھ سے لکھنے پڑھنے میں مجبوری ہے، اور اگر ضرورتاً کبھی کچھ لکھتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے، اس لئے میں اپنے دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے جواب نہ لکھنے پر یا خط و کتابت نہ کرنے پر معاف فرماویں، و دعا حسن الخاتمہ کی فرماویں۔

رسالہ ''ارشاد مرشد'' ارسال خدمت ہے، ''ضیاء القلوب'' کے نسخے تقسیم ہو گئے، مقام دیوبند وغیرہ میں تلاش کرنے سے ملے گا اور شجرہ عزیزم مولوی صاحب یہاں سے لے گئے ہیں، آپ کو اجازت ہے آپ اس سے نقل کر لیجئے، آپ کی ہمشیرہ مرحومہ و والدہ ماجدہ مغفورہ کے انتقال کا حال معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ دونوں

کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، وغریق مغفرت وعنایت کرے، زیادہ والسلام علیکم، اللہ تعالیٰ اپنی محبت وقرب عطا فرمائے۔

بخدمت مکرمی مولوی سید ابوالقاسم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اللہ تعالیٰ اپنی رضا وعشق عنایت فرما کر اپنے مقربین میں داخل کرے، آپ نے جو دس روپے واسطے خیرات مساکین یہاں ارسال فرمائے تھے، پہنچے اور ان کو مستحقین (کے حوالہ) کر دیا گیا، والسلام فقط

رقیمۂ دعا، فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ

از مقام مقدس مکہ معظّمہ، مرقومہ ۲۵ رذیقعدہ ۱۳۰۵ھ(۱) قدسی

(نشان مہر) | محمد امداد اللہ فاروقی |

گنج مرادآباد حاضری اور حضرت مولانا فضل رحمٰن سے بیعت

اس وقت اضلاع مشرقی بالخصوص اودھ کی دینی مجلسیں اور علمی اور درسی حلقے اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے کمالات وکرامات، توجہ وتاثیر، عشق ومحبت اور اتباع سنت کے تذکروں اور چرچوں سے معمور ومخمور رہتے تھے، فرنگی محل کے علماء کے شاگرد اور علمائے فرنگی محل مع فخر المتأخرین مولانا عبدالحی صاحب، گنج مرادآباد حاضر ہو کر مولانا کے الطاف خصوصی سے محظوظ ہو چکے تھے، اور حضرت مولانا کی مجلسوں میں ان کا ہمیشہ اعتراف واحترام کے ساتھ ذکر ہوتا تھا، اس زمانہ میں سب

---

(۱) مطابق ۴ راگست ۱۸۸۸ء

لوگ پروانہ وار گنج مرادآباد کا رخ کرتے تھے، جن کے اندر خدا طلبی کے ساتھ اتباع سنت کا اہتمام پایا جاتا تھا، اور ایک جامع شریعت وطریقت شیخ کی تلاش میں رہتے تھے، ان ہی خصوصیات کی بنا پر مولانا سید عبدالحی صاحب کو بھی حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا شوق ہوا اور آپ اپنی طالب علمی ہی کے دور میں تین مرتبہ وہاں حاضر ہوئے، پہلی حاضری ماہ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ میں ہوئی، دوسری حاضری ۱۷ر جمادی الآخرۃ ۱۳۰۶ھ کو ہوئی، اس حاضری کے موقع پر مولانا نے آپ کو بلاطلب ودرخواست بیعت کرلیا، اور سلسلہ میں داخل فرمالیا، اور نہایت الطاف فرمائے، قلمی یادداشت میں، جو غالباً مراجعت کے بعد ہی لکھی گئی ہے، حسب ذیل الفاظ ہیں:

> ''بار دوم بتاریخ ۱۷ر جمادی الآخرۃ ۱۳۰۶ھ روز دوشنبہ وقت عصر شرف اندوز ملازمت گشتہ بہ تجدید بیعت، (۱) واجازت حصن حصین وباقی کتب حدیث برائے درس وتدریس بہرہ مند شدم، وروز دویم بشرکت صاحبزادہ احمد میاں صاحب بسماعت جزو سادس وعشرون وبعض سابع وعشرون از جامع صحیح امام بخاری ؒ مشرف شدہ، وسعادت مگس رانی آنحضرت وقت حدیث خوانی شرف امتیاز یافتم۔''
>
> (دوسری بار ۱۷ر جمادی الآخرۃ ۱۳۰۶ھ دوشنبہ کے دن، عصر کے وقت قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی، تجدید بیعت کا شرف

(۱) تجدید بیعت کا لفظ شاید اس لئے استعمال کیا گیا کہ اس سے پہلے اپنے خاندان میں اور حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو چکی تھی۔

حاصل ہوا، حصن حصین اور بقیہ کتب حدیث کے درس وتدریس
کی اجازت سے مشرف ہوا، اگلے روز صاحبزادہ احمد میاں
صاحب کی شرکت میں بخاری شریف کے چھبیسویں پارہ کی مکمل
اور ستائیسویں کے کچھ حصہ کی سماعت کی عزت حاصل ہوئی،
قرأت حدیث کے وقت پاس بیٹھ کر چنور ہلانے کی سعادت اور
خصوصیت سے بھی سرفراز کیا گیا۔)

تیسری حاضری دوسال کے بعد ماہ صفر ۱۳۰۸ھ میں عصر کے وقت ہوئی، اس موقعہ پر حدیث مسلسل بالاولیہ اور حدیث مسلسل بالمحبۃ کی (جس کی اجازت مولانا کو براہ راست حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حاصل تھی) اجازت حاصل ہوئی۔(۱)

خوش قسمتی سے ان تینوں سفروں کی مفصل روداد خود مولانا کے قلم سے لکھی ہوئی مل گئی، جو آپ نے اپنے مخلص دوست اور کرم فرما نواب سید نورالحسن خاں صاحب کی فرمائش پر بعد میں قلمبند فرمائی تھی اور ''استفادہ'' کے نام سے نواب صاحب کے ''مجموعہ رسائلِ تصوف'' اور علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوئی،(۲) یہاں اس حاضری کی روداد اور ان سفروں کے مشاہدات وتأثرات اور حضرت مولانا کے ارشادات وافادات، جو نہایت سادہ لیکن پراثر اور دلپذیر انداز میں لکھے گئے ہیں، بجنسہ نقل کئے جاتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

''مجھ کو حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا بچپن سے

(۱) ماخوذ از یادداشت فارسی، قلمی نسخہ۔

(۲) راقم کی کتاب ''تذکرہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی'' میں بھی وہ ''جذب دل'' کے عنوان سے شامل کردی گئی ہے۔

اشتیاق تھا، مگر یہ خیال تھا کہ بعد فراغت تحصیل علم کے حاضر ہو کر استفادہ کرونگا، دفعتاً لکھنؤ میں جناب ممدوح کی خبرِ وفات مشہور ہوئی، اس وقت اپنی محرومی پر جس قدر تاسف ہوا، بیان نہیں ہوسکتا، اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے، اس کے سنتے ہی میں نے مرادآباد کا عزم کرلیا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اشتدادِ علالت کی وجہ سے آپ صاحبِ فراش ہیں، شب کو حاضری کا موقع نہیں ملا، دوسرے دن صبح کو میں حاضر ہوا، آپ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، مسترشدین کا مجمع تھا، ان میں مولوی سید ظہورالاسلام صاحب بھی تھے، میرے پہونچتے ہی انھوں نے تقریب کی اور کہا کہ یہ مولانا سید عبدالسلام کے بھانجے ہیں، حضرت نے میری طرف دونوں ہاتھ بڑھائے، میں نے دستِ مبارک میں اپنا ہاتھ دیدیا، اس وقت آپ پر کیفیت طاری تھی، آپ نے اس حالت میں جو فرمایا وہ اچھے طور پر سمجھ میں نہیں آیا، مگر یہ معلوم ہوا کہ آپ فرماتے ہیں کہ دعا، درود، نماز سے سب کچھ مل جاتا ہے، اور اسی حالت میں چند اشعار پڑھے، ان میں سے ایک شعر یہ تھا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

تھوڑی دیر تک یہ کیفیت رہی، اس کے بعد آپ نے ہاتھ چھوڑ دیا اور میں کچھ دیر وہاں رہ کر باہر آگیا۔

دوسری بار جب آستانہ بوسی کا اتفاق ہوا تو میرے ایک عزیز بھی میرے ہمراہ تھے، ہم دونوں لکھنؤ میں طالب علمی کرتے تھے، ایک دن بیٹھے بیٹھے شوق پیدا ہوا اور انھوں نے مرید ہونے کی تمنا ظاہر کی، اس ارادہ سے ہم دونوں شب کو روانہ ہوئے، لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں دیر ہے، ہم دونوں سو رہے اور ایسے سوئے کہ گاڑی آئی اور روانہ ہوگئی، ۳/ بجے شب کو معلوم ہوا کہ گاڑی روانہ ہوگئی مگر ایک دوسری ٹرین روانہ ہونے والی ہے، جو کچھوتے کے اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی، منگوتے میں ٹھہرے گی، پہلے کچھ پس وپیش ہوا پھر شوق وجذب نے اجازت نہیں دی کہ ایک دن اور ٹھہرا جائے اور منگوتے کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوگئے، وہاں پہونچ کر صبح کی نماز پڑھی اور دریافت کیا کہ کوئی سواری ملتی ہے یا نہیں، معلوم ہوا کہ نہ سواری ملتی ہے نہ مرادآباد جانے کا یہ راستہ ہے، بہت پُرس وجُو کے بعد معلوم ہوا مرادآباد یہاں سے سترہ اٹھارہ کوس ہے، یہاں سے گنج اور گنج سے ملاّواں، وہاں سے مرادآباد جاسکتے ہیں، اتنا معلوم ہوتے ہی ہم دونوں کمر ہمت باندھ کر روانہ ہوگئے، اس سے پہلے مجھ کو دو میل بھی پیادہ پا چلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر خدا جانے کیسا شوق اور کس قسم کا جذب تھا کہ جب ہم ملاواں پہنچے اور تھانہ کے سامنے سے گزرے تو اس وقت دو بج رہے تھے، اثنائے راہ میں ایک مقام پر ظہر کی نماز ادا کی، میں نے قبل نماز

کے پانی سے استنجا کیا، کلوخ لینے کی نوبت نہیں آئی، اس پر میرے ساتھی نے مجھ کو ملامت کی اور کہا کہ مولانا سے تمہاری شکایت کروں گا، اثنائے راہ میں مجھ کو خیال پیدا ہوا کہ میں حضرت سے حدیث کی سند لوں گا، پھر شوق ہوا حصن حصین کی اجازت خصوصیت کے ساتھ حضرت سے حاصل ہو، حضرت کو اعلیٰ حضرت شاہ محمد آفاقؒ سے ملی ہے، مگر اس خیال سے کہ حضرت کا مزاج مبارک نہایت نازک تھا، میرے دل میں پس وپیش ہورہا تھا کہ کیونکر اس کا موقع حاصل کیا جائے، عصر کا اول وقت تھا، جب ہم دونوں مرادآباد پہونچے، شہر کے باہر ایک پختہ کنواں تھا، اس کی جگت پر بیٹھ کر عصر کی نماز ادا کی، اس کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔

مسجد میں پہنچتے ہی خادم نے آکر کہا حضرت بلاتے ہیں، میرے رفیقِ طریق آگے اور میں ان کے پیچھے چلا، حضرت حجرہ کے سائبان میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، عادت کے موافق آپ نے فرمایا، یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ انھوں نے اس کا جواب دیا، مگر آپ مکرر سہ کرر یہی سوال فرماتے رہے، پھر پوچھا، یہ کون ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ میرے رفیق نے کہا کہ لکھنؤ سے، فرمایا کہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ رائے بریلی کے، آپ نے ڈانٹا اور فرمایا، کبھی لکھنؤ کہتے ہو کبھی رائے بریلی، میں نے عرض کیا کہ میں رائے بریلی کا رہنے والا ہوں،

لکھنؤ میں تحصیل علم کی غرض سے ٹھہرا ہوں اور وہیں سے آرہا ہوں، فرمایا کہ رائے بریلی میں کہاں رہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ تکیہ شاہ علم اللہ، یہ سن کر آپ نے عجب انداز میں کروٹ بدل کر فرمایا کہ وہ تو بڑے بزرگ تھے، فرمایا بیٹھو، ہم دونوں بیٹھ گئے، پھر مجھ سے پوچھا کہاں پڑھتے ہو اور کس سے پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں ہدایہ پڑھتا ہوں اور جناب مولوی محمد نعیم صاحب سے پڑھتا ہوں، فرمایا کہ اب فرنگی محل میں وہی اکیلے رہ گئے ہیں، فرمایا کہ جب ہم لکھنؤ میں تھے تو فرنگی محل میں اچھے اچھے لوگ تھے، اور وہ سب ہماری بہت خاطر کیا کرتے تھے، اس کے بعد آپ نے مفتی ظہور اللہ صاحب و مولوی نور الحق صاحب و مولوی ولی اللہ صاحب وغیرہ کا ذکر فرمایا اور کہا کہ اللہ برتر ان کی قبروں کو ٹھنڈا کرے، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ بیعت کرنا چاہتے ہیں، آپ نے دست مبارک پھیلا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور معمولی الفاظ بیعت کے ادا فرمائے اور یہ اشارہ کیا کہ ہر روز سو بار اسم ذات کا ذکر کر لیا کرو اور آنکھ اور زبان بند کر کے دل کی زبان سے ذکر کرو، اور ایک سو بار قل ھو اللہ پڑھ لیا کرو، اور سورۂ یٰسین بعد نماز صبح اور سورۂ واقعہ بعد نماز مغرب پڑھ لیا کرو، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ بیعت کرنا چاہتے ہیں، پھر اس پر آپ کے چہرۂ مبارک پر کسی قدر آثار تکدر ظاہر ہوئے، پھر آپ نے ہاتھ بڑھایا اور ان کو سلسلہ میں داخل فرمایا۔

میں نے عرض کیا کہ مجھ کو اس بات کی تمنا ہے کہ حدیث کی سند آپ سے حاصل ہو، آپ نے ازراہ کرم میری التماس قبول فرمائی، اور مجھ کو اجازت دی اور فرمایا کہ میں تم کو حصن حصین کی بھی اجازت دیتا ہوں، اس کے پڑھنے سے سات سو (یا اس کے قریب قریب کوئی تعداد آپ نے فرمائی) آدمی اولیاء اللہ ہوگئے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا، کہاں رہو گے مسجد میں یا مقبرہ میں، میں نے عرض کیا جہاں حکم ہو، مگر میرے ساتھی نے کہا کہ مسجد میں پڑ رہیں گے، یہ سن کر مکدر ہوئے اور فرمایا کہ ہم نے مقبرہ میں جگہ صاف کرادی ہے اور کلوخ استنجا رکھا دیئے ہیں، وہاں آرام ہوگا، پھر میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ علم کی غرض عمل ہے، اگر عمل نہ ہوا تو علم حاصل کرنا بیکار ہے، اولیاء اللہ جتنا پڑھتے تھے اس پر عمل کرتے تھے، فرمایا کہ شاہ میناؒ شرح وقایہ پڑھتے تھے، جب کتاب الزکوٰۃ تک پہونچے چھوڑ دیا، استاد نے سمجھایا تو کہا علم کی غرض عمل ہے، صوم وصلوٰۃ مجھ پر فرض ہے، اس کا حاصل کرنا بھی ضروری تھا، زکوٰۃ مجھ پر فرض نہیں جب کبھی فرض ہوگی اس کے مسائل بھی سیکھ لوں گا، اس وقت اس کا پڑھنا وقت ضائع کرنا ہے، یہاں پہنچ کر آپ پر کیفیت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور آپ نے اشعار پڑھنا شروع کئے، ان میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

سرمہ در چشم سنائی چوں سنان تیر باد
گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سخن

یہ شعر بھی آپ نے پڑھا تھا ؎

کجرا دیوں تو کر کرائے سرمہ دیا نہ جائے
جن نینن ماں پیوں بسیں دوجے کون سمائے

وہاں سے اٹھ کر ہم لوگ مسجد میں آئے، حیرت یہ ہے کہ تکانِ سفر سے کچھ بھی ماندگی نہ تھی، اس شب کو جس قدر نوافل میں نے پڑھیں اور جس ذوق وشوق سے پڑھیں، کبھی نہ پڑھیں تھیں، صبح کو جب رخصت ہونے کو گئے تو میرے ساتھی کو رخصت فرمادیا، میں جب آداب بجالایا تو فرمایا کہ ٹھہرو، وہیں مسجد میں جا کر ٹھہر گیا، چاشت کے بعد آپ مسجد تشریف لائے اور بیچ کے در میں بیٹھ گئے، حضرت احمد میاں صاحب ومولوی عبدالکریم صاحب وحکیم عظمت حسین وغیرہ بخاری شریف لے کر حاضر ہوئے، میں بھی حلقۂ درس میں شامل ہوگیا، آپ نے چھبیسویں پارے کے دو یا تین ورق پڑھے، باوجود کبرسنی کے، چشمے کی مدد کی آپ کو حاجت نہیں ہوتی، شنجرف کی روشنائی اور کلک کا قلم رکھا ہوا تھا، اس سے تصحیح فرماتے جاتے تھے، جو لطف آپ کے پڑھنے میں تھا، وہ قابل دید تھا نہ شنید، دوسروں پر انوار باطنی کا اسوقت انعکاس ہورہا تھا، اور سب پر ایک کیفیت طاری تھی، بعد ظہر کے آپ پھر برآمد ہوئے اور دو ورق سے زیادہ آپ نے پڑھے،

اس روز آپ نے بہ ہیئت مجموعی ڈیڑھ پارہ پڑھا، لوگوں سے معلوم ہوا کہ آج غیر معمولی طور پر تین بار درس دیا ہے، ورنہ معمول ایک یا دو بار کا تھا، میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔

تیسری بار جب میں حاضر ہوا تو عصر کا وقت تھا، آپ صحن سے باہر حجرہ کے محاذی تشریف رکھتے تھے، نہایت لطف و محبت سے آپ نے شرف پذیرائی عطا فرمایا اور دیر تک اپنے حالات بیان فرماتے رہے، اسی گفتگو میں آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

دل ڈھونڈھنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

سلسلۂ کلام کے ختم ہونے کے بعد میں نے عرض کیا کہ مجھ کو حدیث مسلسل سنائیے، آپ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ میں نے اپنے کانوں سے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زبان سے سنا ہے، پھر آپ نے تیمم فرمایا، ایک بار دست مبارک کو مٹی پر مار کر منہ پر پھیرا اور پہنچوں تک ہاتھ میں مل لیا، اس کے بعد آپ نے یہ حدیث پڑھی:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، "الراحمون یرحمهم الرحمٰن تبارك وتعالیٰ، ارحموا من في الأرض یرحمکم من في السماء."

پھر آپ نے فرمایا کہ میں تم کو حدیث مسلسل بالمحبۃ کی بھی اجازت دیتا ہوں اس حدیث کو میں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنا ہے:

"یا معاذ! إني أحبك فقل اللّٰهم أعنّي علی ذکرك

وشكرك وحسن عبادتك."

مولانا کو اپنے پیر ومرشد سے ہر دور میں قلبی تعلق اور تأثر رہا اور وہ ان کی محبت وعقیدت میں ڈوبے رہے، نزہۃ الخواطر کی جلد ہشتم میں، جو حضرت مولانا کی وفات کے سالہا سال بعد اور علمی وذہنی ارتقا کی آخری منزلوں میں لکھی گئی ہے، وہ حضرت مولانا کا ایسا تذکرہ کرتے ہیں، جیسے وہ ابھی ان سے بیعت ہوئے ہوں اور ان کی عقیدت ومحبت میں سرشار۔

مولانا کا حلقۂ احباب لکھنؤ میں زیادہ تر انھیں حضرات پر مشتمل تھا، جو حضرت مولانا گنج مرادآبادی سے ارادت وبیعت کا تعلق رکھتے تھے، ندوہ کے بانی، ارکان اور تقریباً اس کی مجلس کے تمام ناظم، حضرت مولانا ہی کے سلسلہ سے منسلک تھے، (۱) حضرت مولانا کے جانشین ونبیرگان بھی مولانا سے برادرانہ ومخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔

یوں عملاً حضرت حاجی صاحب سے بُعد مسافت اور حضرت مولانا سے طالب علمی کے اشتغال اور ان کا زمانہ زیادہ نہ پانے کی وجہ سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے، اس لئے منازلِ سلوک آپ نے اپنے خسر مولانا شاہ سید ضیاء النبی صاحب اور اپنے والد ماجد کی خدمت میں نیز اپنے ماموں حضرت مولانا شاہ عبدالسلام کے خلفاء، مولوی حکیم امین الدین اور جناب قدرت علی صاحب کی خدمت میں طے کئے تھے، یہ تمام حضرات نقشبندی، مجددی تھے، آپ کو حضرت شاہ ضیاء النبی اور والد ماجد مولانا

(۱) مثلاً ندوہ کے بانی وناظم اول مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہجہاں پوری، نواب علی حسن خان، ناظمین، اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، منشی احتشام علی صاحب کاکوروی، مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا سید تجمل حسین بہاری، ارکان۔

سید فخر الدین اور حکیم امین الدین گنتھوی (خلیفہ حضرت شاہ عبدالسلام صاحب) سے چاروں مشہور سلاسل میں خلافت واجازت حاصل ہوئی۔

دینی وعلمی مرکزوں کا سفر اور علماء ومشائخ سے استفادہ

یہ خیال کر کے کہ کوئی کام شروع کرنے اور مشغول ہو جانے کے بعد آپ کو ہندوستان کے ان دینی وعلمی مرکزوں کی زیارت اور وہاں کے نامور علماء ومشائخ سے استفادہ کا موقع نہ ملے گا، جن کا غلغلہ سارے ہندوستان میں بلند تھا اور آپ ابتدائے طالب علمی سے ان کا نام بڑے احترام وعقیدت کے ساتھ سنتے تھے، اس لئے تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں، جب کہ آپ کی عمر ۲۶ رسال کی تھی، آپ نے ان مشہور دینی وعلمی مرکزوں کا سفر اختیار کیا، جو زیادہ تر اطراف دہلی اور شمالی ومغربی علاقہ میں واقع تھے، یہ سفر ۱۴ ر رجب ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ ر جنوری ۱۸۹۵ء کو ہسوہ فتحپور سے شروع ہوا اور ۲۵ ر شعبان ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۱ ر فروری ۱۸۹۵ء کو ختم ہوا، آپ اس سفر میں دہلی، پانی پت، سرہند، کیمپ انبالہ، دیوبند، پیران کلیر، سہارنپور، گنگوہ، نگینہ اور اس کے متعدد قصبات میں گئے، اور مشاہیر علماء ومشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے درس میں شرکت کی، حدیث کی اجازت حاصل کی، اور علمی وباطنی استفادہ کیا۔

ان علماء ومشائخ میں مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا عبدالعلی صاحب صدر مدرس مدرسہ عبدالرب، مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی، سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی، مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی (والد مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، میاں محمد حسین

صاحب رفیق خادم حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا سید احمد حسن صاحب امروہی (تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس سفر میں ان کا معمول تھا، کہ روزانہ سفر کی یادداشت مرتب کر لیتے تھے اور علماء و بزرگوں سے سنی ہوئی باتیں انھیں کے لفظوں میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس روزنامچہ اور سفر نامہ سے ان کے ذہنی بلوغ و مراتب رجال اور علمی و دینی سلاسل سے ان کی غیر معمولی واقفیت اور تحریری و ادبی صلاحیت کا نمایاں اظہار ہوتا ہے، اور کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا لکھنے والا کوئی جواں سال اور نوعمر فارغ التحصیل ہے، یہ روزنامچہ ''ارمغانِ احباب'' کے نام سے ان کے مسودات میں محفوظ تھا، راقم سطور نے اپنی پہلی تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' میں اس کے جابجا اقتباسات پیش کئے تھے، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے جب اس کتاب پر مقدمہ لکھا تو ان کی نظر ان اقتباسات پر پڑی اور ان کو اس مسودہ کے دیکھنے کا شوق ہوا، انھوں نے اس کو از اول تا آخر پڑھا اور معارف میں بالاقساط شائع فرمایا(۱)، ذیلی عنوانات قائم کئے اور جابجا اپنے قلم سے حواشی اور تشریحی نوٹ اضافہ فرمائے، ۱۳۷۸ھ ۱۹۵۸ء میں یہ رسالہ ''دہلی اور اسکے اطراف'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوگیا، اس سفر سے ان کی معلومات اور شخصیات کے مطالعہ میں گرانقدر اضافہ ہوا، جس سے انھوں نے نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں، جو معاصرین کے تذکروں پر مشتمل ہے، پورا فائدہ اٹھایا۔

اس سفر نامہ سے ان کی جن صلاحیتوں اور خصوصیات پر نظر پڑتی ہے، ان میں سے تذکرہ کے لئے ہم صرف تین کا انتخاب کرتے ہیں، کہ ان کی سوانح و سیرت میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) معارف جنوری ۱۹۳۹ء تا جون ۱۹۳۹ء۔

ا. اسلامی حمیت اور ملّی غیرت، جو اس سفر نامہ کی سطر سطر سے ٹپکتی نظر آتی ہے، خاص طور پر جب وہ ان مقامات کا تذکرہ کرتے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ اور عہدِ عظمت واقتدار سے ہے، تو دل کا جوش، قلم کے قابو میں نہیں رہتا، اور وہ اپنے اس دل کی چوٹ اور روح کے اس کرب کو چھپا نہیں سکتے، جس وقت وہ دہلی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل جاتے ہیں:

''دہلی کو دور سے دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی، یہ شہر تقریباً پانچسو ۵۰۰/ برس تک مسلمانوں کا دارالسلطنت رہا ہے، اب انگریزی قبضہ میں ہے، صدق اللہ تعالیٰ ﴿تلك الأيام نداولها بين الناس﴾ فإنا لله وإنا إليه راجعون۔''(۱)

قلعہ معلّٰی کا اجڑا ہوا کرّ وفر اور اس کے خزاں رسیدہ بلکہ تاراج و پامال چمن کو دیکھ کر ان کا قلم آنسوؤں کا سیل رواں بہا دیتا ہے اور ان کی غیرت ملّی فوارہ کی طرح جوش مارتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''قلعہ کے اندر جانے کے متعدد دروازے اور ڈیوڑھیاں مسلسل ملتی ہیں، ان میں اب آجکل گورا بازار ہے، اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے، کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بارکیں بنی ہوئی ہیں، شاہی عمارتیں بالکل مستاصل کر دی گئی ہیں، ان کے نشانات صرف دربار عام کے ایک درجہ سے دربار خاص وحمام ومسجد ومثمّن برج سے معلوم ہوتے ہیں، جن کے دیکھنے سے ایسی عبرت ورقت ہوتی ہے، جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی،

---

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص/۱۹، ۲۰۔

سبحان اللہ! یہ مکانات ہیں، جن میں ہر کس وناکس کے پہنچنے کی مجال نہ تھی، بڑے بڑے امراء ہفت ہزاری وپنج ہزاری دربار عام تک پہونچنے کو فخر وسعادت سمجھتے تھے، وہی تخت جس کے سامنے دربار اکبری وجہانگیری میں سجدہ کرتے تھے، اور دربار شاہجہانی وعالمگیری میں اس کے پایہ کو بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے، آج ادنیٰ ادنیٰ گورا، جوتا پہنے ہوئے اس کو روندتا ہے، فاعتبروا یا أولي الأبصار، الملك لله والأرض لله یورثها من یشاء۔"

آں شاہ کہ خویش را ہلا کومی گفت — وز کبر ومنی سخن بہ ابرو می گفت
بر کنگرۂ سرائے او فاختہ — امروز نشستہ بود کو کومی گفت

ناظرین! مجھ کو معاف کیجئے گا، ان مکانوں کو دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے، کہ میں ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں، بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی (۱) کا ماہر ہے، وہ کیا ممکن ہے، کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے؟ اس کا دل بے چین نہ ہو جائے؟ اس کے بدن پر رونگٹے نہ کھڑے ہو جائیں؟ اس کی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت وہیبت نمودار نہ ہو جائے، دنیا کے فانی ...... ہونے کا پردہ نہ اٹھ جائے؟ ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ "حدیقۃ الاقالیم" میں محمد شاہی دربار کا

(۱) اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت واقتدار کا اثر کتنا عمومی اور گہرا ہوتا ہے اور حاکم قوم کی زبان، اس کی حکومت وتہذیب کو ناپسند کرنے والوں کی زبان وقلم پر بھی کس طرح اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے، کہ ایک خالص قدیم تعلیمی حلقہ اور دینی ماحول میں نشو ونما پانے والا نوجوان، کس طرح بے تکلف اس کے الفاظ کو اپنی تحریر میں لا رہا ہے۔

سماں دیکھ لیجئے پھر عالم شاہی دربار کا تنزّل ملاحظہ فرمایئے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کرّوفرِشہنشاہی کے آثار دیکھئے، اللّٰہ اللّٰہ ولا موجود إلا اللّٰه.

از نقش ونگار درو دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

اب نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری، یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں باقی ہیں، جو زبانِ حال سے مسلمانوں کے اقبال وادبار، ترقی وتنزل کا بیان کر رہی ہیں، بڑا سنگدل ہے وہ شخص، جو ان کو دیکھ کر نہ رُو اٹھے، بڑا قاسی القلب ہے وہ مرد، جو ان کو دیکھ کر متأثر نہ ہو، بڑا بے حمیت ہے وہ مسلمان، جو مسلمانوں کے اقبال وادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو۔

خليلي هل هاتان دارة جلجل
ودارة سلمیٰ في قفاف عقنقل

کیا یہ وہی دربارِ خاص ہے، جس میں بڑے بڑے سلاطینِ ہند، علیٰ قدر مراتب کھڑے ہونے کو فخر سمجھتے تھے؟ کیا یہ وہی تخت ہے؟ جس کے سامنے بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو اپنا دین وایمان جانتے تھے؟ یہ سب کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے اور زائل تمام کائنات، اور باقی ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی موت وحیات ہے، جس کی قدرت اور بقا

پر عالم کے نشیب وفراز، گرم وسرد، تلخ وشیریں تغیرات وحوادث
بآوازِ بلند گواہی دے رہے ہیں، کل شیئ هالك إلا و جهه."

ہر کرا بینم دریں عبرت سرائے
بہر مردن زندگانی می کند (۱) (نظامی)

جامع مسجد میں واعظوں کے دنگل اور اپنے فرقہ کے سوا ہر فرقہ کو گمراہ وباطل ثابت کرنے اور کہیں احناف کا خاکہ اڑانے اور کہیں اہل حدیث پر طعن وتشنیع سن کر ان کے دردمند دل اور غیور طبیعت پر سخت اثر ہوتا ہے اور یہ الفاظ ان کی زبانِ قلم سے نکل جاتے ہیں:

"الغرض ایک ہڑبونگ تھا، اس ہڑدنگے پن کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں، جب سلطنتِ اسلام جاتی رہی تو جس کا جو جی چاہے کہے اور کرے۔" (۲)

پھر وہ جب دہلی پر الوداعی نظر ڈالتے ہیں، تو صبر وقرار کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور ان کا دردمند دل اور رواں قلم دل کھول کر روتا ہے، اس وقت ان کا زورِ قلم اور جوشِ تحریر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اے دلی! ہم تجھ سے رخصت ہوتے ہیں، اے مرقعۂ عبرت، اے تازیانۂ غیرت، اے افسانۂ حسرت، اے آئینۂ حیرت، اے مسلمانوں کی گزشتہ اقبال مندیوں کے نمونے، اے لق ودق صحراء، اے مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوئے میدان، اے درحقیقت مسلمانوں کی خاکِ پاک، تیرا وہ پرانا جاہ

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص ۴۴، ۴۵۔ (۲) دہلی اور اس کے اطراف ص ۶۹۔

وجلال کہاں؟ وہ لوگ کہاں؟ جو تیری زیب وزینت کے باعث تھے، جو تیرے آسمانوں کے ستارے تھے، تیرے وہ دلاور کہاں ہیں؟ جو راجپوت اور راٹھور بہادروں کی صفیں درہم برہم کر دیتے تھے، تیرے وہ بزرگانِ دین کہاں ہیں؟ جن سے روحانیت اور ملائکہ مصافحہ کرتے تھے، وہ اہلِ کمال کہاں ہیں؟ جن سے استفادہ کرنے کے لئے سارے جہاں سے لوگ آتے تھے، ہائے دلی، ہائے مردہ قوم کی یادگار، دلی! تو ہی ہے جس میں قطب الدین ایبک کا تہوّر، شمس الدین التمش کی اولوالعزمی، غیاث الدین بلبن کی تدبیر، مسلمانوں کے ظفر واقبال کا نمونہ تھی، تو وہی دلی ہے، جس کے خلجی و تغلق فرمانرواؤں کی سطوت تمام عالم میں ضرب المثل تھی، تو وہی دلی ہے جس کے لعل وگوہر دربارِ اکبری کے زیب وزینت تھے، اے خاکِ پاک دلی! تجھ میں سیکڑوں خانقاہیں اور مدرسے تھے، ان بزرگوں کو تو ہی نے اپنے آغوش میں پالا تھا، جن کی جوتیوں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے، ہائے دلی، یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے، قوم کا مرثیہ ہے، اے ہماری شامت اعمال کی برباد شدہ دلی! کیا پھر ہم تیرا پچھلا جاہ وجلال دیکھ سکتے ہیں؟ ہم میں وہ فاروقی جلادت، خالدی جرأت، قومی اتفاق، اسلامی جوش، انسانی ہمدردی اب کہاں آسکتی ہے؟ ؎

افسوس کہ گل رخان کفن پوش شدند   وز خاطر یک دگر فراموش شدند

آنانکہ بصد ناز سخن می گفتند   آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

ان میں تہوّر تھا، ہم میں جبن ہے، ان میں جرأت تھی، ہم میں نامردی ہے، ان میں قومی اتفاق تھا، ہم میں نفاق ہے، وہ پر جوش تھے، ہم خاموش، ان میں انسانی ہمدردی تھی، ہم میں بے دردی، وہ دین و دنیا کو توام سمجھتے تھے، ہم برہم، وہ غیور تھے، ہم بے غیرت، ان میں فخر نہ تھا، ہم میں کبر ہے۔ ؎

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بت سے برہمن بگڑا(۱)

۲. دوسری خصوصیت ان کا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات اور ان کے رفقاء و منتسبین سے گہرا روحانی و قلبی تعلق اور شیفتگی ہے جو اس پورے سفر سے عیاں ہے، اور جو ان کے تذکرہ کے ہر موقع پر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

شاہ صاحبؒ کے خاندان کے مقبرہ (مہندیوں) کی زیارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیل خانہ کی پشت پر مہندیاں ہیں، یکہ کو سڑک پر چھوڑ کر پیادہ پا وہاں گئے، ایک مسجد ہے اور مسجد کے احاطہ میں اور اس کے باہر قبرستان ہے، پہلے عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد مزاروں کی تفتیش کی، کوئی شخص مجاور کی قسم سے یہاں نہ تھا، جس سے معلوم ہوتا، اکثر مزاروں پر لوح نہ تھی، اور جن پر تھی وہ قریب العہد معلوم

---

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص ۷۶/۷۷/۷۸۔

ہوتی تھی، مسجد کے داہنے جانب مزارات پرانے معلوم ہوتے تھے، ان پر گمان ہوا کہ شاید یہ ہوں، لیکن کوئی وجہ قاطع نہ تھی اور طبیعت بھی پیچھے کو ہٹتی تھی، میں نے دل میں خیال کیا کہ جو ارتباط مجھ سے اور ان بزرگوں سے ہے، وہ خود راہبری کرے گا، اسی فکر میں وہاں سے مایوس ہو کر لوٹا اور سخت خلجان تھا، کہ جس واسطے آیا وہ بات نہ حاصل ہوئی جیسے ہی منہ پھیرا، مسجد کے بائیں طرف دو تین مزاروں پر کچھ تحریر نظر آئی، دیکھا تو شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ لکھا تھا، ان مزاروں پر پہنچ کر فاتحہ پڑھا۔" (۱)

مدرسہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میاں سید نذیر حسین صاحب کے یہاں آنے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا و مولی الکل، مقتدائے ارباب تمیز، شاہ عبدالعزیز صاحب کی روح اللہ روحہ کے مدرسہ کی زیارت کروں، جس میں ہمارے بزرگوں نے یکے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے اور جس کی خاکروبی کو فخر وسعادت سمجھا ہے، حضرت شاہ محمد واضح قدس سرہ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے وقت میں تشریف لائے، ان کے بعد شاہ ابوسعید صاحب، مولوی نعمان صاحب، حضرت محمد معین صاحب، یکے بعد دیگرے آئے، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کے وقت میں حضرت مولانا شاہ قطب الہدیٰ صاحب تشریف لائے، ان کے بعد مولانا سید محمد اسحاق صاحب، ان

---

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص ۳۴۔

کے بعد حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس اللہ اسرارہم آئے اور
فائدہ حاصل کیا، جس کو تمام عالم جانتا ہے۔

یہاں سے جامع مسجد اور اس کے آگے چتلی قبر تک گیا،
چتلی قبر سے دو راستے ہیں، ایک داہنے ہاتھ کو، وہ سیدھا خانقاہ کو
گیا ہے، دوسرا بائیں ہاتھ کو، اس راستہ پر بہت دور تک چلا گیا،
آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کو کوچہ فولاد خاں کو سڑک گئی ہے، وہ
سیدھی کلاں محل تک چلی گئی ہے، کلاں محل میں ہمارے شیخ
المشائخ مولانا ومقتدانا کا مدرسہ ہے، اس کی حالت کو دیکھ کر
"خاوية على عروشها أنىٰ يحيي هذه الله بعد موتها" کی
آیت یاد آئی، اللہ اللہ کیا کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، ایک
وہ دن تھا کہ عرب وعجم کے لوگ اس مدرسہ میں رہتے تھے اور
فائدہ حاصل کرتے تھے اور آج اس کی یہ حالت ہے کہ ویران
وخراب پڑا ہے، کوئی رہنے والا نہیں۔" (۱)

اسی طرح سے حضرت سید صاحب اور ان کے رفقاء اور منتسبین کا تذکرہ ہر جگہ نہایت والہانہ اور عاشقانہ انداز میں کرتے ہیں اور بالعموم "حضرت سیدنا روحی فداہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، انھوں نے حضرت سید صاحب اور ان کے رفقاء کے جو واقعات، بزرگانِ دیوبند وگنگوہ یا علمائے دہلی سے سنے، ان کو من وعن نقل کرنے کی کوشش کی ہے، پھر جب ان کو سہارنپور میں یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب کے ایک خادم اور مجاز میاں محمد حسین صاحب بگھرا ضلع مظفر نگر میں اب تک بقید حیات ہیں، تو وہ ان

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص ۶۳، ۶۴۔

کی ملاقات کے لئے بے چین ہو گئے اور ان کی زیارت کے لئے نگینہ اور جب معلوم ہوا کہ وہاں نہیں ہیں تو دارانگر اور وہاں سے نگلہ گئے، نگینہ سے بجنور تک شکرم پر پندرہ کوس اور بجنور سے دارانگر تک یکہ پر گئے، پھر جب معلوم ہوا کہ وہ دارانگر میں بھی نہیں ہیں تو تین کوس پیادہ پا چل کر نگلہ پہنچے، جب میاں محمد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان کی ساری تکان اور تکلیف کا احساس جاتا رہا، اس موقع پر وہ لکھتے ہیں:

> ''تحیۂ مسنونہ کے بعد میں نے ان ہاتھوں سے مصافحہ کیا جس نے بلاواسطہ ہمارے حضرت امیر المؤمنین سیدنا روّح اللہ روحہ کے ہاتھوں سے مصافحہ کیا تھا۔'' (۱)

۳. تیسری خصوصیت ان کا دینی ذوق، باطنی ادراک اور انابت وللّٰہیت کی وہ کیفیت ہے، جو شباب ونوجوانی کے اس عہد میں ان ہی خوش قسمت افراد میں ہوتی ہے، جن کی خاکستر میں عشقِ الٰہی کی چنگاریاں دبی ہوتی ہیں، اہلِ دل اور اصحابِ باطن کی ملاقات ومحبت سے یہ چنگاریاں مشتعل ہو جاتی ہیں، اور بعض وقت ندامت کے آنسوؤں کی شکل میں اور بعض وقت دل کی آنچوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔

اس عہد کے مسلّم قوی النسبت اور صاحب عشق بزرگ سائیں توکل شاہ نقشبندی مجددی (۲) کی مجلس میں ان پر جو اثر ہوا، اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''ان کے اوضاع وطریقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت وارستہ مزاج،

---

(۱) دہلی اور اسکے اطراف ص/۱۵۹۔

(۲) سائیں توکل شاہ اپنے زمانہ کے بڑے قوی النسبت نقشبندی بزرگ تھے، جذب واستغراق غالب رہتا تھا، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری جو خود اپنے زمانہ کے ایک بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کی قوت نسبت وعلوئے شان کا بہت ذکر فرماتے تھے، غالباً حضرت خواجہ قادر بخشؒ سے اجازت وخلافت تھی، جن کا مزار ہوشیار پور کے قریب کوٹ عبدالخالق میں ہے، سائیں صاحب کی وفات ۱۳۱۳ھ کے قریب ہے۔

عالی حوصلہ، باہمہ وبے ہمہ صاحب نسبت ہیں، جب تک میں بیٹھا
رہا میری حالت بہت متغیر رہی، ان کے مزاج میں جذب وسلوک
ہے، ازخود رفتگی وخود فراموشی بڑھی ہوئی ہے، وہاں کے لوگوں سے
معلوم ہوا کہ مرتاض زیادہ ہیں، گوکہ ادراک نسبت کے واسطے چشم
بصیرت درکار ہے، لیکن اس کور باطن کے نزدیک نسبت قویہ رکھتے
ہیں، اور مشائخ کے رسوم ظاہری کے متقید نہیں ہیں، مجھ کو جو بات
ان کی بہت پسند آئی وہ ازخود رفتگی ہے۔ ؎

اے مرغِ سحر عشق زپروانہ بیاموز　　کاں سوختہ راجاں شد وآواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند　　کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد(۱)

پھر جب وہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انکی انابت اور قلبی صلاحیت اپنا پورا رنگ دکھاتی ہے، اوران کے اندر ندامت واصلاح کا ولولہ پورے جوش کے ساتھ اٹھتا ہے اوران کے قلم سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا
وجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع واستقامت کا دوسرا شیخ
ان کے سوا اس زمانہ عالمِ آشوب میں نظر نہیں آیا، علم الٰہی میں جو
کوئی ہو اس کی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب
سے بڑا وصف تورع ہے، جو تمام اوصاف کو شامل ہے، کف
لسان و صدق گفتار میں مولوی صاحب ضرب المثل ہیں،
اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے صدقہ میں اس روسیاہ کے حال پر رحم

(۱) دہلی اوراس کے اطراف ص ر ۹۳۔

فرمائے، اس کے دل کی تاریکی دور ہو، اور کسی قدر چاشنی احسان کی عطا فرمائی جائے۔

الٰهی عبدك العاصی أتاكا

مقرًا بالذنوب وقد دعاكا

﴿ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين.﴾

شاہا ز کرم برمنِ درویش نگر　　برحال من خستہ ودل ریش نگر

ہر چند نیم لائق بخشائش تو　　برمن منگر بر کرم خویش نگر

بعد نماز کے حضرت مولوی صاحب کے کمرہ میں گیا، وہ اندر تھے، کچھ لوگ باہر تھے، یہ روسیاہ باہر ہی بیٹھ گیا، اور اپنی شامتِ اعمال اور خبثِ باطنی کے انجام کی فکر کرنے لگا، افسوس صد ہزار افسوس! عمر طبعی کا ایک ربع اس بطالت اور بیہودگی میں گزارا، باوجود مسلمانوں کے بدنام کرنے کے اب تک ایمان خالص اور اسلام کامل کا ایک حصہ بھی نصیب نہیں ہوا، بوالہوسی حد سے زیادہ ہے، اور کچھ کام نہیں ہوسکتا، حب جاہ اور پراگندگی باطن ہر وقت مسلط رہتی ہے، دیکھئے انجام کیا ہو　ع

سالیکہ نکوست از بہارش پیدا ست

جس کی ابتدا بگڑ گئی ہو اس کے انجام کا خدا حافظ ہے، یہ بھی ایک شامت ہے کہ ان بزرگوں کی خدمت میں پہونچ کر اپنی بے استعدادی کی وجہ سے فیض سے محروم رہے۔　ع

زمین شور سنبل بر نیارد

جب قلب میں صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا تاثیر ہو سکتی ہے، یہ بھی ایک شامت ہے کہ ان بزرگوں کی خدمت میں پہونچ کر پھر صحبت سے محروم رہ جائے، اے اللہ، اے ہادی، اے مرشد! تو ہی اس بے بہرہ کی دستگیری فرما، اللّٰھم لا مانع لما أعطیت، ولا معطی لما منعت، ولا رادّ لما قضیت، استغفر اللّٰہ ربي من کل ذنب وأتوب إلیہ۔"(۱)

بہر حال یہ چھوٹی سی کتاب، جو بادامی کاغذ کے ایک بیاض کی شکل میں ان کے مسودات اور پرانے کاغذات کے ڈھیر میں دبی پڑی تھی، اور جس کی اشاعت کی نوبت ان کے انتقال کے تیس پینتیس سال بعد آئی، ان کی قلبی و قلمی صلاحیتوں کا بہترین آئینہ ہے اور نوعمری کے اس تحریری نقش میں وہ سب آب و رنگ موجود ہے، جس نے ترقی کر کے ان کو ایک عظیم مصنف، جلیل القدر مؤرخ اور بڑی تعلیمی و اصلاحی تحریک کا علمبردار و ذمہ دار بنا دیا، اور اسی بنا پر یہاں اس کے نمونے اور اقتباسات پیش کرنے میں وسعت و فراخی سے کام لیا گیا ہے کہ وہ ان کی ترقی پذیر شخصیت و سیرت کی صحیح نشان دہی کرتے ہیں۔

❑❑❑

(۱) دہلی اور اس کے اطراف ص ر ۱۳۷، ۱۳۸۔

باب چہارم

اصلاحی و عملی سرگرمیاں، ندوۃ العلماء کی تحریک سے دلچسپی و ہمدردی، عملی معاونت و شرکت، مولانا محمد علی کے معتمد خاص اور مددگار ناظم

انجمن آل ہاشم کا قیام

مولانا سید عبدالحی صاحب نے خلقتاً ایک دردمند اور حسّاس طبیعت پائی تھی، جس ماحول میں ان کا نشوونما ہوا تھا، اس میں ابھی تک حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحِ امت اور احیائے دین کی دعوت و مساعی کے اثرات کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

اس تحریک کا اصل جوہر اور لب لباب زندگیوں کی اصلاح، انکو جادۂ شریعت پر لانے کی کوشش، "ادخلوا في السلم كافة" پر عمل اور اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی طور پر اسلام کے غلبہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد تھی، پھر انھوں نے (اخلاقی، علمی، سیاسی حیثیت سے) مسلمانوں کے تنزل و پستی کا، اس عہد میں جس کو عبوری دور کہنا چاہئے، جس طرح مشاہدہ کیا تھا، اور پھر ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) میں اپنے علمی و تاریخی دورہ میں جس طرح جابجا اس کے دلخراش نمونے دیکھے تھے، اس نے ان کی ذکی

وحساس طبیعت کو اور زیادہ بے چین بنا دیا تھا، اور تحصیل علم کے بعد حصولِ معاش کے ذرائع تلاش کرنے اور اپنی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے مقصد پر مطمئن نہیں رہے تھے، بلکہ کوئی اجتماعی واصلاحی کام شروع کرنے کے لئے بے چین تھے۔

کسی بڑے پیمانہ پر کام شروع کرنے سے پہلے، اور عام مسلمانوں کی اصلاح کو اپنا موضوع بنانے سے پیشتر، قدرتاً ان کی نظر سب سے پہلے اپنے خاندان کی طرف گئی، جو اسوۂ نبویؐ اور فرمان خداوندی "وأنذر عشيرتك الأقربين" کے مطابق، ان کی مساعی اور جدوجہد کا پہلا میدان اور اولین دائرہ عمل ہونا چاہئے تھا، اس وقت پورے مسلم معاشرہ اور پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی طرح یہ خاندانِ سادات، جس کا حصہ دینی جدوجہد اور قربانیوں میں شروع سے زیادہ سے زیادہ رہا اور دورِ آخر میں اسی کے افق سے وہ ستارۂ اصلاح وتجدید طلوع ہوا، جس کو تاریخ سید احمد شہیدؒ کے نام سے جانتی ہے، پستی اور افسردگی، زوال وتنزل اور اضمحلال کے آخری نقطہ پر تھا، اسی کے ساتھ (اس زمانہ کے شرفاء کے عام خاندانوں کی طرح) خاندانی مناقشات وتنازعات، چھوٹی چھوٹی باتوں پر مخالفت ومقاطعہ، اور بدگمانیوں اور بداندیشیوں کی بیماری، جو عام طور پر بے کاری، ایک محدود جگہ میں زندگی گزارنے، مشترک خاندانی نظام اور زمینداریوں کا خاصہ ہے، عام تھی، طبیعتوں میں امنگ، نگاہوں میں بلندی اور خیالات وعزائم میں حوصلہ مندی نہیں رہی تھی، خود مولانا سید عبدالحی صاحب کے الفاظ ہیں:

"بزرگانِ سادات! تمہارا نفاق باہمی اور فتنہ انگیزی ایسی ضرب المثل ہوگئی ہے، جس کی نسبت ایک شاعر اپنے خیالات یوں ظاہر کر رہا ہے ؎

بہر جا جمع می آیند سادات

فسادات فسادات فسادات

آہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگوں میں بجائے اس مثل کے یہ فقرہ زبان زد تھا، ''عادات السادات، سادات العادات'' (۱)

اسی طرح خاندان کی اقتصادی حالت اتنی پست ہوگئی تھی کہ بہت سے گھرانے نان جویں سے بھی محروم تھے، اسی تمہیدی مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''دنیا تمہارے واسطے کیسی تنگ ہے، تمہارا دامن گدائی کے غبار سے کس قدر آلودہ ہو رہا ہے، آہ! وہ فقیروں کی دلخراش آوازیں، وہ گداگروں کی دل شکن صدائیں، کیا تم نے کبھی نہیں سنیں کہ ''ہم اشراف ہیں، سادات ہیں، ہم پر وقت پڑا ہے، ایک ٹکڑے روٹی سے خبر لو، آہ! کسی قوم کی شرافت ایسی ذلیل قیمت پر بیچی نہیں جاتی۔'' (۲)

اسی کے ساتھ تعلیمی انحطاط بھی روز افزوں تھا اور جو خاندان اصلاحِ رسوم اور اتباعِ شریعت کا علمبردار رہ چکا ہو، وہ خود غیر اسلامی رسوم و عادات کا شکار ہو رہا تھا اور اس کی زندگی دینی و شرعی حیثیت سے عام مسلمانوں کے لئے نمونہ اور قابل تقلید نہیں رہی تھی۔

ان حقائق کی بنا پر مولانا سید عبدالحی صاحب نے صفر ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں، جب ان کی عمر ۲۷ رسال کی تھی اور انھوں نے ابھی کوئی بڑا کام کسی وسیع پیمانہ پر نہیں کیا تھا، دائرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی میں، جو حسنی قطبی سادات کا سب سے

---

(۱) روئداد انجمن آل ہاشم مطبوعہ ۱۸۹۵ء، ۱۳۱۳ھ (۲) ایضاً

بڑا مرکز تھا، ایک اصلاحی انجمن کی بنیاد ڈالی، جس کا نام سادات کے اس خاندان کی رعایت سے، جس کی اصلاح بنیادی طور پر ان کے پیش نظر تھی، ''انجمن آل ہاشم'' رکھا، اور اس کا دعوت نامہ تمام ارکانِ خاندان کے نام، جو رائے بریلی یا دوسرے خاندانی مرکزوں میں تھے، جاری کیا، اور اطلاع دی کہ ۲۳ / صفر بروز پنجشنبہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۵ / اگست ۱۸۹۵ء کو جناب مولوی سید رشید الدین صاحب مرحوم و مغفور کے بنگلہ پر ۶ / بجے شام کو جلسۂ عام ہوگا، وقت مقررہ پر یہ جلسہ ہوا اور بزرگانِ خاندان نے بڑی تعداد میں اس جلسہ میں شرکت کی، مولوی سید ابوالقاسم صاحب ہنسوی نے اس جلسہ کی صدارت کی اور وہیں انجمن کے قیام کی تجویز منظور ہوئی اور بروز جمعہ ۲۴ / صفر ۱۳۱۳ھ ۱۶ / اگست ۱۸۹۵ء کو اس کا افتتاحی جلسہ ہوا، اس انجمن کی جو مطبوعہ روئداد ہمارے سامنے ہے اور جس کا اب صرف ایک ہی نسخہ مولانا مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ رہ گیا ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶ / حضرات نے، جو سب کے سب خاندان کے سربرآوردہ افراد تھے، اس کی رکنیت قبول کی، اور ۱۵ / ایسے حضرات رکن منتخب ہوئے، جن کا ضلع رائے بریلی اور فتحپور کے مختلف خاندانوں اور شرفاء و عمائد کے طبقہ سے تعلق تھا، یہ غالباً اس لئے تا کہ اس انجمن کی بنیاد خاندانی عصبیت اور جاہلی تفاخر و حمیت پر نہ ہو اور وہ عملاً مسلمانوں کی ایک مشترک مجلس رہے۔

اس انجمن کا ہر تین مہینہ پر ایک اجلاس ہونا قرار پایا، چنانچہ ۶ / جمادی الاولی ۱۳۱۳ھ (۲۷ / اکتوبر ۱۸۹۵ء) کو ڈھائی بجے دن، مولوی سید رشید الدین صاحب مرحوم کے دیوان خانہ پر انجمن کا جلسہ شروع ہوا، بانیٔ انجمن کے بڑے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید خلیل الدین احمد صاحب (۱) رئیس و آنریری مجسٹریٹ نے اس کی

---

(۱) آپ مولوی سید رشید الدین صاحب کے صاحبزادہ اور مولوی سید سعید الدین صاحب کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صدارت کی، اس موقع پر سکریٹری انجمن مولانا سید عبدالحی صاحب نے سہ ماہی رپورٹ پیش کی اور انجمن کے مقاصد بیان کئے، اسی جلسہ میں ایک دارالمطالعہ کے قیام کا فیصلہ ہوا، اس جلسہ میں پہلی جو تجویز منظور ہوئی اور جو خود مولانا سید عبدالحی صاحب نے پیش کی تھی، وہ ندوۃ العلماء کی شرکت وحمایت کی تجویز تھی، جو دو ہی برس پہلے قائم ہوا تھا، گویا اس انجمن کی ابتدا اس تحریک کی تائید سے ہوئی جس میں درحقیقت خود اس مجلس کو مدغم ہوجانا اور اس کے بانی کو اس کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کردینا اور اپنی بقیہ عمر کو اس کی ترقی وتوسیع میں صرف کرنا تقدیر الٰہی میں مقدر ہوچکا تھا۔

دوسری تجویز، جو خود ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد کا ایک جزو ہے، حسب ذیل تھی:

''اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ مقدموں کو حتیٰ المقدور باہم طے کرنا چاہئے اور اگر فریقین کی نارضامندی سے عدالت تک نوبت پہنچے تو اس کی وجہ سے فریقین کو مواخات نہ ترک کرنی چاہئے۔''

یہ تجویز جو خود مولانا سید عبدالحی صاحب نے پیش کی تھی، ان کے قلبی تأثر اور اس زمانہ کی صورت حال کی عکاسی کرتی ہے۔

تیسری تجویز میں انجمن اسلامیہ رائے بریلی کے سکریٹری سے درخواست کی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) پوتے تھے، رجب ۱۲۷۲ھ مطابق مارچ ۱۸۵۶ء میں ولادت ہوئی، اس زمانہ کے شرفاء کے دستور کے مطابق، فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم پائی، اخیر دور میں ان کو خاندان میں جو وجاہت حاصل ہوئی وہ کم لوگوں کو حاصل ہوئی، ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء کے سفر اور دینی مراکز کے دورہ میں وہ مولانا سید عبدالحی صاحب کے ہمسفر تھے، اسی لئے سفر میں انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت کی، عقائد اور خاندانی مسلک میں بہت سخت تھے، شعبان ۱۳۵۱ھ (نومبر ۱۹۳۲ء) میں انتقال کیا۔

گئی تھی، کہ وہ مدرسہ اسلامیہ (۱) کے سنبھالنے کی از سر نو کوشش کریں۔

پہلی تجویز (تائید ندوۃ العلماء) کو پیش کرتے وقت مولانا سید عبدالحی صاحب نے جو تقریر کی وہ یہاں نقل کی جاتی ہے کہ اس میں ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد اور اس کے ابتدائی خاکے کی پوری تصویر نظر آتی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پیش کرنے والے کا ذہن ندوۃ العلماء کی روح اور اس کے مقاصد سے کس درجہ ہم آہنگی رکھتا ہے، اور کس طرح اس نے (غیر شعوری طور پر) اس منزل کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیئے ہیں، جس کا راہرو اور رہبر بننا اس کی قسمت میں مقدر ہو چکا تھا، اس تقریر میں جو انھیں کے لفظوں میں پیش کی جاتی ہے، ان کا فکر و مطالعہ اور ان کے احساسات و تأثرات واضح طریقہ پر سامنے آجاتے ہیں، اور اس میں اور بانیانِ ندوۃ العلماء کے مضامین و خطبات میں وہ مماثلت پائی جاتی ہے، جو اس شعر کی مصداق ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مولانا نے فرمایا:

"آج کل علی العموم مسلمانوں کی حالت جو تنزل اور ادبار کی انتہا درجہ پر پہنچ گئی ہے، اس کے چند سبب سمجھے جاتے ہیں، اولاً نفاقِ باہمی، دوسرے علماء کی کم توجہی اور در حقیقت عقل سلیم بھی اسی کو مقتضی ہے، ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے جس کو ہم فی

(۱) یہ وہی انجمن اسلامیہ ہے جو آنریبل سید محمود نے اپنے زمانۂ قیام رائے بریلی میں قائم کی تھی اور جس کے قائم کردہ مدرسہ کا افتتاح کرنے لئے سر سید احمد خاں مرحوم علی گڑھ سے تشریف لائے تھے۔

زمانہ دیکھ رہے ہیں، لیکن علماء کی کم توجہی کا سب سے بڑا سبب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہیں، انھیں نقائص کو دفع کرنے کی غرض سے روشن خیال اور پاکیزہ نفس بزرگوں نے ''ندوۃ العلماء'' خاص علمائے کرام کی سرپرستی سے ایک انجمن قائم کی ہے، جس کا پہلا سالانہ اجلاس کانپور اور دوسرا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہو چکا ہے، غالبًا آپ لوگوں نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا، اور جس نے سنا ہے، یقیناً اس کے مقاصد سے ضرور متفق ہوگا۔

لیکن میں نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کو ظاہر کرتا ہوں کہ باوجود قربِ مسافت کے کانپور کے اجلاس میں صرف ایک یا دو بزرگوار تمام قسمت رائے بریلی میں سے شریک تھے اور لکھنؤ کے اجلاس میں شاید دو چار زیادہ ہوں، تاہم حیرت خیز ہے یہ بات، کہ اس میں ایک کا بھی نام اس کے ارکان کی فہرست میں نہیں نظر آتا، چونکہ مجھ کو دونوں مرتبہ اس میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تھا، اس واسطے اس بات کا مجھ کو موقع اچھے طور پر حاصل ہوا تھا کہ میں اس کا لحاظ کر کے اپنے ارباب وطن کی پست ہمتی پر از حد افسوس کروں۔

صاحبو! ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی عزت قائم تھی، انھیں کی حکومت تھی، انھیں کا علم و ہنر تھا، تہذیب وتمدن کے خزانے انھیں کے قبضہ میں تھے، تجارت وزراعت کے بھی

مالک تھے، قصہ مختصر دین ودنیا میں ان کا بول بالا تھا، دین تھا تو ان کا، دنیا تھی تو ان کی، مگر جب سے تنزل کے میدان میں انھوں نے قدم رکھا ہے، چاروں طرف سے ادبار نے گھیر لیا ہے، ساری کمائی لٹ گئی، دنیا میں صرف ان کا نام ہی نام رہ گیا، اور ان کے گھر کی دولت پر غیر قومیں قابض ہو گئیں، علماء گوشہ نشین ہو گئے، غربا بھیک مانگنے لگے، یہاں تک کہ غیر قوموں کو بھی انکی ابتری پر ترس آنے لگا، ایسی حالت میں کیونکر امید کی جاسکتی ہے، کہ قوم کا خزاں رسیدہ باغ سرسبز وشاداب ہو کر لہلہانے لگے، بجز اس کے کہ قومی جوش از سرِ نو پیدا ہو اور ہر ہر فرد پست ہمتی اور دنائت کو چھوڑ کر اولوالعزمی اور حوصلہ مندی پر صبر واستقلال کے ساتھ آمادہ ہو جائے۔

اس کے واسطے ہندوستان کے مختلف حصوں میں صدہا انجمنیں قائم ہوئیں اور انھوں نے حتی الامکان اصلاح کی مناسب فکریں کیں، سب سے بڑھ کر عالی خیال اور بلند حوصلہ، سر سید احمد خاں بہادر نے کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے، مگر افسوس ہے کہ انھوں نے قوم کو بہبودی کی یک رخی تصویر دکھائی، دنیا کو سنبھالا اور دین سے دیدہ و دانستہ اعراض کیا، نوجوانوں پر ان کی دنیاوی کوششوں نے وہ اثر کیا، جس سے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا، اس واسطے دیندار بزرگوں نے ان کی دنیاوی کوششوں کی داد دینے سے چشم پوشی کی، اسی وجہ سے ان کو جیسی جلد کامیابی ہونی

چاہیے تھی نہیں ہوئی، ہوئی مگر دیر میں ہوئی اور مشکل سے ہوئی۔

انہیں باتوں پر نظر کر کے عالی خیال بزرگوں کی یہ مستقل رائے تھی کہ "قوم کی حالت اسی وقت درست ہوگی، جب علمائے کرام اس کی طرف متوجہ ہوں گے" خدا کا شکر ہے کہ یہ تمنا اب تک لوگوں کے دلوں میں چھپی ہی تھی کہ تائید ایزدی سے ہمارے دین ودنیا کے رہنما، ہماری کشتی کے ناخدا اور اسلامی فوج کے سپہ سالار، دین کے سرپرست اور کلامِ الٰہی کے حامل، یعنی مقدس علماء اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فکر کرنے پر آمادہ ہوئے، لیکن نہایت ہی ظلم ہوگا، اگر قوم ان کی شکر گزار نہ ہو اور جان ودل سے، قلمے، قدمے، درمے، ان کی مدد پر آمادہ نہ ہوجائے، ورنہ ظاہر ہے کہ لوگوں کی ناقدری اور کم توجہی سے خدانخواستہ ان کے جوش کے افسردہ ہوجانے کا احتمال قوی ہے، اس واسطے ندوۃ العلماء کی حمایت اور شرکت ہر مسلمان کو کرنی چاہیے۔"

اس تحریک کی تائید اسی خاندان کے دوسرے معزز رکن سید ابوسعید صاحب(۱) نے کی، جو انجمن کے نائب سکریٹری بھی تھے، یہ بھی طے ہوا کہ تمام ارکان کے نام اور چندے، ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی خدمت میں بھیج دیئے جائیں، بعض حضرات

(۱) منشی سید ابوسعید صاحب، حافظ سید عبدالسلام صاحب کے صاحبزادہ اور مولانا سید عبدالجلیل صاحب کے پوتے تھے، ان کا نام اپنے جد امجد حضرت سید شاہ ابوسعید صاحب کے نام پر رکھا گیا، جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے اور ان کا شمار حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خواص اصحاب میں تھا، صاحب علم، ہوشمند اور نہایت کریم النفس اور ہمدرد، ذی مروت انسان تھے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے اور حاجی صاحب کے خطوط میں ان کا تذکرہ ہے۔

نے ندوۃ العلماء کی رکنیت کی درخواست کی۔

دوسری تجویز (جو آپس کے تنازعات میں باہمی تصفیہ اور معاملہ عدالت تک جانے کی صورت میں تعلقاتِ باہمی اور مواخات قائم رکھنے سے متعلق تھی) پر مولانا سید عبدالحی صاحب نے حسب ذیل تقریر کی، یہ ان کا خاص مضمون تھا، جس سے ان کو طبعی مناسبت تھی اور جس نے بعد میں ایک مستقل رسالہ ''اصلاح'' کی شکل اختیار کر لی، جس کو انھوں نے خاندان کے ایسے ہی اختلافات کے موقع پر کئی سال کے بعد تحریر کیا، اور جس نے اصلاح ذات البین کی ایک بہت بڑی خدمت انجام (۱) دی، چونکہ اس تقریر کا موضوع بھی ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے ذہن وجذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اس لئے بلفظہ یہاں نقل کی جاتی ہے:

''یہ بات سلسلۂ تمدن میں مان لی گئی ہے، کہ ایک جگہ کے رہنے والوں میں معاملات ضرور پیش آتے ہیں اور ہمیشہ پیش آئے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، وہ پاک اور مقدس زمانہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا، جس میں آسمان کے فرشتے آدمیوں کی شکل وصورت میں زمین پر چلتے پھرتے نظر آتے تھے، اگر ان میں مقدمات نہ چھڑے ہوتے تو قاضیوں کا تقرر اور حاکم وکوتوال کا تعین بیکار ہوتا اور دیوانی وفوجداری کے قوانین فضول ہوتے، مگر بایں ہمہ دورانِ مقدمہ میں یا مقدمہ کے بعد فریقین میں عناد نہیں پیدا ہوتا تھا۔

دورانِ مقدمہ میں بلاشبہ اپنے اپنے دعووں کے ثابت کرنے کی

(۱) اس رسالہ پر تبصرہ اور اس کے ضروری اقتباسات، بعد کے ایک مستقل باب میں آئیں گے۔

کشش وکوشش ہوتی تھی، مگراس کا اثر عدالت ہی تک محدود رہتا تھا، اس کے بعد جب وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے، تو صاف دلی کا اس سے اندازہ ہو جاتا تھا، برخلاف ہماری موجودہ حالت کے، کہ ہمارے زمانہ میں یہ شرمناک عیب عموماً رائج ہے، کہ دنیاوی معاملات میں رنج وعناد کے ساتھ ساتھ برتا جاتا ہے۔
مقدمات کی بنا اکثر غلط فہمیوں پر ہوا کرتی ہے، جس کے دور کرنے کے واسطے عدالتیں قائم ہیں، مگر ہم لوگ خوگر ہو گئے ہیں کہ جب کوئی مقدمہ عدالت میں جاتا ہے، تو اپنی شائستگی کی وجہ سے قبل اس کے کہ وہ مقدمہ دائر ہو، فریق ثانی سے مواخات ترک کر دیتے ہیں، لیکن یہ میں نے جس قدر بیان کیا ہے، ان مقدموں کا ذکر ہے، جن کی بنا اکثر غلط فہمیوں پر ہوتی ہے، حالانکہ ہم لوگوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے، مقدمے اکثر ذاتی رنجش سے خفیف خفیف باتوں پر دائر کئے جاتے ہیں، جو مصداق "خسر الدنیا والآخرۃ" کے، دینی ودنیاوی خسران، انکے باعث ہوتے ہیں، جھوٹ بولنا، جھوٹ حلف اٹھانا، جھوٹے گواہ بنانا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی روداد، جھوٹی دستاویزیں بنانا، حاکموں کو دھوکا دینا، دوسروں کی حق تلفی کرنا، لوگوں کو ناحق ستانا، رشوتیں دینا، کچہری کے ادنیٰ ادنیٰ اہلکاروں کی نازِ برداری کرنا، وکیلوں، مختاروں کی درباری کرنا، فوجداری کے مقدموں میں اکثر اپنے کئے کی پاداش بھگتنا، الغرض اسی قسم کی ہزار ہا باتیں ہیں، جن

کو کچھ وہی خوب جانتے ہیں، جو شامت اعمال سے آئے دن کچہری میں موجود رہتے ہیں، (مجھ کو تو اب تک خدا نے محفوظ رکھا ہے، دعا کرتا ہوں کہ ہمیشہ اس مخمصہ سے الگ ہی رکھے)۔

لہٰذا میں جہاں تک خیال کرتا ہوں، ہماری قوم کی بہبود اسی میں ہے کہ بات کو بتنگڑ نہ کریں، جہاں تک ہو سکے اپنے معاملات کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرلیا کریں، اور اگر کسی معاملہ میں کسی فریق کی نارضامندی سے یہ بات نہ ہو سکے اور عدالت تک اس کی نوبت پہونچے، تو اپنی کوششوں کو صرف اپنے دعووں کو ثابت کرنے یا الزام کو اپنے سر سے اٹھانے تک محدود رکھیں، اس معاملہ کی وجہ سے دوسرے کی آبروریزی یا تذلیل کے درپے نہ ہو جائیں اور اخوت اسلامی کو ترک نہ کریں۔

خدا کی اس نعمت کو جو اس نے ہم پر پوری فرمائی ہے اور جس کی بدولت ہماری کامیابیوں نے تمام دنیا کو پامال کردیا تھا، بھول جانا، بڑی احسان فراموشی ہے، ابھی ہم بھولے نہیں وہ وقت، جبکہ اوس اور خزرج، انصار کے دو قبیلوں کو انھیں خانہ جنگیوں پر ان الفاظ میں چشم نمائی کی گئی تھی "واذكروا نعمة الله عليكم، إذ كنتم أعداءا فألف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته إخوانا، و كنتم علىٰ شفا حفرة من النار فأنقذكم منها."

اب میں اپنے بیان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا اگر "در خانہ کس است یک حرف بس است" اس دعا پر ختم کرتا ہوں (اور آپ

آمین کہیں) ﴿ربنا افتح بيننا و بين قومنا بالحق و أنت خير الفاتحين.﴾

اس انجمن کا جو دستور العمل مرتب ہوا، اس کے مقاصد میں انجمن کے ان مقاصد کے علاوہ، جن کا تعلق اصلاح وترقی شرفاء وسادات سے تھا، حسب ذیل مقاصد بھی شامل کیے گئے، جن سے بانی انجمن کے اس ذہن اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، جو ان کو کشاں کشاں ندوۃ العلماء کی رکنیت کی طرف لے گیا، اور بالآخر اس نے اس کی سربراہی اور نظامت کے منصب تک پہونچایا۔

۱. عربی سلسلۂ تعلیم کو جس کا اب بہت تنزل ہوگیا ہے، قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیروں کو اختیار کرنا۔

۲. جو لوگ علوم مشرقی ودینیات کی تعلیم، قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے علماء سے پاتے ہیں، ان کو زمانہ کی ضرورتوں سے واقف کرنا، اور جو لوگ انگریزی کالجوں میں مغربی علوم وفنون کی تعلیم پاتے ہیں، ان کو مذہبی معلومات سے مستفید کرنا۔

ندوہ کی تحریک سے طبعی مناسبت کے اسباب

ندوۃ العلماء کی تحریک سے، جس کا ابتدائی تخیل سب سے پہلے مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیضِ عام کانپور کے ایک سالانہ جلسہ میں پیش کیا اور جس کے دو بنیادی مقاصد رفعِ نزاعِ باہمی، (علماء کی باہمی نزاع خصوصیت کے ساتھ اور عام مسلمانوں کی عمومیت کے ساتھ) اور اصلاحِ طریقۂ تعلیم (جس کا اہم جزو نصاب تعلیم کی توسیع وترقی اور حذف واضافہ تھا) تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب کے اتفاق ومناسبت اور اس کی طرف انجذاب وکشش کے متعدد

اسباب تھے۔

۱. اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیمِ جدید اور تہذیب مغربی کی دعوت، اور ملک کی دوسری تحریکوں کے برخلاف) خالص دینی تھی، یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب، دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا، یہ وہ عقیدہ اور طریق فکر تھا، جو ان کے تمام مضامین و خطبات میں جھلکتا ہے اور اس خط میں جو سرسید کے نام لکھا گیا ہے، بہت صاف نظر آتا ہے۔

۲. اس تحریک میں طبقۂ علماء کو (جو شریعت اسلامی کا حامل وامین، کتاب وسنت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے) مرکزی مقام دیا گیا ہے، اور اسی کو امت کی تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل اور اصلاح و افساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت و جد و جہد کا محور بنایا گیا ہے، کہ امت میں اصلاحِ حال کی کوئی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی، جب تک علماء اس کے داعی اور علمبردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو، اس کے لئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب وسنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے، دوسری طرف حالاتِ زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

یہ عقیدہ اور طریقِ فکر بھی ان کے ذہن سے خاص مناسبت رکھتا تھا، کہ ان کا تمام تر نشو ونما ایک ایسے ماحول میں ہوا تھا، جس میں دین اور علمائے دین کو ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی تھی اور خود سید صاحبؒ کی تحریک اسی روح کی حامل و مظہر تھی۔

۳. اس تحریک کا اولین بنیادی مقصد رفعِ نزاعِ باہمی تھا، جس کا تعلق سب سے پہلے علماء سے مذہبی و فقہی نزاعات و اختلافات سے تھا جس نے علمی تحقیق و مباحثہ

سے آگے بڑھ کر مجادلے، اور مجادلے سے بڑھ کر مقاتلے، عدالتی چارہ جوئیوں، فوجداریوں اور باہمی تذلیل وتضلیل بلکہ تکفیر وتفسیق کی شکل اختیار کر لی تھی، اور سارا ہندوستان اس کی وجہ سے ایک مذہبی دنگل بنا ہوا تھا۔

اوپر کے صفحات سے معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا سید عبدالحی صاحب کا ابتدائی نشو ونما اور پھر تعلیم وتربیت ایسے ماحول میں ہوئی، جو گروہی عصبیت سے بہت دور تھا، اور جس کا عمل اس زمانہ کی اصلاح کے مطابق بقائے باہم بلکہ اکرام مسلم کے اصول پر تھا، ان کے ذہن وذوق کی پرداخت بھی اسی انداز پر ہوئی تھی، وہ بہ یک وقت مولانا محمد نعیم صاحب (جو شدت سے حنفی مسلک کے پابند تھے) اور شیخ حسین عرب (جو شافعی المسلک تھے) اور میاں نذیر حسین صاحب (جن کو عدم تقلید اور عمل بالحدیث میں شدت تھی) کے شاگرد تھے اور سب کے علم وفضل کے معترف، خود ان کے خاندان میں حضرت سید صاحبؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب کے اثر سے حنفی واہل حدیث نہ صرف دوش بدوش بلکہ شیر وشکر تھے، ان کے شیخِ تربیت حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب شدت والتزام کے ساتھ حنفی مسلک اور تقلید کے پابند تھے، یہی حال ان کے والد ماجد کا تھا، دوسری طرف ان کے خاندان کے دو بزرگ، جن کے صلاح اور زہد وتقویٰ پر پورے خاندان کا اتفاق تھا اور دونوں حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نواسے تھے، یعنی مولانا سید عرفان اور مولانا سید مصطفیٰ، مسلکاً وعملاً اہل حدیث تھے، اور اس کی وجہ سے خاندان میں کوئی تفریق یا انتشار نہیں تھا، اس لئے ندوۃ العلماء کا پہلا بنیادی مقصد انکی سلیم طبیعت کے لئے بڑی کشش رکھتا تھا، اور اس کے قبول کرنے اور اس کا داعی بننے میں ان کے لئے کوئی دشواری نہ تھی۔

۴. اس تحریک کا مزاج (سیاسی وہنگامی کے بجائے) علمی وفکری تھا، اور

یہی ان کا اصل مزاج تھا، اگر اس مزاج سے ان کی زندگی کے کسی دور میں علاحدگی پائی جاتی ہے تو وہ عارضی اور سطحی ہے، وہ طبعاً و مزاجاً عالم، مصنف اور مؤرخ تھے، اس لئے ان کو اس تحریک کے قبول کرنے اور اس کا ساتھ دینے میں کوئی اندرونی کشمکش یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔

۵. ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقیٔ نصاب کے کام سے ہوا تھا اور یہ بات ان کے فکر و مطالعہ سے پوری مطابقت رکھتی تھی، ان کا تاریخی مطالعہ زندگی کے ہر شعوری دور میں وسیع رہا ہے، ہندوستان کی علمی و تعلیمی تاریخ انکا پسندیدہ موضوع تھا، وہ بہت دوسرے علماء سے زیادہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان کا قدیم نصابِ تعلیم (جس کو حضرت ملاّ نظام الدین کے بعد بجا طور پر درسِ نظامی کا نام دیا گیا ہے) ہر دور میں بدلتا رہا ہے، یہ تبدیلی معیار فضیلت میں بھی پیش آئی، اس میں بھی رونما ہوئی کہ پورے نصاب و نظام کا مرکزی مضمون کیا ہو، اور کتابوں کے حذف و اضافہ اور رد و قبول میں بھی پیش آئی، اس موضوع پر سب سے زیادہ محققانہ مضمون، خود انھیں کے قلم سے ''ہندوستان کا قدیم نصاب تعلیم'' کے عنوان سے نکلا، جو بعد کے اکثر مضامین و مقالات کا ماخذ بنا رہا، (۱) انھوں نے ان تبدیلیوں کے تاریخی و سیاسی محرکات و عوامل کا بھی سراغ لگایا اور انکے صحت و سقم پر آزادانہ رائے دی، اور آخر میں اس کی بعض ناہمواریوں اور نقائص کی طرف بھی اشارہ کیا، ان کی تعلیم اگر چہ خالصتاً درسِ نظامی کے مطابق ہوئی تھی اور ان کے تمام تر اساتذہ اسی درس کے فیض

---

(۱) یہ مضمون اولاً ''الندوہ'' کے دور اول میں شائع ہوا، اب وہ ان کی عربی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' کے اردو ترجمہ جو ''اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں'' کے نام سے حال میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے، میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یافتہ اور ماہر معلم تھے، لیکن ان کو عملاً اس کی بعض خامیوں پر خود تنبہ ہوا، شیخ حسین عرب صاحب کے درسِ حدیث اور شیخ محمد بن حسین کی تعلیمِ ادب اور بھوپال کے زمانۂ قیام میں جو مختلف مسلکوں اور ملکوں کے علماء کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا، ان کو ان خامیوں کے سمجھنے میں ضرور مدد ملی ہوگی، پھر جب ان کو خود عربی میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہوا تو ان کو اندازہ ہوا ہوگا، کہ خالص قدیم نصابِ تعلیم، سلیس و آزاد عربی میں کتنی کم مدد کرتا ہے اور کس قدر زیادہ رکاوٹ ڈالتا ہے، اس بنا پر وہ ندوۃ العلماء کی اصلاحِ نصاب کی دعوت سے ذوقی و تحقیقی طریقہ پر متفق اور اس کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔

۶. ان کا جس خاندان اور جس ماحول میں نشو و نما ہوا، وہ انگریزی تعلیم سے آشنا ہو رہا تھا اور سر سید مرحوم کی تعلیمی تحریک کی صدائے بازگشت سے اس وقت ہر شہر وقصبہ کے بام و در گونج رہے تھے، زمانہ کا نیا رخ اور تاریخ کا نیا دھارا، ان کی آنکھوں کے سامنے تھا، دونوں تعلیموں کے فیض یافتہ اشخاص سے ان کا دن رات واسطہ پڑتا تھا، اور وہ دیکھ رہے تھے، کہ ان کے ذہنوں، احساسات بلکہ زبانوں اور اصطلاحوں میں بھی کتنا عظیم تفاوت رونما ہو رہا ہے اور ان دونوں طبقوں کے درمیان کیسی وسیع خلیج پیدا ہو رہی ہے، جو دین وملت کے حق میں نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، اس کا علاج وہی تھا جو انھوں نے اپنی نوخیز و محدود انجمن کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ''علماء کی کم توجہی کا سبب سب سے بڑا یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہیں'' اور جس کا علاج انھوں نے یہ تجویز کیا تھا کہ ''جو لوگ علوم مشرقی و دینیات کی تعلیم، قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے علماء سے پاتے ہیں، ان کو زمانہ کی ضرورتوں سے واقف کرنا اور جو لوگ انگریزی کالجوں میں مغربی علوم وفنون کی تعلیم پاتے ہیں، ان کو مذہبی معلومات سے مستفید کرنا'' دوسری تدبیر وہ تھی، جو ندوۃ العلماء

نے (اس وقت جب وہ اس کے ایک سرگرم رکن بن چکے تھے) اختیار کی، کہ ’’انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم وفنون کے ساتھ پڑھایا جائے۔‘‘

بہر حال یہ وہ نمایاں ذہنی ونفسیاتی اسباب تھے، جنھوں نے ان کے اور ندوۃ العلماء کی تحریک ودعوت کے درمیان وہ رابطہ اور تعلق پیدا کردیا، جو سنگ مقناطیس اور آہن پاروں کے درمیان ہوتا ہے، اور جیسے ہی اس کی صدا ان کے کان میں پڑی، انھوں نے اس پر لبیک کہا اور بلا پس وپیش اس تحریک میں شامل ہوگئے۔

ندوۃ العلماء میں ان کی شرکت اور عملی دلچسپی

مولانا سید عبدالحی صاحب نے انجمن آل ہاشم (دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی) کے جلسہ ۲۳؍صفر ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۵؍اگست ۱۸۹۵ء پنجشنبہ ندوۃ العلماء کی تائید وحمایت میں جو تقریر کی تھی، اس سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ندوۃ العلماء کے پہلے باقاعدہ اجلاس منعقدہ شوال ۱۳۱۱ھ (اپریل ۱۸۹۴ء) میں جو کانپور میں ہوا تھا، شریک تھے، اس وقت ان کا شمار ان نوجوان علماء میں تھا، جو قریب ہی زمانہ میں فارغ التحصیل ہوئے تھے، ان کی عمر اس وقت ۲۵؍سے متجاوز نہ تھی، ندوۃ العلماء کے دوسرے جلسہ جو اگلے ہی شوال ۱۳۱۲ھ (اپریل ۱۸۹۵ء) میں لکھنؤ میں ہوا، میں بھی موجود تھے، اس وقت وہ جھوائی ٹولہ میں طب کی تکمیل کر رہے تھے، ان کا نام روداد میں شرکاء جلسہ اور چندہ دینے والوں میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:

’’مولوی عبدالحی صاحب مقیم لکھنؤ چوپٹیاں پھاٹک دبیر الدولہ
(پتہ رائے بریلی) چندہ دہندہ۔‘‘

اس روداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ندوۃ العلماء کے اراکین قسم اول میں

تھے، گویا وہ ابتدا ہی سے کسی باقاعدہ سالانہ اجلاس سے غیر حاضر نہیں رہے، انھوں نے ندوہ کے دوسرے سالانہ اجلاس (منعقدہ لکھنؤ) کے پانچ مہینہ کے بعد ہی انجمن آل ہاشم کے جلسہ میں (جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اوپر گزر چکا ہے) ندوہ کی تائید وحمایت کی تحریک پیش کی اور اس پر ایک مبسوط تقریر کی، اس انجمن کے پہلے (اور آخری) جلسہ کے بعد ہی ان کی ساری دلچسپی اور سرگرمی، اس مقامی اور محدود انجمن کے میدان سے نکل کر ندوۃ العلماء کی ملّی مجلس اور اس کی ملک گیر تحریک کی طرف منتقل ہوگئی، اور وہ اس تحریک سے مستقل طور پر وابستہ ہوگئے، انھیں کی کوشش وتحریک سے انجمن آلِ ہاشم کی طرف سے ندوۃ العلماء کے اجلاس رائے بریلی، شوال ۱۳۱۳ھ (اپریل ۱۸۹۶ء) میں سپاسنامہ پیش کیا گیا اور ارکان ندوۃ العلماء کی خدمت میں وہ تائیدی محضر آیا، جس پر اس وقت کے تقریباً زندہ اور موجودہ افرادِ خاندان (سادات حسنی قطبی) اور عمائدِ شہر رائے بریلی کے دستخط تھے، کہ ہم ندوۃ العلماء کی تحریک کی دل وجان سے تائید کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

مددگار ناظم کے لئے ان کا انتخاب

ان کی دلچسپی تحریک ندوۃ العلماء سے بڑھتی جارہی تھی اور وہ اس کے کاموں میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لے رہے تھے، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری اور ان کے مؤقر رفقائے کار کو جلد مولانا کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا اور انھوں نے ۸؍رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء چہارشنبہ کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا کو (جن کا نام مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری نے پیش کیا تھا) مددگار ناظم منتخب کرلیا، (۱)

(۱) ابتداءً مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا نام پیش کیا گیا تھا اور ان سے عہدہ کے قبول کرنے کی درخواست کی گئی لیکن انھوں نے اپنی مجبوریوں اور قیام کانپور کے مصارف کی بنا پر، جن کا اس وقت ندوہ متحمل نہیں ہوسکتا تھا، معذرت فرمائی۔

اور وہ مولانا سید محمد علی صاحب کے معاون و معتمد خصوصی اور دفترِ ندوۃ العلماء کے ذمہ دار بن گئے، ارکان نے اس عہدہ کے لئے تنخواہ منظور کی تھی، لیکن مولانا نے بلا معاوضہ یہ خدمت قبول کی اور حسبۃ للہ یہ کام شروع کر دیا۔

اس وقت سارے ملک میں ندوۃ العلماء کی تحریک کا غلغلہ بلند تھا، ہندوستان کے تقریباً تمام مشاہیر علماء، مشائخ، اعیانِ قوم، اور روشن دماغ فضلاء نے اس کی تائید و تحسین کی تھی، پورے ملک کی نگاہیں، اس نئی تحریک پر، جو علماء کے ایک مخلص و متوازن فکر، حلقہ سے شروع ہوئی تھی، اور بڑے عزائم لے کر اٹھی تھی، لگی ہوئی تھیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد (ہمارے علم میں) کسی تحریک کو دینی و علمی حلقوں میں ایسی مقبولیت اور مسلمانوں کے مختلف سنجیدہ طبقوں کا ایسا اعتماد حاصل نہیں ہوا تھا جیسا کہ ندوہ کی تحریک کو حاصل ہوا، روحانی اور اخلاقی طور پر اس کو اپنے عہد کی دو عظیم ترین دینی اور روحانی شخصیتوں، حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی (جنھوں نے اس کے حق میں کلمۂ خیر فرمایا تھا اور اس کی کامیابی اور فروغ کے لئے دعا کی تھی) اور حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی (جنھوں نے اس کو تائید الٰہی اور لطیفۂ غیبی سے تعبیر فرمایا تھا) کی تائید و تصدیق اور ایک طرح کی روحانی سرپرستی کا شرف حاصل تھا، دوسری طرف قدیم علماء میں استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی (۱) کی حمایت و تائید، جنھوں نے اس کے متعدد اجلاسوں کی صدارت فرمائی، نیز مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا ابومحمد ابراہیم آروی، جیسے نامور علماء اس کے سرگرم ارکان میں تھے، اسی کے ساتھ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی جیسا سحر انگیز مقرر اور شیوہ بیان واعظ، (جن کے بغیر علی گڑھ کی تحریک کی گاڑی بھی

(۱) مولانا لطف اللہ صاحب کے علمی و عملی کمالات اور ان کے وسیع حلقۂ تلمذ اور دائرۂ اثر کے معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو! ''استاذ العلماء'' از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی۔

نہیں چلتی تھی) اور جن سے نواب محسن الملک کو بھی استغنا نہ تھا، اس کی زبان و ترجمان تھا، اس کے بالمقابل شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی جیسا صاحب قلم و صاحبِ فکر اور قدیم وجدید کا مبصر، اس کے پرجوش داعیوں اور حامیوں میں تھا، دینی و دنیاوی وجاہت اور علمی و عملی صلاحیت رکھنے والوں میں متعدد نمایاں شخصیتیں اس کے کاموں میں دل وجان سے شریک تھیں، ایک مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہجہاں پوری استاذ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نظام دکن، دوسرے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رئیس بھیکن پور علی گڑھ، جو بعد میں نواب صدر یار جنگ بہادر کے لقب اور صدر الصدور امور مذہبی ریاستِ حیدرآباد کے منصب سے روشناس و نامور ہوئے، تیسرے خان بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل مشیر قانونی انجمن تعلقداران اودھ۔

اس وقت مختلف اسلامی اور قومی انجمنوں سے تائیدی تجویزیں اور ریزولیشن آرہے تھے، مختلف اضلاع نے سپاسنامے پیش کئے تھے، ملک کے طول وعرض سے ندوۃ العلماء کے سوال نامے اور استفسار پر تائیدی جوابات اور پرجوش تحسین کے پیغامات وصول ہوئے تھے، ایک طرف قدیم تعلیمی اور دینی حلقے اور نامور اساتذہ اور علماء کی طرف سے تائید کا اعلان ہوا تھا، دوسری طرف علی گڑھ کے جدید تعلیمی حلقہ میں، جس کے صدر نشین نواب محسن الملک اور آنریبل جسٹس سید محمود تھے، اس تحریک کا خیر مقدم کیا گیا تھا اور اس کو مسلمانانِ ہند کے حق میں فالِ نیک اور قدیم وجدید حلقہ کے درمیان ذریعہ وصل و قرب قرار دیا گیا تھا، جگہ جگہ سے وفود آنے اور ندوۃ العلماء کا تعارف کرانے کی دعوت دی گئی تھی۔ (۱)

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! ندوۃ العلماء کی ابتدائی روداد یں اجلاس ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۳۱۱ھ لکھنؤ، بریلی، میرٹھ، یا ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری'' از مولوی محمد الحسنی مدیر ''البعث الاسلامی''۔

ندوۃ العلماء کے تبلیغی وفود

مددگار ناظم کا عہدہ قبول کرنے کے بعد ہی انھوں نے ندوۃ العلماء کے وفد کے ساتھ، جس کی قیادت خود مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کر رہے تھے، ۲۵/رجب ۱۳۱۳ھ/۱۱/جنوری ۱۸۹۶ء میں فتح پور، ہسوہ اور رائے بریلی کا دورہ کیا، ان اضلاع کا انتخاب غالباً مولانا سید عبدالحی صاحب کے خاندانی تعلقات، تعارف اور مولانا سید ظہور الاسلام صاحب کی تحریک پر ہوا ہوگا، ارکانِ وفد نے ان مقامات پر مدارس دینیہ کی سقیم حالت دیکھی، مسلمانوں کو ان کی اصلاح و ترقی کی طرف متوجہ کیا، لوگوں کو نزاعِ باہمی کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا، اتحاد و مصالحت کی دعوت دی، فریقین میں صلح کرائی، بچھڑوں اور روٹھوں کو ایک دوسرے سے گلے ملایا، لوگوں نے غیر اسلامی مراسم اور تقریبات میں اسراف اور بے اعتدالیوں سے توبہ کی، تحریری معاہدے لکھے گئے، اس سب کے ساتھ ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی اشاعت بھی ہوئی اور اس کی افادیت کا نقش بھی قائم ہوا، (۱) اس دور میں مولانا سید عبدالحی صاحب نے رفع نزاعِ باہمی، رسوم قبیحہ کے انسداد اور مدارس کے احیاء و ترقی پر پُر اثر تقریریں کیں۔

ان کا دوسرا دورہ ۲۰/رجب ۱۳۱۴ھ (۲۵/دسمبر ۱۸۹۶ء) غازی پور کا ہوا، وفد میں مولانا سید محمد علی صاحب اور مولانا سید عبدالحی صاحب کے علاوہ مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری اور مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے، مسلمانانِ غازیپور نے اس وفد کا استقبال اس جوش و خروش کے ساتھ کیا کہ اس سے اس تحریک

(۱) تفصیل کے ملاحظہ ہو! روداد اجلاس سوم (بریلی)

کی مقبولیت اور وفد کے ارکان کی محبوبیت کے علاوہ مسلمانوں کی دینی حمیت اور اسلامی محبت کا اظہار ہوتا ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس تحریک سے کیسی توقعات قائم کی تھیں، غازی پور لبِ دریا آباد ہے، اس کا اسٹیشن دریا کے دوسری جانب تھا، اسٹیشن پر رؤساء کی جماعت مولانا ابوالبرکات صاحب فرزند اکبر مولانا شاہ امانت اللہ صاحب غازی پوری کی قیادت میں استقبال کے لئے موجود تھی، دریا کے دوسری جانب مولانا شاہ امانت اللہ صاحب ایک ہزار اہلِ شہر کے ساتھ استقبال کے لئے تشریف رکھتے تھے، مسلمانوں نے اپنی مسرت اور جوش وخروش کے اظہار کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے تھے، جو اس زمانہ کی سادگی کے پیش نظر اور اس لحاظ سے کہ ابھی سیاسی جلسے جلوسوں اور رہنماؤں کے استقبال کے نئے طریقوں کے دور کا آغاز نہیں ہوا تھا، بہت غیر معمولی تھے، (۱) یہ جوش وخروش استقبال تک محدود نہ تھا، بلکہ مالی ایثار (۲) اور عملی اعانت کی بھی قابلِ قدر مثالیں سامنے آئیں اور ندوہ کی شاخ کا قیام بھی عمل میں آیا، غازی پوری کے بعد پٹنہ، بریلی، اور دوسرے مقامات کے دورے ہوئے، جن میں مولانا شریک تھے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب کی صلاحیت اور خدمات کا اعتراف

ندوۃ العلماء کے اجلاس سوم منعقدہ بریلی (۲٦ر۲۷رشوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۰را۱راپریل ۱۸۹۵ء) مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے اپنی سالانہ روداد میں حسب ذیل الفاظ میں مولانا سید عبدالحی صاحب کی صلاحیت وحسنِ خدمات

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! روداد سال چہارم ص ر۳۳، ۳۴۔

(۲) مولوی شرف الدین صاحب وکیل غازیپور نے اپنی کوٹھی جو اپنی رہائش کے لئے بنوائی تھی سجی سجائی ندوہ کو پیش کردی اور خود کرایہ کے مکان میں منتقل ہوگئے، (روئیداد اجلاس چہارم)

کا اعتراف کیا:

''یہ ہمارے نوجوان فاضل، نہایت لائق اور صالح، سلیم الطبع اور زمانہ کی ضرورتوں کو جاننے والے اور پر جوش ہوا خواہِ اسلام ہیں، چار ماہ برابر دفتر میں قیام کر کے بہت لیاقت کے ساتھ کام کیا اور حالتِ قیام میں بھی مصارفِ قیام خزانۂ ندوہ سے نہیں لئے، جزاه الله خير الجزاء۔''

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء تک ندوہ کا دفتر کانپور ہی میں رہا اور مولانا عبدالحی صاحب بھی معتمد دفتر ہونے کی وجہ سے وہیں رہے، ۱۵/ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ مطابق ۲/ستمبر ۱۸۹۸ء کو ندوہ کا دفتر کانپور سے لکھنؤ میں منتقل ہو گیا، جمادی الاولیٰ ۱۳۱۶ھ (ستمبر ۱۸۹۸ء) میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا عملی افتتاح بھی ہو گیا اور اس کے ابتدائی درجات کھل گئے، اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء اور کتب خانہ، سب گولہ گنج میں واقع تھے، دارالعلوم خاتون منزل کی اس عمارت میں واقع تھا، جو منشی احتشام علی صاحب کاکوروی نے خرید کر ندوۃ العلماء کے لئے وقف کر دی تھی، اس لئے آپ کا کام بڑھ گیا اور آپ کا قیام لکھنؤ میں ضروری ہو گیا۔

مولانا سید عبدالحی صاحب کی ذمہ دارانہ مشغولیت

مولانا سید محمد علی صاحب اکثر علیل رہتے تھے اور ارشاد و تربیت اور سفروں و دوروں کے معمولات بھی تھے، وہ انھیں مجبوریوں کی بنا پر ۱۶، ۱۳۱۷ھ، ۹۸، ۱۸۹۹ء کے کسی انتظامی جلسہ میں شریک نہیں ہو سکے اور ان جلسوں کا سارا انتظام و انصرام، مراسلات کا کام، ایجنڈہ کی تیاری اور رودادوں کی ترتیب کا سارا کام، مولانا سید

عبدالحی صاحب نے انجام دیا، مولانا سید محمد علی صاحب اپنے رفقاء ومعاونین کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف اور اس کے پورے قدر دان تھے، اور ان کی بزرگانہ، شفیقانہ سرپرستی فرماتے تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب نے ایک سال تک بلا معاوضہ کام کیا، لیکن نہ وہ کسی جائداد کے مالک تھے، نہ کوئی اور ذرائع آمدنی رکھتے تھے، وہ طب سے کسبِ معاش کر سکتے تھے لیکن تحریک ابھی اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی اور دفترِ ندوۃ العلماء کا کام اتنا زیادہ تھا، کہ وہ مطب کے لئے وقت نہیں نکال سکتے تھے، مولانا سید محمد علی صاحب اور ارکانِ ندوہ نے اس صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے ۳۰ر روپیہ ماہوار کی منظوری دی، اور آپ نے محرم ۱۳۱۴ھ مطابق جون ۱۸۹۶ء سے اس طرح کام کرنا شروع کیا، تین سال کے بعد مولانا نے ۲۵ر شوال ۱۳۱۷ھ ۲۶ر فروری ۱۸۹۹ء کو ارکانِ انتظامیہ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں ان کی تنخواہ میں بیس روپیہ کے اضافہ کی سفارش کی، اپنی اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے مولانا کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے:

> ''مولوی سید عبدالحی مددگار ناظم نے پہلے تو کچھ دنوں بغیر اجرت کے کام کیا جب ان کی لیاقت وکارگزاری سے ناظم اور اراکین خوش ہوئے تو تیس روپیہ ماہوار ان کے مقرر کئے گئے، ان کے حلم اور کم سخنی سے ان کی حالت پورے طور پر معلوم نہیں ہوتی تھی، کئی سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ہمارے علماء کے زمرہ میں اس لیاقت کا آدمی ملنا مشکل ہے، علم، فہم اور حلم، لیاقت کارگزاری قابل تعریف ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

"جب سے میں اپنے ضعف اور خرابی طبیعت کی وجہ سے کام نہیں کرتا، میرا کل کام وہی کرتے ہیں اور عمدگی سے انجام دے رہے ہیں اور ان کو اس سے بہت دلچسپی ہے، میرے نزدیک بہت ضرور ہے کہ ان کی تنخواہ میں ترقی کی جائے اور پچاس روپیہ ماہانہ دیا جائے۔"(۱)

معاوضہ کا یہ سلسلہ غالباً ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا اور آپ باتنخواہ کام کرتے رہے، اس کے بعد آپ نے معاوضہ قبول کرنے سے بالکلیہ معذرت فرمادی اور کسبِ معاش کے لئے مطب شروع کردیا، جس کا مستقل تذکرہ اپنی جگہ پر آئے گا۔(۲)

بانی وناظم ندوۃ العلماء کے معتمد خاص اور دست راست

اسی عرصہ میں ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء میں مولانا سید محمد علی صاحب نے حجاز کا عزم فرمایا، مولانا کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ندوۃ العلماء کا کام ان کے منشا اور ان کے اسی تخیل کے مطابق ہوتا رہے اور اس وسیع النظری، حوصلہ مندی اور اعتدال وتوازن میں کوئی فرق نہ آئے اور اصل تخیل ومقصد کسی وقت نظر سے اوجھل نہ ہو، جو ندوہ کا مابہ الامتیاز تھا، اس کے لئے اپنی قائم مقامی کے لئے انکی نظرِ انتخاب مولانا سید عبدالحی اور مولانا عبداللطیف صاحب (۳) پر پڑی، انھوں نے ۲۸ رجب

(۱) مجموعہ خطوط قلمی (۲) ملاحظہ ہو! باب ششم۔

(۳) مولانا عبداللطیف صاحب افضل گڑھ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، لیکن اپنے والد صاحب کے ساتھ عرصہ تک سنبھل ضلع مرادآباد میں رہے، اس لئے سنبھلی سے مشہور ہوئے، درسیات مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی سے پڑھیں، عرصہ تک ڈلمؤ ضلع رائے بریلی میں تدریس کی خدمت انجام دی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں افتا وتدریس پر تقرر ہوا اور عرصہ تک وہاں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۳۱۸ھ مطابق ۲۱ر نومبر ۱۹۰۰ء کو ان دونوں کے نام ایک مشترک طویل خط لکھا، جس میں اپنے ذہن کا خاکہ، کام کے سارے پہلو اور دار العلوم کی ترقی اور طلباء کی تربیت کے وسیع منصوبے، کاغذ پر رکھ دیئے، یہ خط ہمارے یہاں کے مجموعہ خطوط قلمی میں محفوظ ہے، اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

''یہ کام (ندوۃ العلماء) خدا کے فضل سے قائم ہوا، اور بظاہر میرے نام لگایا گیا اور اب اگر چہ دل بہت چاہتا ہے کہ دل توڑ کر اس کی خدمت کروں اور ندوۃ العلماء کو چلا کر دکھا دوں اور اس میں فنا ہو جاؤں، مگر ضعفِ جسمانی اور قصورِ ہمت دونوں اس کے مانع ہیں، دل میں اس کی آرزو ہے کہ ع

مردے از غیب بروں آید وکارے بکند

خدا کا ہزار شکر ہے کہ مولوی سید عبدالحی اور آپ میرے گمان میں انھیں مرادانِ غیب میں سے ہیں، جن سے یہ عظیم الشان کام چلنے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) یہ خدمات انجام دیں، حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب سے بیعت اور مولانا سید محمد علی صاحب سے خصوصی تعلق تھا، چنانچہ حجاز سے واپسی کے بعد عرصہ تک انھیں کی خدمت میں خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں قیام کیا، بعد میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں استادِ دینیات کے عہدہ پر تقرر ہوا، اور عرصہ تک شعبہ کی صدارت پر فائز ہو کر وظیفہ یاب ہوئے، وہاں سے سبکدوش ہو کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات سے متعلق رہے، اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور ۱۲ر جمادی الآخرۃ ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۹ء میں وفات پائی۔

مولانا عبداللطیف صاحب نہایت جید الاستعداد اور فاضل شخص تھے، حدیث وفقہ میں بہت اچھی دستگاہ تھی، تصنیفات میں شرح ترمذی ''الشرح اللطیف'' کے نام سے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے، ''لطف الباری'' شرح تراجم ابواب بخاری اور ''تاریخ القرآن'' اور متعدد غیر مطبوعہ تصنیفات ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی اور قدیم فضلائے ندوہ میں سے ایک بڑی تعداد کو ان سے تلمذ حاصل ہے۔

کی امید ہے، اللہ تعالیٰ آپ دونوں کی عمر اور صلاح وفلاح میں ترقی دے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"عجیب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں سے اس جہاز کو پار لگادے اور عظیم الشان فتح آپ ہی کے کارنامہ میں لکھی جائے۔"(۱)

مولانا سید محمد علی صاحب، مولانا سید عبدالحی صاحب کو جس نظر سے دیکھتے تھے اور انھوں نے ان سے جو توقعات قائم کی تھیں، ان کا اندازہ ان کے ایک گرامی نامہ کے اس اقتباس سے ہوتا ہے، جو پیش کیا جارہا ہے:

"میں مختصراً کہتا ہوں کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا، میں مکرر آپ کو لکھ چکا ہوں کہ "سپردم بتو مایۂ خویش را" اگر آپ کمرِ ہمت باندھ کر اس طرح اس کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے صاف رہ کر خلقت کا کچھ خیال نہ کریں گے اور اپنے تئیں وقف کردیں گے، جب تو کچھ ہوگا، ورنہ اس دفتر کو طاق میں اٹھا کر رکھ دیجئے اور کوئی نہیں ہے کہ اس بار کو اٹھائے اور اتنا بھی چلائے جتنا آپ اٹھا رہے ہیں، مگر چونکہ اس میں بہت سے شعبے ہیں، بعض ادنیٰ، بعض اعلیٰ، ان سب میں مہارت ہونا اور ان سب میں دلچسپی ہونا نہایت ہی نادر ہے، ندوہ میں جو اعلیٰ امور ہیں، اس کے آپ ہر طرح لائق ہیں، میرا یہ خیال ہے اور غالباً اراکینِ مخصوص کا،

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی۔

سب کا یہی خیال ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس خیال کے ساتھ
ہی آپ موردِ اعتراض ہونگے اور میں بھی اعتراض کروں گا اور
دیگر اراکین بھی، مگر دینی بہی خواہی کی غرض سے آپ کو خدا تعالیٰ
اس قدر ہمت دے کہ آپ اسے برداشت کریں اور جس طرح
انسان اپنے ذاتی کام پر اعتراض ہر قسم کے سہتا ہے اور کبھی باز
نہیں آتا، اسی طرح آپ بھی مستعد رہیں ورنہ خاتمہ ہے۔"(۱)

مولانا کی توقع مولانا سید عبدالحی صاحب کی صلاحیت وکارکردگی اور خشیت وللہیت کو دیکھ کر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ اس کام میں ان کے سب سے بڑے معتمد علیہ اور ان کی امیدوں کا مرکز بن گئے، ایک دوسرے خط میں، جو حجاز ہی سے لکھا تھا، تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی ہمت سے مسرت ہوئی، آپ کسی وقت ہمت نہ
ہاریئے گا، آپ کی ہمت سے بہت کچھ ہوگا، میں جانتا ہوں کہ
مصارف کی آپ کو دقت رہتی ہے، مگر آپ کو بخوبی معلوم ہوگا کہ
جس کسی نے کچھ کیا ہے، وہ فقر وفاقہ اور قناعت ہی میں کیا ہے،
ایسے حضرات کا نام نامی، نیک نامی کی سنہری کتاب میں لکھا
ہے۔"(۲)

□□□

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی۔ (۲) ایضاً

باب پنجم

نظامتوں کی تبدیلی، ندوہ کا دورِ اختلاف و انتشار، طلبہ کی اسٹرائک اور ملک میں بےچینی، علامہ شبلی کی وفات، مصالحت وتصفیہ

مولانا سید محمد علی صاحب کا استعفیٰ اور ندوہ کے نئے ناظمین

بالآخر ندوۃ العلماء کی تاریخ میں وہ نازک اور افسوناک مرحلہ پیش آگیا، جو تقریباً تمام دینی تحریکوں اور کوششوں کی تقدیر بن چکا ہے، یعنی مجلسِ انتظامی ندوۃ العلماء کے اندرونی اختلافات، مزاجوں کے عدم توافق بلکہ تضاد وتناقض کی بنا (۱) پر (جس کا تحمل، صحت کی کمزوری اور انقطاع کلی اور توجہ الی اللہ کے غلبہ کے ساتھ اور زیادہ مشکل ہوگیا تھا.) مولانا سید محمد علی صاحب مونگیریؒ نے بار بار کی کوششوں اور ارکان کی معذرت وانکار کے بعد ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفا دیدیا، اور وہ جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ (۹ جولائی ۱۹۰۳ء) میں منظور ہوگیا، اور یہ طے ہوا کہ تاانتخاب ناظم جدید، نائب ناظم مولانا محمد مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور (۲)

(۱) اس کی تفصیل کا محل مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری کی سیرت یا تحریک ندوۃ العلماء کی مفصل تاریخ اور روئیداد ہے، (جو بدقسمتی سے ابھی لکھی نہیں گئی) یہاں پر اس اشارہ سے زیادہ گنجائش نہیں۔

(۲) مولانا محمد مسیح الزماں خانصاحب کے والد ماجد کا نام محمد عمر خاں تھا، آپ قوم کے افغان خلیل ہیں، ۱۲۵۶ھ میں شاہجہاں پور میں ولادت ہوئی، زیادہ تر تعلیم اپنے نامور و باکمال بھائی ابوالرجا مولانا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ناظم کے اختیارات کے ساتھ کام کرتے رہیں، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری نائب ناظم منتخب ہوئے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب بدستور نظامت کے اس جدید دور میں بھی مددگار ناظم اور معتمد دفتر کی حیثیت سے ذوق وشوق اور مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے، چونکہ مولانا مسیح الزماں صاحب اپنی جائدادوں اور املاک کے انتظامات کی بنا پر شاہجہاں پور کا قیام ترک نہیں فرما سکتے، اور لکھنؤ میں مستقل قیام اختیار کرنے سے مجبور تھے، اس لئے ۱۵؍شوال ۱۳۱۲ھ (۴؍جنوری ۱۹۰۴ء) کے جلسہ انتظامیہ میں طے ہوا کہ ندوۃ العلماء کا دفتر شاہجہاں پور منتقل ہو جائے، مولانا سید عبدالحی صاحب بھی جو دفتر کے کلی ذمہ دار اور معتمد تھے، شاہجہاں پور رہنے لگے،(۱) مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کی سوانح ''حیاتِ مسیح'' میں اس کا تذکرہ ہے، مصنفِ کتاب منشی مظفر حسین خاں لکھتے ہیں:

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) محمد زماں خاں صاحب شہید سے پائی، جو افضل الدولہ بہادر والی ریاست حیدرآباد اور ان کے بعد نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے استاد تھے، مولانا محمد زماں خاں صاحب کی شہادت کے بعد ان کے بھائی مولانا مسیح الزماں خان صاحب ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کی تعلیم اور اتالیقی پر مامور ہوئے، اور بڑی خوش اسلوبی اور رعب وداب کے ساتھ ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء تک اس فرض کو انجام دیا، ولی عہد سلطنت آصفیہ کے استاد و اتالیق ہونے اور سرسالار جنگ مدار المہام سلطنت کے اعتماد کلی کی وجہ سے دکن میں ان کا طوطی بولتا تھا اور امراء نامدار اور حکام سلطنت، سب ان کے احترام پر مجبور تھے، ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء میں دکن سے شاہجہاں پور آئے اور وہیں بقیہ زندگی عزت وحرمت اور دینی مشاغل وخدمات کے ساتھ گزار کر ۱۳؍ذوالحجہ ۱۳۲۸ھ، ۱۷؍دسمبر ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔

(۱) ہمارے ذخیرہ خطوط میں مولانا سید عبدالحی صاحب کے دو خطوط ملے ہیں، جو محلہ باقر زئی شاہجہاں پور سے لکھے گئے ہیں، اور ان پر علی الترتیب ۶؍ربیع الاول ۱۳۲۳ھ (۲۳؍مئی ۱۹۰۴ء) اور ۲۳؍ربیع الثانی ۱۳۲۲ھ (۷؍جولائی ۱۹۰۴ء) کی تاریخیں پڑی ہوئی ہیں۔

''ایک عرصہ تک ندوۃ العلماء کا دفتر مولوی صاحب کے مکان واقع شاہجہاں پور میں رہا اور اس کے کارپرداز مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم بھی شاہجہاں پور میں فروکش رہے، مولوی صاحب نے تمام جزئیات وکلیات اور آمدنی کے مداخل و مخارج وسالانہ کارروائی اور مدرسین کی تقرری، طلبہ کی تعلیم ونوشت خواند، اوران کے خوردونوش اور رہنے سہنے سے متعلق نہایت خوش اسلوبی سے نگرانی کی تھی اور ندوہ کی ماتحتی میں ایک اسلامیہ مدرسہ جامع مسجد شاہجہاں پور میں قائم کردیا تھا، اوراس مدرسہ کی سرپرستی مولوی صاحب کے ہی متعلق تھی اوراس میں از حد دلچسپی لیتے تھے۔''(۱)

اسی زمانہ میں رسالہ ''الندوہ'' کا اجرا ہوا، جس کا دفتر شاہجہاں پور میں تھا، اور آگرہ کے مطبع ''مفید عام'' میں محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام میں چھپتا تھا اور دفترِ ندوۃ العلماء شاہجہاں پور سے روانہ کیا جاتا تھا، اور علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اس کے ایڈیٹر تھے، اور مولانا سید عبدالحی اس کے منیجر تھے، یہ سلسلہ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ مئی ۱۹۰۵ء تک جاری رہا، پھر پرچہ آسی پریس لکھنؤ میں چھپنے لگا۔

ذمہ داریوں کی تقسیم اور معتمدیوں کا قیام

۱۵؍صفر ۱۳۲۳ھ (۲۱؍اپریل ۱۹۰۵ء) کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا مسیح الزماں خاں صاحب نے استعفا پیش کیا، اوراس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ چونکہ وہ

(۱) حیات مسیح/ص/۱۶۹

تعلقاتِ وطن کی وجہ سے لکھنؤ میں قیام نہیں فرما سکتے (جو ندوۃ العلماء کی تحریک کا مرکز قرار پایا تھا اور وہاں دار العلوم کئی سال پیشتر سے قائم ہو چکا تھا) اس لئے وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، چونکہ اس وقت ندوہ کے حلقہ میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی، جو بیک وقت دینی و دنیوی وجاہت کی مالک ہو، سب ارکان کی معتمد علیہ بھی ہو اور اپنا پورا وقت ندوہ کی خدمت کے لئے دے سکے، اس لئے قرار پایا کہ نظامت کے کاموں کو تین معتمدیوں پر تقسیم کر دیا جائے۔

۱. باہر کے لوگوں سے خط و کتابت اور ان کو تحریک ندوہ کی طرف ملتفت کرنا، گویا معتمدی مراسلات و دفتر، یہ شعبہ مولانا سید عبدالحی صاحب کے سپرد ہوا، اور وہ معتمد قرار پائے۔

۲. صیغۂ مال، یعنی ندوہ کے مالی امور کا انصرام، مداخل و مخارج کی نگرانی اور بجٹ وغیرہ کی تیاری، یہ شعبہ منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوروی کے سپرد ہوا، وہ معتمد مال کہلائے۔

۳. دار العلوم کے تعلیمی مسائل کا انصرام، تعلیمی نگرانی اور طلبہ و مدرسین سے تعلق رکھنے والے امور کی انجام دہی، یہ شعبہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے سپرد ہوا، اور ان کو معتمد تعلیمات کا لقب دیا گیا، یہ بھی طے ہوا کہ ناظم جدید کے انتخاب تک مولانا خلیل الرحمٰن (۱) سہارنپوری بحیثیت نائب ناظم کے دستور العمل کی دفعہ/۶۰ کی رو سے نظامت کا کام

---

(۱) مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری (م ۶ر جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۶ر اپریل ۱۸۷۹ء) کے فرزند تھے، (جو اپنے دور کے مشہور ترین اساتذۂ حدیث میں تھے) ابتدائی تعلیم مدرسہ مظاہر العلوم میں پائی، ۱۲۹۱ھ ۷۴-۱۸۷۳ء کی روئداد مظاہر العلوم کے تقسیم انعامات کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے میر زاہد رسالہ میں امتیازی نمبر پائے تھے، تکمیل اپنے والد نامدار سے کی، اور والد کے انتقال کے بعد چوب عمارتی کا کاروبار شروع کیا، جس کا صدر مقام پیلی بھیت تھا، ندوۃ العلماء کی تحریک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کریں گے۔

دورِ انتشار واختلاف کا آغاز

یہ تقسیمِ عمل اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر اور حکمتِ عملی کی رو سے بظاہر

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کے ابتدائی دور ہی سے اس سے منسلک ہو گئے، اس کے اجلاس دوم منعقدہ شوال ۱۳۱۲ھ (اپریل ۱۸۹۵ء) میں (جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا) وہ شریک تھے، اور ان ارا کین مجلس انتظامی میں ان کا نام نظر آتا ہے، جو اس موقع پر منتخب ہوئے، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کے دور میں نائب ناظم تھے، ان کے استعفیٰ کے بعد ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں نائب ناظم باختیارات ناظم منتخب ہوئے، ۳۰؍جولائی ۱۹۱۳ء کو مستقل ناظم منتخب ہوئے، جس کا سلسلہ رمضان ۱۳۳۴ھ جولائی ۱۹۱۵ء تک جاری رہا، جب ان کی جگہ نظامت کے لئے مولانا سید عبدالحی صاحب کا انتخاب عمل میں آیا اور مولانا کا قیام سہارنپور رہنے لگا لیکن ان کی ہمدردی ودلچسپی ندوۃ العلماء کے ساتھ آخر تک قائم رہی، اور وہ مجلس انتظامی کے رکن رہے، ۱۳؍ذی قعدہ ۱۳۵۴ھ (۴؍فروری ۱۹۳۶ء) کو سہارنپور میں وفات پائی۔

مولانا خلیل الرحمٰن صاحب اپنی دینداری، وضعداری واستقامت میں قدیم علماء کی یادگار تھے، بیعت وارادت کا تعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے تھا، نہایت خوش اوقات، تہجد وجماعت کے شدت سے پابند تھے، رمضان المبارک میں بہت زیادہ تلاوت کا معمول تھا، (ایک روایت کے مطابق روزانہ ایک ختم کرتے تھے) افسوس ہے کہ ندوہ کے دورِ اختلاف میں علامہ شبلی کی مخالفت کی بناء پر (جو ان کے والد ماجد کے عزیز شاگرد تھے) ان کا تذکرہ ہندوستان کے متعدد باا ثر اسلامی جرائد میں اس طرح آتا رہا کہ ان کی خوبیوں پر پردہ پڑ گیا، اور وہ ایک جامد عالم اور غالی مخالفت کی حیثیت سے پیش کئے گئے جو ندوۃ العلماء کی ترقی اور اصلاح کی راہ میں سب سے زیادہ حائل تھا، لیکن مولانا مسعود علی صاحب مرحوم اور بعض دوسرے فضلائے ندوہ کا بیان ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی ذات کو بہت زیادہ مطعون کیا گیا تھا، ان نوجوان فضلاء کے ساتھ جو مخالفت میں پیش پیش تھے، ان کا رویہ مشفقانہ وبزرگانہ رہا اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ محبت وعنایت سے پیش آئے، تحریک خلافت کے بڑے پرجوش حامی اور معاون تھے، انہی کے صاحبزادے مولوی عقیل الرحمٰن ندوی سہارنپور کی خلافت کمیٹی کے روح رواں اور سکریٹری رہے، دوسرے صاحبزادے مولوی منظور النبی ندوی آخر تک خلافت اور بعد میں کانگریس کے ساتھ رہے، قدیم علمائے دیوبند کی طرح ان کو انگریزوں سے نفرت اور ان کی تعظیم واحترام سے بہت اجتناب تھا، راقم سطور نے خود ایک موقع پر ایک ایسا منظر دیکھا، جس سے ان کے دینی جذبات اور اسلامی حمیت کا اظہار ہوتا تھا، غالباً ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۴ء کا آخر یا ۱۹۳۵ء کا آغاز تھا، کہ وہ آخری بار ندوہ تشریف لائے، اتفاق سے وہی دن (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہت مناسب اور معقول تجویز تھی، لیکن اس کی کامیابی کے لئے دو شرطوں میں سے ایک شرط ضروری تھی۔

یا تو ان معتمدین اور قائم مقام ناظم میں مزاج و مذاق، خیالات و نظریات اور مقاصد کا ایسا اتحاد و اشتراک ہو کہ وہ جسم واحد اور ایک منظّم و متحد الخیال ٹیم کی طرح کام کر سکیں، اور اس تحریک کو پوری ہم آہنگی اور یک جہتی کے ساتھ آگے بڑھا سکیں، لیکن افسوس ہے کہ ندوۃ العلماء کے اساسی مقاصد پر متفق ہونے، دین وملت کی سربلندی اور علوم دینی کی ترقی کے مشترک جذبہ واخلاص و نیک نیتی کے ساتھ ان چاروں قابل احترام بزرگوں کی تعلیم وتربیت، سیرت و مزاج کی تشکیل، زندگی کے تجربوں اور جس ماحول میں انھوں نے زندگی کا معتدبہ حصہ گزارا تھا، نیز طریقِ فکر میں اتنا اختلاف اور تنوع پایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک خصوصاً جب اجمال سے تفصیل اور نظریہ سے عمل و تطبیق کا وقت آئے، تو یک جان دو قالب مجموعہ کی طرح ان کا کام کرنا دشوار تھا، اس پر مزید یہ کہ اسی تعلیم و تربیت کے اختلاف اور موروثی و طبعی اثرات سے ان کے مزاجوں میں حدت، لینت، میانہ روی اور تیز رفتاری، تحمل اور عدم تحمل اور اعتدال و انتہا پسندی کا وہ قدرتی اختلاف اور فرق بھی پایا جاتا تھا، جو افراد کے ہر انسانی مجموعہ میں پایا جاتا ہے، اور جس پر تاریخ میں چند مخصوص موقعوں ہی پر مقصد کے عشق اور ایثار و قربانی کے جذبہ نے فتح پائی ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کی آمد اور معائنہ کا تھا، وہ دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ انگریز ڈائرکٹر داخل ہوا، اس کے ساتھ چند مقامی ارکان انتظامی اور ندوہ کے عہدہ دار تھے، سب لوگ اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، لیکن مولانا نہ کھڑے ہوئے نہ ملتفت ہوئے، یہاں تک کہ اس کو اپنی اہانت محسوس ہوئی اور اس نے ترش لہجہ میں پوچھا کہ یہ بڑے میاں کون ہیں؟ منشی احتشام علی صاحب کاکوروی جو ہمراہ تھے، انھوں نے موقع محل کے لحاظ سے اس کی تاویل کی اور ڈائرکٹر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

۲. یا کسی ایسی باوقار وعظیم اور محبوب شخصیت کی موجودگی، جو ان تمام قدرتی اختلافات پر غالب آئے، اور ان مختلف المزاج ومتنوع صلاحیتوں کے افراد سے ایک مقصدِ واحد کے لئے کام لے سکے، ان کے اختلافات کو حدود سے متجاوز، اور مشترک مقصد کے لئے مضر وحارج نہ بننے دے، اور مختلف اجزاء کو ایک ایسے مجموعہ میں تبدیل کردے، جن میں سے ہر ایک دوسرے کا معاون وپشت پناہ ہو۔

یہ شخصیت مولانا سید محمد علی صاحب کی ہوسکتی تھی، جو اپنی روحانی تربیت وعلوئے باطن کی بنا پر بھی اور اس تحریک کے داعی اول ہونے کی حیثیت سے بھی، سب کے احترام کے مستحق تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ کچھ اپنی صحت کے روز افزوں انحطاط اور انقطاع ویکسوئی کے جذبۂ قاہر کے اثر اور چند تلخ تجربوں کے نتیجہ میں اس تحریک اور اس عظیم ادارہ کی قیادت وذمہ داری سے کنارہ کش ہوچکے تھے، اور کسی طرح اس ذمہ دارانہ حیثیت کو برقرار رکھنے پر آمادہ نہ تھے، انکے بعد مولانا مسیح الزماں خاں صاحب اپنی دینی ودنیوی وجاہت، معاملہ فہمی اور عمر وبزرگی کے لحاظ سے اس نازک ودشوار ذمہ داری کو بڑی حد تک نباہ سکتے تھے، چنانچہ ان کے دور نظامت میں کوئی انتشار واختلاف پیدا نہیں ہوا، لیکن وہ باصرار مستعفی ہوگئے۔

مولانا سید محمد علی صاحب کے بعد ارکان ندوہ میں سب سے زیادہ قابل احترام ہستی مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری کی تھی، جو اپنے سن وسال، علم وفضل، بے لوث اور بے داغ دینداری، سچی روحانیت اور اسی کے ساتھ زمانہ کے انقلاب وتغیر کے احساس اور جائز ومعتدل حد تک اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی آمادگی کے لحاظ سے ہر طبقہ کے لئے قابلِ اعتماد وقابلِ قبول تھے، وہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (جن سے اکثر وابستگانِ ندوہ ارادت وبیعت کا تعلق رکھتے تھے.) کے

خلفاء اور مقربین خاص میں سے تھے، ان کی زندگی خدمتِ خلق اور تبلیغِ حق کا ایک روشن نمونہ تھی، انھوں نے ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کے قیام کے کئی سال پیشتر اپنے وطن فتحپور میں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی تھی، جس میں زمانہ کی نئی ضرورتوں کو تسلیم کر کے نصاب و نظام میں تبدیلیاں کی گئی تھیں اور انگریزی زبان کی تعلیم کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا گیا تھا، وہ ہر طرح سے مولانا سید محمد علی صاحب کی قائم مقامی کے اہل تھے، لیکن اس میں دو رکاوٹیں تھیں، ایک تو یہ کہ وہ جدید طبقہ میں، جو اس تحریک کا دوسرا بازو تھا، اتنے روشناس اور معتمد علیہ نہ تھے جتنا ناظم ندوۃ العلماء کو ہونا چاہئے، اس سے بڑی دقت یہ تھی کہ وہ نظامت کے لئے کسی طرح آمادہ نہ تھے اور فتحپور کا قیام و کام ترک نہیں کر سکتے تھے، وہ اس تحریک میں آخر تک دل و جان سے شریک رہے، جلسۂ انتظامی کی مجلسوں کی صدارت کے لئے ندوۃ العلماء کی روئدادوں میں زیادہ تر انھیں کا نام نظر آتا ہے، انھوں نے بڑے نازک موقعوں پر اور بڑے انتشار کے زمانہ میں مجلس کی رہنمائی اور ندوہ کی مدد کی، لیکن وہ نظامت کا عہدہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور اس طرح ان کا نام اس سلسلہ میں خارج از بحث رہا۔

اپنے خداداد کمالات، غیر معمولی علمی و ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر، نیز قدیم و جدید سے واقفیت، اور نہ صرف ملک بلکہ اس وقت کی دنیائے اسلام میں معروف و روشناس ہونے کی بنا پر دوسرا نام علامہ شبلی نعمانی کا آتا ہے، ندوۃ العلماء کے مقاصد و ضروریات کا ایک اہم حصہ وہ ہے، جس کی نہ صرف تبلیغ و تشہیر بلکہ تکمیل کا فرض ارکان ندوۃ العلماء میں ان سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا، وہ سب علمی آستانوں سے منہ موڑ کر اور سب کشتیاں جلا کر، بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ کے "ندوہ کے آستانہ پر آکر بیٹھ گئے تھے اور انھوں نے بقیہ زندگی اس کے لئے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا،

ندوۃ کی بڑی خوش قسمتی ہوتی کہ وہ اس کشتی کے (جو قدیم وجدید کے درمیان ہچکولے لے رہی تھی) تنہا ملاح قرار پاتے اور اس تحریک کو منزلِ مقصود تک پہنچاتے لیکن ان کے ساتھ دو دقتیں تھیں۔

ایک تو یہ کہ ندوۃ کی تحریک کا اصل خمیر دین، شریعت وسنت سے تیار ہوا تھا، ابتدائی داعی پھر اس کے موئید ومعاون سب کے سب طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے، ان سب کے اندر یہ جذبہ کام کر رہا تھا، کہ اس تحریک ودعوت اور اس دار العلوم کی تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں جو فضلاء تیار ہوں، وہ اگر ایک طرف اپنی روشن دماغی، وسعتِ نظر، حقیقت پسندی اور قائدانہ صلاحیتوں میں زمانہ کے نباض اور عصر حاضر کے اداشناس ہوں، تو دوسری طرف وہ اپنی ذاتی زندگی، سیرت واخلاق اور تعلق مع اللہ میں امت کے لئے نہ صرف قابلِ اعتماد، بلکہ لائقِ تقلید اور عملی نمونہ ہوں۔

ادھر دقت یہ تھی کہ علامہ شبلی جو عرصہ دراز تک علی گڑھ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے چکے تھے، اور فطرتاً نہایت ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور جن کو سوئے اتفاق سے کسی روحانی ماحول میں زیادہ دن رہنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان علماء کے (جو اس دورِ انتشار میں قدیم وجدید اور دین ودنیا میں توازن قائم رکھنے کے لئے محکم روحانی تربیت اور گہرے تعلق مع اللہ کو ضروری سمجھتے تھے۔) نزدیک اس معیار پر نہیں تھے، کہ آنکھ بند کر کے طلبہ کی تعلیم وتربیت اور ندوۃ کی تحریک ودعوت تنہا ان کے حوالہ کر دی جائے، علماء کی اس دقت کو علامہ شبلی کے صحیح جانشین اور فاضل سوانح نگار حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی ذہانت کے ساتھ محسوس کیا اور بڑی جرأت کے ساتھ اس کا ''حیات شبلی'' میں اظہار فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''پھر اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی واتقا

اور مذہبی تورع اور تقدس، جو علمائے دین کا خاصہ ہے، نہیں تھا، اور اس لئے ان علماء کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا اور اس بنا پر وہ طلبہ کے لئے ان کی تعلیم وصحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے۔

مولانا کی تصنیفات میں ''علم کلام'' اور ''الکلام'' ایسی دو کتابیں تھیں، جو مصنف کی ہزار ہا احتیاطوں کے باوجود علماء کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں، ان کے بعض مباحث ٹھیٹھ مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے، اس لئے علماء کی ایک جماعت جو متکلمین کی آراء و تحقیقات سے بے خبر تھی، ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے ان کو موزوں نہیں سمجھتی تھی'' (۱)

مزید برآں یہ کہ اپنے پچھلے تجربوں کی روشنی میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت، وسیع مطالعہ اور جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان طویل قیام، پھر افتادِ طبع کی بنا پر جو انسان کے لئے اختیاری امر نہیں ہے، ان میں اپنے تعلیمی نظریات پر اس درجہ اعتماد، اپنے مقاصد سے اس درجہ شغف، اور ان کے حصول کے لئے ایسی بیتابی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا، جو ان کو بار بار ان حدود پر قائم رہنے سے باز رکھتا تھا، جو اس تقسیم عمل کی تجویز نے کھینچ دیئے تھے اور وہ ان نزاکتوں اور رعایتوں کو ہر وقت ملحوظ نہیں رکھ سکتے تھے، جو ایک ایسے اجتماعی کام کے لئے جس کا تعلق کئی ذمہ داروں اور مختلف شعبوں سے ہو ضروری ہیں، نتیجہ یہ تھا کہ ان کے بہت سے رفقاء اور شرکائے کار کو (صحیح یا غلط طریقہ پر) ان کے متعلق جذبۂ تفوق، احساس برتری، دوسروں کی حق تلفی اور تحقیر کا شبہ ہونے لگتا

---

(۱) حیات شبلی/ص/۶۳۸

تھا، جس میں ان کی نیت اور ارادہ کو کم اور ان کے جذبہ و جوش اور ان کے طرزِ گفتگو اور طرزِ تحریر کو زیادہ دخل تھا، بہر حال اس کو واقعات کا قدرتی نتیجہ کہا جائے یا ندوہ کی بدقسمتی، کہ ان کے اور ندوہ کے دوسرے ارکان و معتمدین کے درمیان اعتماد و اتحاد کی وہ فضا برقرار نہیں رہی، جس میں ان کی منفرد اور مستثنیٰ صلاحیتوں اور ان کے یگانہ علمی و ذہنی کمالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور ملت کو پہنچایا جاسکتا، ذلك تقدير العزيز العليم.

علامہ شبلی کے بعد علمی و عملی جامعیت، سلامت روی اور طبیعت کے سلجھاؤ اور ندوہ کے مقاصد سے ذہنی ہم آہنگی کے اعتبار سے دو اور شخصیتوں پر نظر پڑتی تھی، ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، رئیس بھیکن پور ضلع علی گڑھ، دوسرے مولانا سید عبدالحی صاحب معتمد دفترِ ندوۃ العلماء، یہ دونوں شروع سے ندوہ کی تحریک میں شرکت اور اس کے کاموں میں پیش پیش تھے اور ان کی جامعیت کا دوسرا آدمی دور دور نظر نہیں آتا تھا، لیکن مولانا شیروانی خاندانی رئیس، ایک بڑے جاگیردار اور لکھنؤ سے دور ضلع علی گڑھ میں رہتے تھے، ان کا یہی بڑا ایثار تھا کہ وہ ندوہ کی مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اس کے لئے دور دور کا سفر کرتے تھے، اس کے مفوضہ کاموں کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، لیکن وہ اس کی نظامت کا عہدہ سنبھالنے کے لئے تیار نہ تھے، اور اپنی ریاست کا انتظام اور حبیب گنج کا قیام چھوڑ کر لکھنؤ میں قیام کے لئے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔

رہے مولانا سید عبدالحی صاحب، تو وہ اگرچہ سب سے معتمد علیہ اور سب سے ملکر کام کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن ایک تو طبعاً نہایت کم آمیز اور کم سخن واقع ہوئے تھے، دوسرے عمر میں اکثر ارکان ندوۃ العلماء سے چھوٹے (۱)

---

(۱) وہ علامہ شبلی سے ۱۳؍سال چھوٹے تھے۔

اور ملک میں کم روشناس تھے، اس وقت تک ان کا کوئی ایسا علمی کارنامہ اور تصنیف بھی سامنے نہ آئی تھی، جس سے اس منصب رفیع کے لئے ان پر نظر پڑتی، ان کے سن وسال اور ان کے مزاج ومذاق، نیز ان کی آئندہ کامیابیوں کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ ابھی معاون ومعتمد کی حیثیت سے کام کریں اور جب ان کی خداداد صلاحیتیں منظر عام پر آجائیں، میدان معمر بزرگوں سے خالی ہو اور ایک ایسی معتدل اور جامع شخصیت کی ضرورت ہو، جو دونوں متقابل گروہوں کے درمیان قابل اعتماد سمجھی جاتی ہو، تو وہ اس نازک اور عظیم ذمہ داری کو سنبھالیں، اور اس تحریک کو، جس پر کم سے کم طبقۂ علماء کی سب سے بہتر قلبی وذہنی صلاحیتیں صرف ہوئی تھیں اور جو ربع صدی کی جدوجہد اور قربانی کا نتیجہ تھی، ختم ہونے سے بچالے۔

ان حالات وحقائق کے پیش نظر اس وقت سب سے زیادہ معقول ومعتدل حل یہی سمجھا گیا کہ ذمہ داریاں تقسیم کردی جائیں اور بجائے ایک ناظم عمومی کے ایک نائب ناظم اور تین معتمد ہوں، اور کام باہمی اعتماد وشورائیت کے ساتھ انجام دیا جائے، لیکن اس میں ایک ایسی کمزوری تھی جس کو آئندہ کے تجربوں نے نمایاں کیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کی طرف بڑی خوبی کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”یہ ایک ایسا انتظام تھا، جس میں وحدت کا سررشتہ گم تھا، یہ تینوں نہریں الگ الگ بہتی تھیں، یعنی تینوں چل کر پھر کہیں ایک نہیں ہوتی تھیں، اور کسی ایک شخص کے ہاتھ میں طاقت آکر سارے کاموں میں اشتراک اور اتحاد نہیں پیدا ہوتا تھا۔“ (۱)

---

(۱) حیات شبلی/ص ۶۳۷

علامہ شبلی کا دورِ معتمدی اور دار العلوم میں قیام

عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسا شخص، جو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہو اور تعلیم وتدریس کا عملی تجربہ رکھتا ہو، اسی کے ساتھ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان کو مناسب طریقہ پر نشوونما دینے، اور ان میں صحیح علمی ذوق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، دار العلوم میں مستقل قیام کرے، اساتذہ وطلباء سے اس کا براہ راست ربط ہو، اور وہ ان کے اور مجلسِ انتظامی کے درمیان رابطہ کا کام دے، علامہ شبلی معتمد دار العلوم منتخب ہوئے تھے، اپنے عہدہ کے لحاظ سے بھی اور اپنی یگانہ صلاحیتوں اور علمی امتیاز کی بنا پر بھی، وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، اس لئے انھیں سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کریں، وہ جب سے علی گڑھ سے یکسو اور حیدر آباد کے تعلق سے بددل ہوئے تھے اور ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کو انھوں نے اپنی تمناؤں کی تکمیل کا سب سے موزوں میدان سمجھا تھا، خود ان کی بھی خواہش تھی کہ وہ یہیں آکر بیٹھ جائیں اور اپنی ساری صلاحیتیں اسی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کردیں، جو ان کے فکر ونظر کے بھی مطابق تھا اور ان کی تعلیم وتربیت اور ذوق ورجحان کے بھی، ان کو اپنے کو کلی طور پر یکسو کرنے کے لئے کچھ وقت لگا، لیکن بالآخر صفر ۱۳۲۳ھ (اپریل ۱۹۰۵ء) میں وہ باقاعدہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے دار العلوم کی عمارت (خاتون منزل، گولہ گنج) میں منتقل ہوگئے، اور باقاعدہ قیام شروع فرمادیا۔

علامہ شبلی کے دار العلوم میں مستقل طور پر آجانے سے طلباء میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، ان کی طاقتور اور دلآویز شخصیت طلباء کے سامنے حضر راہ بن کر آئی،

ان میں مطالعہ، مضمون نگاری اور تقریر کا ذوق پیدا ہونے لگا، مطالعہ میں تنوع اور معلومات میں وسعت پیدا ہوئی، ان کی مجلسیں جو علمی مسائل، کتابوں اور مصنفین کے تذکرے، کلامی وتاریخی مباحث اور شعر وسخن اور ادبی چاشنی سے کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں، ہونہار طلباء کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں، اس کا نتیجہ تھا کہ ذہین وحوصلہ مند طلباء جو یوپی اور بہار کے پرانے علمی خاندانوں اور آسودہ حال گھرانوں سے ندوہ کو قدیم وجدید علوم کی ایک جامع درسگاہ سمجھ کر آئے یا بھیجے گئے تھے، ان کے گرویدہ اور عقیدتمند ہونے لگے اور مولانا کی بھی ان نوجوانوں پر، جن کو وہ جوہر قابل سمجھتے تھے، تربیت وعنایت کی خاص نظر رہتی اور ان کی اندرونی صلاحیتوں کو ابھارنے اور پروان چڑھانے میں مصروف رہتے، کسی سے مضمون لکھواتے، کسی کو تقریر کے لئے تیار کرتے، کسی کو مطالعہ کا مشورہ دیتے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندوی، مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی (ایم.اے.علیگ وانسپکٹر مدارس عربیہ) مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، اور خود مولانا ابوالکلام آزاد، (جو ندوہ کے طالبعلم کبھی نہیں رہے، لیکن ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے دارالعلوم کی اسی عمارت میں مقیم اور مولانا کی علمی وادبی مجلسوں کے مستقل شریک وحاضر باش تھے) مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، حاجی معین الدین ندوی وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں، جو اپنی اپنی فطری صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق نمایاں ونامور ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے دائرہ کار، اس کے جلسوں کی رونق اور اس کے دارالعلوم کی توسیع وترقی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا، رسالہ ''الندوہ'' کے وقار واعتبار (جو اس دور کا سب سے بلند پایہ علمی ودینی رسالہ سمجھا جانے لگا تھا) اور دارالعلوم کی شہرت میں بھی ترقی ہوئی، اشاعت اسلام کی تحریک (جو شروع سے ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد

میں شامل تھی) میں بھی کچھ جان پیدا ہوئی، کچھ ایسی تجویزیں بھی ندوۃ العلماء کے جلسوں اوراس کے اسٹیج پر آئیں، جن سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ ندوہ کی تحریک صرف ایک درسگاہ کے حدود میں محدود نہیں، بلکہ اس کا مسلمانوں کی پوری ملّی زندگی سے تعلق ہے، مثلاً وقف علی الاولاد کے قانون کی ترتیب اوراس کے منظور کرانے کی کوشش، قرآن مجید کے تراجم پر اصلاحی وعلمی نظر، انگریزی کے ایک مستند ترجمۂ قرآن کی تکمیل، سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا ندوۃ العلماء کی نگرانی میں انتظام، نماز جمعہ کے لئے مسلمان ملازموں کو چھٹی دیئے جانے کی تجویز وغیرہ وغیرہ، جس کے تخیل میں بلاشبہ علامہ شبلی کا وسیع اور بلند حوصلہ ذہن پیش پیش تھا۔

دوسری طرف دارالعلوم نے بھی (اس زمانہ کے حالات وماحول کے لحاظ سے) ترقی کے کئی قدم آگے بڑھائے، ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ نے پانچ سو روپے ماہوار کی امداد مدرسہ کی دنیاوی تعلیم کے لئے منظور کی، بھوپال اور بعض ریاستوں سے ماہانہ امدادیں مقرر ہوئیں، متعدد لائق ونامور اساتذہ اور ماہرین تعلیم قدیم کا بحیثیت صدر مدرس یا استاد فن کے تقرر ہوا، جن میں مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی، مولانا سید شیر علی صاحب (جو بعد میں صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ہوئے) شیخ محمد طیب مکی رامپوری اور مفتی عبداللہ ٹونکی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جدید نصاب کا اجرا اور انگریزی تعلیم کا انتظام ہوا، دارالعلوم کے لئے گورنمنٹ نے ایک وسیع آراضی عطا کی اور درسگاہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا، ایک شاندار جلسۂ سنگ بنیاد منعقد ہوا، جس میں حکام اور ہر طبقہ کے عمائدین نے شرکت کی، والی ریاست بھاولپور نے تعمیر کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا شاہانہ عطیہ دیا، ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا وہ تاریخی اجلاس ہوا، جس کی صدارت کے لئے علامہ سید رشید رضا مصر سے آئے اور پورے

ملک میں اس کا چرچا ہوا، یہ وہ سب کام تھے جن کی تکمیل میں علامہ شبلی شریک غالب تھے، اور ارکانِ ندوۃ العلماء و معتمدین کا تعاون ان کی کامیابی کا ضامن اور ذمہ دار تھا۔

دورِ اختلاف وانتشار

قدیم وجدید اور دین و دنیا کی ہم آہنگی اور رفاقت، اصولی ونظری حیثیت سے خواہ کتنی ہی ضروری، اور اسلام کی جامعیت و ابدیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قابلِ عمل اور ممکن ہو، ایک ایسا نازک کام ہے، جس کے لئے غیر معمولی احتیاطوں کی ضرورت ہے، کسی ایک پہلو کا پلڑا ذرا سا بھاری ہوا اور کسی ایک پہلو سے ذرا سا اغماض برتا جائے، تو دوسرا مقابل پہلو آسانی کے ساتھ دوسرے پہلو کو دبا لیتا ہے اور جیسا کہ فطرت انسانی اور جماعت انسانی کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے، غالب مغلوب کے ساتھ اور فاتح مفتوح کے ساتھ رعایت نہیں کرتا، ایک ایسے زمانہ میں یہ عمل اور بھی دشوار ہو جاتا ہے، جب جدید علوم اور مادی ترقی کی پشت پر ایک مضبوط اور صاحبِ اقبال حکومت، ایک جواں سال اور نوخیز تہذیب، جدید علوم وفنون اور مادی ترغیبات کا پورا لشکر ہو، اور طبیعتوں کے اندر خود ان کا اثر قبول کرنے کی پرزور خواہش اور بے پایاں جذبہ پایا جاتا ہو، اس وقت قدیم تعلیم اور دینی جذبات کو ان کا اصل مقام عطا کرنے اور ان کی گرفت قائم رکھنے کے لئے غیر معمولی روحانیت، کیمیا اثر صحبت اور نفسِ گرم اور قلبِ بے تاب کی ضرورت ہے، ورنہ اس عالمِ اسباب میں جدید کا قدیم پر، اور دنیا کا دین پر فتح پالینا، قانون فطرت اور تقاضائے عقل ہے۔

اسی طرح حریتِ فکر کی دعوت اور تنقید و احتساب کا کام بھی اتنا ہی نازک اور پیچیدہ ہے کہ اگر اس کے ساتھ سلف اور پیشرووں کی عظمت، ان سے محبت، اعلیٰ

درجہ کی استقامت، عمل وعبادت کا جذبہ اور ذوق، اور غایت درجہ کی تواضع وانکسار نہ ہو، تو اس عمل (تنقید واحتساب) اور اس دعوت حریتِ فکر کے ساتھ ایسے مفاسد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جو بعض اوقات ذہنی بغاوت وانارکی یا کم سے کم بے عملی وتعطل تک پہنچا دیتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی فکری واصلاحی تاریخ میں اس فریضہ کے انجام دینے والے اگر متقی، زاہد وعابد اور صاحبِ باطن وصاحبِ نسبت تھے، تو باوجود اس کے کہ انھوں نے عمل جراحی کا پورا فرض انجام دیا اور انھوں نے پوری جرأت وبیباکی کے ساتھ تنقید وتنقیح اور جرح وتعدیل کا کام کیا، لیکن ان سے ان کے زمانہ میں یا ان کے بعد کے زمانہ میں نہ تشکک وارتیاب کی کوئی لہر پیدا ہوئی، نہ طبیعتوں میں بے قیدی وآزادی آئی، نہ عمل وعبادت کا جذبہ سرد ہوا، نہ ان کے معتقدین میں فرائض سے غفلت اور تساہل پایا گیا، اس سلسلہ میں امام ابوالحسن اشعری، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، علامہ عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ صاحب کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح عوام بھی اسی وقت کسی جدید خیال، نئی تحقیق اور مسلکِ عام اور قولِ مشہور سے علاحدگی کو گوارا اور برداشت کرتے ہیں، جب اس کے ساتھ نمایاں دینی زندگی، ذوقِ عبادت اور زہد وتقویٰ کی شان ہو، علامہ شبلی (جن سے زیادہ ان کے معاصرین میں شاید کسی کی نظر تاریخِ اسلام پر اتنی وسیع وعمیق ہوگی) نے بڑی خوبی اور صاف گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف اور تاریخ کے اس نکتہ کو بیان کیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ ''حیاتِ شبلی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک زمانہ تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بہت سے علماء اور ائمہ گزرے ہیں، جن کے بہت سے خیالات اور نظری

عقائد جمہور علماء سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے، یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے، اور لوگ ان کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات ان کے زہد وعبادت واتقاء کے ساتھ تھے، اس لئے وہ مقبول تھے، اور یہاں یہ کیفیت نہیں۔"(۱)

بہر حال مولانا کے قیام کے کچھ ہی عرصہ بعد طلباء میں، جوزیادہ تر یہ سمجھ کر ندوہ میں آئے تھے، کہ وہ ایک خالص قدیم مدرسہ نہیں بلکہ ایک ایسی تعلیم گاہ ہے، جہاں زمانہ کے جدید تقاضوں کے مطابق علماء تیار کئے جائیں گے، اور جو اخبارات ورسائل اور ہر قسم کے خیالات ومضامین سے آشنا ہو رہے تھے اور جدید تعلیم وتہذیب کے ایک مرکز کے عین وسط میں رہتے تھے، پھر علامہ شبلی کی مجلسوں اور صحبتوں نے ان کے ذہن وطبیعت میں ایک جولانی اور تموج پیدا کر دیا تھا، نئے اثرات کا ظہور اور دینی فرائض وشعائر سے کچھ بے پرواہی اور تساہل نظر آنے لگا، جس پر وہ اساتذہ وعلماء قابو نہیں پا سکتے تھے، جن میں سے کوئی تقریر وتحریر اور وسعتِ معلومات میں نہ علامہ شبلیؒ کا ہم پلہ تھا اور نہ ان کی طرح طلباء میں مانوس ومحبوب، اس تساہل پر (جس کو وہ خود ہرگز پسند نہ کرتے ہوں گے) ان کا اپنی پوری توجہ مرکوز کرنا اور طلباء میں دینی روح ومذہبی پابندی پیدا کرنا، نہ ان کے افتادِ طبع سے کچھ زیادہ مناسبت رکھتا تھا، نہ ان کے علمی مشاغل اور ذہنی استغراق کے ساتھ آسانی کے ساتھ ممکن تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شکایت واحساس مدرسہ کی حدود سے نکل کر معتمدین ومقامی ارکان تک پہنچا، پھر ان سے نکل کر ندوہ کے بہی خواہوں اور ہمدردوں میں پھیلنے لگا، اس نے رفتہ رفتہ ایک

(۱) دیباچہ حیات شبلی/ص/۴۱۔

مسئلہ کی صورت اختیار کرلی، جس کی حدت وشدت میں ممکن ہے، بعض ارکان کے ذاتی جذبات واحساسات بھی شامل ہوں، جلسۂ انتظامیہ کی کارروائیوں کے رجسٹر میں ۲۴ر جولائی ۱۹۱۰ء (۱۶ر رجب ۱۳۲۸ھ) کے جلسہ کی روداد میں، ہم کو پہلی مرتبہ یہ الفاظ نظر آتے ہیں:

''مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نے شکایت کی کہ مولانا شبلی صاحب کی معتمدی سے پہلے دارالعلوم میں دینی رجحان زیادہ تھا، اس میں کمزوری پیدا ہوگئی۔''

انھوں نے معتمدی میں تبدیلی کا مشورہ دیا۔

پھر ۲۴ر ذی قعدہ ۱۳۲۸ھ، ۲۷ر نومبر ۱۹۱۰ء کو طلبائے دارالعلوم کی اسٹرائک کا ذکر آتا ہے، جو اس نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، اور اس اندرونی رجحان کی غمازی کرتا تھا، جو طلباء کے اندر پرورش پا رہا تھا۔

اسی سنہ کے کسی جلسہ میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نے تجویز پیش کی، کہ دارالعلوم کے طلباء کی مذہبی حالت کی تحقیق وتفتیش کے لئے ایک کمیشن بٹھایا جائے، علامہ شبلی اس تجویز پر خاموش رہے اور جلسۂ انتظامیہ نے اس کو منظور کرلیا، مولانا کو اس تجویز سے ناگواری اور اہانت محسوس ہونا، قدرتی تھا، اور کشاکش اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی، مولانا اور بعض دوسرے ارکان نے باہمی اعتماد اور خوشگواری کی فضا بحال کرنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی، خوش قسمتی سے خود علامہ شبلی کا ایک خط، جو انھوں نے مولانا سید عبدالحی صاحب کو لکھا ہے اور جس سے اس مخلصانہ خواہش وکوشش کا اظہار ہوتا ہے، پرانے کاغذات میں مل گیا، اس پر مولانا سید عبدالحی صاحب، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نائب ناظم، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی

اور منشی احتشام علی صاحب کاکوروی کی رائیں درج ہیں، وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''جناب مولانا سید عبدالحی صاحب!

یہ امر اب مخفی نہیں رہا کہ ارکانِ ندوہ میں سخت ناچاقی ہے، جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جس کا برا اثر اب علانیہ پڑنے لگا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے، کہ کبھی آج تک یہ قصد نہیں کیا گیا کہ ناراض اصحاب آپس میں بیٹھ کر شکایتوں کا باہم اظہار کریں اور جس کی شکایت ہے، وہ اپنا جواب پیش کرے، مجھ کو یقین ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور بہت سی شکایتیں رفع ہوگئی ہوتیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں میں کوئی خاندانی عداوت نہیں ہے، اس لئے ذاتی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں، ہم لوگوں کو رُو در رُو تمام شکایتوں کو حل کر لینا چاہئے اور ایک طریقۂ کارروائی آئندہ کے لئے منضبط کر لینا چاہئے، اس بنا پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ دو تین دن کے اندر تمام معتمدین اور نائب ناظم صاحب کو ایک معین وقت میں تشریف لانے کی تکلیف دیں، میرا خیال ہے کہ صلح سے لڑائی کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوسکتی ہے، جو قوت آپس کی مخالفت میں کئی سال سے صرف ہو رہی ہے، یہ ندوہ کی ترقی اور قوت میں صرف ہوگی۔''

شبلی

۷؍نومبر ۱۹۱۰ء

(۴؍ذی قعدہ ۱۳۲۸ھ)

یہ یاد داشت، خدمت میں جناب منشی احتشام علی صاحب ومولانا خلیل الرحمٰن صاحب ومولانا شاہ سلیمان صاحب کے مرسل ہو، جو تاریخ مناسب سمجھیں مقرر فرمادیں۔

فقط

عبدالحی

بارہا گفتگو ہوئی مگر عمل کی کمی سبب ہے، مگر ہم ہر وقت تیار ہیں، سب سے پہلے مولانا خلیل الرحمٰن صاحب اور مولوی شاہ سلیمان صاحب کے پاس جاوے، میں جب لکھنؤ میں موجود ہوں، ہر وقت حاضر ہوسکتا ہوں، ہفتہ واتوار کو شاید میں شریک نہ ہوسکوں، کیونکہ شاید میں الہ آباد میں ہوں۔

فقط

(دستخط) محمد احتشام علی

۹رنومبر ۱۹۱۰ء (۶رذی قعدہ ۱۳۲۸ھ)

مجھ کو کوئی عذر نہیں، ۱۵رنومبر ۱۹۱۰ء بوقت ایک بجے دن کے (کارخانہ) میں منشی احتشام علی صاحب کے جمع ہوں، اس سے زیادہ تخلیہ اور جگہ نہ ہوگا۔

(دستخط) محمد خلیل الرحمٰن

۹رنومبر ۱۹۱۰ء (۶رذی قعدہ ۱۳۲۸ھ)

ذلك كنا نريد، فيا شبلي جزاك الله خيرا.

کتبہ، محمد سلیمان القادری الچشتی

یہ تو نہیں معلوم ہوسکا کہ اس مجلس کی نوبت آئی یا نہیں اور اس کا کچھ خاطر خواہ نتیجہ نکلا، لیکن سید صاحب نے حیات شبلی میں لکھا ہے:

> ''بالآخر باہمی کشاکش کا خاتمہ اس طرح ہوا، کہ کرنل عبدالمجید خاں بہادر فارن منسٹر ریاست پٹیالہ نے، جو اس وقت ندوہ کے مربی خاص اور ندوہ کے بڑے محسن تھے اس طرف خاص طور پر توجہ کی اور ان کے سامنے ایک انتظامی جلسہ میں لوگوں نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کر کے مصالحت کی، اور باہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔'' (۱)

لیکن اختلاف کی اندرونی و بیرونی بنیادیں اب بھی موجود تھیں، اندرونی سے مراد طبیعتوں، ذوق و رجحانات کا اختلاف، جو نتیجہ تھا گزشتہ ماحول، صحبتوں اور زندگی کے تجربوں کا، اور بیرونی اختلاف ایک بڑے دینی طبقہ اور کثیر التعداد علماء سے تعلق رکھتا تھا، جو اب بھی علامہ شبلی نعمانیؒ کو (ان کے ذہنی و علمی کمالات کے ساتھ) دینی حیثیت سے مشکوک نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ان کے عقائد کے بارے میں اب بھی کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے اور اس وجہ سے کہ اب وہ در و بست ندوہ پر حاوی، اس کی تعلیمی پالیسی کو وضع کرنے والے اور طلباء کی سیرت و مزاج کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر ہیں، ندوہ اور دارالعلوم کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے، اور متعدد قدیم علماء، جن کا ملک میں اچھا خاصا اثر تھا، اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے، اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ بعض ارکانِ ندوہ، جن میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب (جو حضرت مولانا احمد علی صاحب (۲)

---

(۱) حیات شبلی/ص ۴۴۲

(۲) ہندوستان کے دور آخر کے اکثر حنفی علماء، حدیث میں حضرت مولانا احمد علی صاحب کے شاگرد تھے، خود علامہ شبلیؒ کو بھی ان سے تلمذ تھا۔

محدث سہارنپور کے فرزند تھے اوراس کی وجہ سے قدیم علمی ودینی حلقوں سے زیادہ ان کا سابقہ پڑتا تھا) دینی حلقوں میں ندوہ کی شہرت واعتماد بحال کرنے کے لئے اور ندوہ کی خیرخواہی میں (غلط یا صحیح طریقہ پر) خلوص ونیک نیتی کے ساتھ اس کی کوشش کررہے ہوں، کہ علامہ شبلی اور ندوہ جس طرح لازم وملزوم سمجھے جانے لگے ہیں، اس میں تبدیلی ہو، اور مولانا محض ایک رکن انتظامی کی حیثیت سے بدستور ندوہ کی خدمت کرتے رہیں، اور ندوہ ان کے مشوروں اور تجربوں سے اسی طرح فائدہ اٹھائے جیسے دوسرے مؤقر ارکانِ انتظامی کے مشوروں اور تجربوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

علامہ شبلی کا معتمدی سے استعفا

یہ قاعدہ ہے کہ جب طبیعتوں میں بے اعتمادی پائی جاتی ہے اور ذہنی اختلاف ہوتا ہے، تو کوئی ایک واقعہ آگ پر تیل کا کام دیتا ہے، ''الندوہ'' کے ایک شمارہ میں جو ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء کے آخر میں شائع ہوا، (اور وہ جون ۱۹۱۲ء کا شمارہ تھا) مولوی میر عبدالکریم صاحب (۱) مدرس دارالعلوم، جو اس وقت ''الندوہ'' کے مدیر بھی تھے، کا ایک مضمون جہاد پر شائع ہوا، ندوہ حکومت کی نظر میں مشتبہ رہ چکا تھا اور اسی وجہ سے اس کے ایک مخلص کارکن منشی اطہر علی صاحب ترکِ وطن کرکے مدینہ طیبہ چلے گئے تھے، جہاں انھوں نے وفات پائی، اس مضمون کے سلسلہ میں ارکانِ ندوۃ العلماء کے درمیان نقطۂ نظر کا اختلاف تھا اور اس سلسلہ میں انتظامی وسیاسی مصلحتوں سے جو

(۱) مولوی میر عبدالکریم صاحب ضلع ہزارہ کے رہنے والے، بہت قوی الاستعداد وفاضل استاد اور نہایت صالح و باحمیت عالم تھے، کچھ عرصہ حیدرآباد میں تدریس کی خدمت انجام دی، پھر غالباً مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کی تحریک سے شاہجہاں پور کے مدرسہ عین العلوم میں استاد مقرر ہوئے غالباً ۱۹۰۵ء ۱۳۲۳ھ میں فقیہ اول کے عہدہ پر دارالعلوم میں تقرر ہوا، عیسائیوں اور آریوں سے مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس میں بہت کامیاب تھے، جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ اپریل ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میں لُو لگ جانے سے وفات پائی۔ (مستفاد حیات شبلی وغیرہ)

کارروائی کی گئی تھی اس میں ان کو کچھ آئینی سقم نظر آئے، جس کی حقیقت کا معلوم کرنا اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد جب کہ دیکھنے والوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں، بہت دشوار ہے، بہرحال اس واقعہ نے باہمی اختلاف کو اور نمایاں کر دیا اور بعض اخبارات نے اس کو ہوا دی، اور علامہ شبلی کی بددلی اور بڑھ گئی، چنانچہ جلسہ منعقدہ ۱۴؍شعبان ۱۳۳۱ھ، ۱۹؍جولائی ۱۹۱۳ء میں مولانا نے معتمدی سے اپنا استعفا پیش کر دیا، منشی احتشام علی صاحب معتمد مال اور مولانا سید عبدالحی صاحب نائب ناظم نے بھی استعفا پیش کیا، کثرتِ آراء سے منشی احتشام علی اور علامہ شبلی کے استعفے منظور ہو گئے اور مولانا سید عبدالحی کے استعفا پر غور ملتوی کیا گیا، (۱) اگلے دن ۲۰؍جولائی ۱۹۱۳ء کے جلسہ میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب ناظم منتخب ہوئے، (۲) مولانا سید عبدالحی صاحب اور منشی احتشام علی صاحب عہدوں کے لحاظ سے نائب ناظم مقرر کئے گئے۔

طلباء کی اسٹرائک اور ملک میں بے چینی

علامہ شبلی کے استعفے کا طلباء پر جو ردعمل ہوا، وہ بالکل قدرتی تھا، پہلے سب نے ایک جلسہ کر کے مولانا کو جو اس وقت بمبئی میں تھے، پے در پے کئی تار بھیجے، جن میں ان سے استعفے کی واپسی کی درخواست کی گئی تھی، لیکن مولانا اپنے عزم پر قائم رہے، انھوں نے بدستور ایک رکن کی حیثیت سے ندوہ کی خدمت کرتے رہنے کا وعدہ کیا، مولانا ۹؍محرم ۱۳۳۲ھ، ۸؍دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ تشریف لائے اور مارچ تک وہیں قیام فرمایا، طلباء کا مولانا سے رابطہ بدستور قائم تھا اور وہ ان سے استفادہ کرتے تھے، مارچ میں طلباء نے مولانا کے استعفے پر اپنی ناگواری اور مولانا کے ساتھ اپنے جذبۂ عقیدت کے اظہار کے لئے اسٹرائک کر دی۔

یہ ندوہ کی وہ تاریخی اسٹرائک ہے، جس نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ

(۱) فرد کارروائی، قلمی محفوظہ جلسہ انتظامی دفتر ندوۃ العلماء۔ (۲) ایضاً۔

کرلیا، اور وہ اس وقت کے تعلیم یافتہ حلقوں کا ایک زندہ اور سنجیدہ مسئلہ بن گیا، ملک کے متعدد کثیرالاشاعت اور آزاد خیال پرچوں نے جو نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے، اس اسٹرائک کو ایک قومی وملّی مسئلہ بنادیا، ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، مسلم گزٹ لکھنؤ، الہلال کلکتہ کے صفحات گویا علامہ شبلی کی حمایت اور طلباء کی ہمدردی کے لئے وقف تھے، سب سے بڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کے آتش ریز اور طوفان خیز قلم نے ایک ہلچل مچارکھی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ عالم اسلامی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا ہے، اور ملت اسلامی کا عروج وترقی ندوہ کی اصلاح پر موقوف ہے، جس کی راہ میں چند استبداد پسند اور قدامت پرست علماء حائل ہیں، ملک میں جابجا جلسے ہورہے تھے، جن میں ندوہ کی اصلاح اور طلباء کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔

اسی زمانہ میں طلبائے قدیم کی مجلس کی بنیاد پڑی، جس کے پہلے ناظم مولانا مسعود علی ندوی، جو اپنی تنظیمی صلاحیت اور قوت عمل میں فرد فرید تھے، منتخب ہوئے، انھوں نے اس اسٹرائک کی رہنمائی اور قیادت اپنے ذمہ لی، تمام ملک میں رسائل وپمفلٹوں کا ایک سیلاب رواں ہوگیا، بعض طلبائے قدیم نے علامہ شبلی کے نام واشارہ کو بھی، اس اسٹرائک کو کامیاب بنانے کے لئے استعمال کیا، (۱) یہ اسٹرائک ڈھائی مہینے جاری رہی، اور اس کے تذکروں اور چرچوں سے صرف لکھنؤ نہیں بلکہ ملک کی فضا پُرشور اور گرم رہی۔

---

(۱) مولانا خلیل الرحمٰن نے ایک جلسہ انتظامی میں جو اسٹرائک کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، دو خط پیش کئے، ایک مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا مولوی مسعود علی ندوی کے نام تھا، دوسرا علامہ شبلی کا مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے نام، ان دونوں خطوط نے (جو اپنی اصلی شکل میں منتظمین ندوہ کو ہاتھ آگئے تھے) ذہنوں کا رخ بدل دیا اور اسٹرائک کے اخلاقی پہلو کو بہت مجروح کردیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے کہ ''اسٹرائک کو مولانا کی سرپرستی کسی طرح حاصل نہ تھی اور مولانا عبدالسلام صاحب نے اپنے خط میں جو تأثر دیا ہے، وہ صحیح نہیں'' یہ دونوں خط فرد کارروائی محفوظ دفتر ندوۃ العلماء میں بلفظہ منقول ہیں۔

اس سب کے مقابلہ میں ندوہ کے وہ قدیم ارکان تھے، جو پروپیگنڈے، رائے عامہ کو ہموار کرنے اور اپنی صفائی اور دفاع کے جدید طریقوں سے ناواقف تھے، اور ان کے ساتھ پریس کی کوئی مؤثر طاقت بھی نہ تھی، ان کے ساتھ زیادہ تر قدیم علماء(۱) یا وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات تھے، (۲) جو مدارس کی عام ڈسپلن، نظم ونسق کے برقرار رہنے اور علماء واساتذہ کے وقار واحترام کے قائم رہنے کے حق میں تھے، اور احتجاج وناراضگی کے ان جدید طریقوں کو ناپسند کرتے تھے، جو ابھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی عام نہیں ہوئے تھے، وہ طلباء سے اسٹرائک ختم کرنے کا مطالبہ کرتے تھے، اور اس کا وعدہ کرتے تھے کہ اسٹرائک کے اختتام کے فوراً بعد وہ ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کریں گے، جو طلباء کی شکایات پر ہمدردانہ غور کرے گا، طلباء کا اصرار تھا کہ پہلے کمیشن کا اعلان کیا جائے، کئی مواقع پر مجلس انتظامی کے نمائندے طلباء سے جاکر ملے اور طلباء کے نمائندوں نے مجلس میں آکر رُو در رُو گفتگو کی، جن کے طرز ولہجہ سے بعض ارکان کو سخت تکلیف پہنچی اور یہ سب گفتگو اور کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور اسٹرائک جاری رہی، واقعہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ اتنا سخت تھا کہ اگر بانیانِ ندوۃ العلماء کا اخلاص اور موجودہ ارکانِ ندوۃ العلماء کا استقلال نہ ہوتا، تو یہ تحریک ایک تاریخی داستان اور یہ درسگاہ آثار قدیمہ کی ایک عمارت بن کر رہ جاتی۔

---

(۱) ان قدیم علماء میں سے مولانا عبدالخالق حقانی، صاحب تفسیر حقانی، (جو ندوہ کے قدیم ترین ارکان میں سے تھے) قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی خلف الرشید حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی، مولانا سیف الرحمٰن صاحب ٹونکی، (مہاجر کابل ومجاہد عظیم) مولانا احمد علی میرٹھی، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی اور شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلی کا نام قابل ذکر ہے۔

(۲) ان میں حاجی محمد اسحاق خاں صاحب خلف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولوی ظہور احمد وکیل، آنریبل مولوی محمد نسیم صاحب وکیل کا نام قابل ذکر ہے۔

مصالحتی کوششیں اور اسٹرائک کا اختتام

بالآخر جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ اپریل ۱۹۱۴ء کی ابتدائی تاریخوں میں لکھنؤ میں ''مجلس اصلاح ندوہ'' کی بنیاد پڑی، جس کی اس وقت کے بڑے بڑے عمائد اور مشاہیر نے ممبری قبول کی اور تمام ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، حیات شبلی کے بیان کے مطابق ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں بلکہ قصبات و دیہات میں تقریباً پچاس جلسے مطالبۂ اصلاح کی تائید میں مسلسل منعقد ہوئے، اس موقع پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم نے مسیحائی کی اور اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، انھوں نے دہلی میں ایک مجلس مشاورت کی دعوت دی، مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس سے پوری دلچسپی لی، وہ پہلے اس کے حق میں تھے کہ اسٹرائک پہلے ختم ہو پھر مطالبات پر غور کیا جائے، لیکن جب طلباء نے ان کی اعتماد اور ذمہ داری پر اسٹرائک ختم کردینے کا اعلان کیا تو انھوں نے اصلاح کمیٹی میں شرکت کی۔

۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کو دہلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری وغیرہ نے شرکت کی، (۱) ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوہ کے لئے ایک دستور العمل بنائے، جس میں کسی کو بلا مشورہ اپنی رائے سے کارروائی کا موقع نہ ملے، دستور کے بنانے کا کام پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا، اور حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ثناء اللہ

(۱) تفصیل کے ملاحظہ ہو! حیات شبلی/ص/۲۵۸، ۲۶۰

امرتسری، خواجہ غلام الثقلین، نواب علی حسن خاں اور حکیم عبدالولی (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) ممبر منتخب ہوئے، پیرزادہ صاحب نے یہ کام مکمل کردیا۔

علامہ شبلی کی وفات

اسی دوران میں ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء (۲۸ رذوالحجہ ۱۳۳۲ھ) کو علامہ شبلی نے اس دارِفانی سے رحلت کی، اس حادثہ نے ان شگافوں کو بھرنے اور ان داغوں کے دھونے میں وہ کام کیا، جو کوئی بڑی سے بڑی تدبیر اور ذہانت وتقریر نہیں کرسکتی تھی، اس واقعہ نے اچانک ان تلخیوں کو جو بشریت کے تقاضہ اور مخلصانہ اختلافِ رائے کے نتیجہ میں پیدا ہوگئی تھیں، آنسوؤں میں تحلیل اور پچھلی خوشگوار یادوں میں تبدیل کرکے زائل کردیا، اور جو چیز بہت دور نظر آتی تھی، وہ نزدیک اور جو بہت دشوار معلوم ہوتی تھی آسان ہوگئی، سید صاحب لکھتے ہیں:

"حادثۂ وفات کے چار مہینے بعد ندوہ کے ارکان نے لکھنؤ میں اس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی، اس موقع پر ۲ رجمادی الاولی ۱۳۳۲ھ ۱۸ رمارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں مرحوم نے دفترِ نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آپہنچا تھا، اس لئے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور مولانا آزاد اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور ارکانِ ندوۃ العلماء نے متعدد صحبتوں میں بیٹھ کر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور یہ طے کیا کہ دس آدمیوں کی ایک

مشترک مجلس ۳۱؍ مارچ کی شام کو منعقد ہو، اس میں پانچ ندوہ کے موجودہ ارکان اور پانچ مجلسِ اصلاح ندوہ کے ارکان شریک ہوکر کثرت رائے سے تمام اختلافی معاملات کا تصفیہ کردیں، چنانچہ انجمن اصلاح کی جانب سے، حاذق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، بابو نظام الدین صاحب رئیس امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین صاحب بیرسٹر لکھنؤ، (حال نواب ناظر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدرآباد) اور نواب سید علی حسن خاں صاحب، اور موجودہ ارکانِ ندوہ کی جانب سے مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ، اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کاکوری منتخب ہوئے، یہ اصحاب ۳۱؍ مارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے اور تمام امور پر نہایت ہمدردی سے غور وفکر کیا اور حسب ذیل امور اتفاقِ کامل سے منظور ہوئے۔

۱. ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں مناسب اصلاح وترمیم۔

۲. مسئلہ نظامت کا تصفیہ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے استعفا دیا اور ان کی جگہ مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا، جس کو مولانا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا۔

۳. معتمد مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو

منظور کیا۔

۴. دار العلوم کے طلبائے قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوہ کا ممبر بنانا قبول کرلیا گیا۔(۱)

مولانا آزاد نے ۵/اپریل کے آخری سالانہ اجلاس میں مجلس اصلاح کی طرف سے تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا، اور فریقین نے مسرت واطمینان قلبی کے ساتھ اس نوید جانفزا کا استقبال کیا۔

علامہ شبلی اور مولانا سید عبدالحی

قبل اس کے کہ ہم تاریخ کا یہ ورق پلٹیں اور مولانا سید عبدالحی صاحب کے دورِ نظامت کا نیا ورق کھولیں، ضروری سمجھتے ہیں کہ علامہ شبلی اور مولانا سید عبدالحی صاحب کے باہمی تعلق پر کچھ روشنی ڈالیں اور یہ دکھائیں کہ وہ ایک دوسرے کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور ان تمام اصولی ونظری اختلافات کے ساتھ جو اس ربع صدی کی رفاقت وتعاون میں پیش آئے، وہ ایک دوسرے کی کتنی قدر کرتے تھے۔

ندوۃ العلماء کی تاریخ اور جلسۂ انتظامی کی کارروائیوں نیز ان کثیر التعداد خطوط اور رقعات کے دیکھنے سے، جو طرفین نے ایک دوسرے کو لکھے، اندازہ ہوتا ہے، کہ ارکانِ انتظامی کے وسیع حلقہ میں علامہ شبلی کو (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو مستثنیٰ کرکے) سب سے زیادہ مناسبت مولانا سید عبدالحی صاحب سے تھی اور وہ ان کو اپنے سے بہت زیادہ قریب سمجھتے تھے، چنانچہ مجلس انتظامی کی فرد کارروائی کے رجسٹر میں ہم کو ۷/ربیع الآخر ۱۳۲۹ھ ۷/اپریل ۱۹۱۱ء کے جلسۂ انتظامیہ کی روداد میں یہ

(۱) حیات شبلی/ص/۶۶۶-۶۶۷

اندراج ملتا ہے کہ ”مولانا شبلی نے تجویز پیش کی کہ مولانا سید عبدالحی صاحب کا نظامت کے لئے انتخاب کیا جائے۔“(۱)

اس مناسبت کے وجوہ واسباب میں علاوہ اس بات کے کہ مولانا سید عبدالحی کی طبیعت بڑی باہمہ اور مرنجانِ مرنج واقع ہوئی تھی، غالباً اس ادبی، تاریخی و تصنیفی ذوق کو بھی دخل ہے، جو دونوں میں مشترک تھا، یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ایک (علامہ شبلی) اپنی شہرت و مقبولیت کے نقطۂ عروج پر تھا اور دوسرے کا تعارف اس حیثیت سے اس وقت ایک مخصوص حلقۂ اصحاب میں محدود تھا، دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مولانا سید عبدالحی کے خاندان کے اکابر ضلع اعظم گڑھ میں جس سے وہاں کے صدہا لوگوں کا روحانی تعلق تھا، (۲) بہرحال اس کے جو بھی اسباب ہوں، سارے اختلافات کے باوجود مولانا سید عبدالحی صاحب کے لئے مولانا شبلی کے قلب میں ہمیشہ ایک نرم گوشہ رہا، اور وہ ان کی شرافت کا اعتراف کرتے رہے، اس کیلئے ہم یہاں مولانا کا ایک خط پیش کرتے ہیں، جو انھوں نے ۲۴ر اگست کو بمبئی سے لکھا تھا، افسوس ہے کہ خط پر سنہ درج نہیں ہے، لیکن قرائن موجود ہیں کہ وہ اس زمانہ کا ہے جب

---

(۱) کارروائی جلسہ انتظامیہ محفوظ دفتر ندوۃ العلماء/ص ر۱۳۸، تجویز نمبر/۱۴۔

(۲) حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا سید خواجہ نصیر آبادی سے اس ضلع کے سیکڑوں، ہزاروں مسلمانوں کا اپنے اپنے وقت میں ارادت اور بیعت کا تعلق رہ چکا تھا، اور ان کے بعد اس ضلع میں ان کی یاد تازہ اور عقیدت قائم تھی، آخری دور میں (علامہ شبلی کی زندگی میں) مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کے اس ضلع کے قصبات اور دیہاتوں میں برابر تبلیغی دورے ہوتے تھے، اور صدہا مسلمان ان کے حلقہ ارادت اور بیعت میں شامل تھے، مجھ سے میرے استاد مولانا شبلی صاحب جیراجپوری فقیہ دارالعلوم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جانتے ہو ہمارے ضلع میں بدعات (تعزیہ داری اور مجالس میلاد مروجہ) کے نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ میرے سکوت پر فرمایا کہ یہ حضرت مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے تعلق کی برکت ہے، جو ہمارے ضلع کے شیخ و مرشد تھے۔

کہ مولانا معتمد تعلیم کی حیثیت سے مستقل طور پر دارالعلوم میں قیام پذیر تھے، اس زمانہ میں جب وہ باہر تشریف لے گئے تھے، انھوں نے مولانا سید عبدالحی صاحب کو یہ خط لکھا:

''مولانا!

باوجود تمام معائب کے جو مجھ میں موجود ہیں، یہ غالباً آپ جانتے ہونگے، میں دنیا سازی نہیں جانتا اور جھوٹی خوشامد نہیں کرتا، اس لئے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔

مجھ کو معلوم ہوا کہ آپ کو اس بات سے میری انانیت کا خیال پیدا ہوا کہ میں نے آپ کو کوئی خاص خط نہیں لکھا بلکہ عبدالسلام وغیرہ کو لکھتا رہا۔

مولانا! خدا شاہد ہے، اسکو کوئی تعلق آپ کی کمی شان سے نہیں، کوئی امر اہم نہ تھا کہ خاص آپ کو لکھتا۔

میں جو آپ کی وقعت کرتا ہوں، بخدا آپ اس سے واقف نہیں، آپ کے علوئے نسب، مذہبی زندگی، ایثارِ نفس، محاسن اخلاق کا میرے اوپر جو اثر ہے، اس کے لحاظ سے میں اپنے آپ کو آپکا خادم سمجھتا ہوں، میں اپنی نسبت گو کتنا ہی مغرور ہوں، لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ ایک دنیادار شخص ہوں، گنہگار ہوں، بداخلاق ہوں، اس لئے مجھ کو مقدس اور برگزیدہ حضرات سے کیا نسبت، افسوس ہے کہ آپ کو ایسا خیال ہوا، میں شکستہ پائی کی وجہ سے مجبور ہوں ورنہ حاضر ہوتا اور آپ کو ایسے خیالات کا موقع نہ

ملتا، امید ہے کہ آپ ایسے خیالات دل سے نکال ڈالیں گے۔

شبلی

۲۴/اگست

مولانا سید عبدالحی صاحب، علامہ شبلی نعمانی کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور ان کو علمی وادبی اور تصنیفی حیثیت سے کیا مقام دیتے تھے اس کا اندازہ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم کے اس مضمون سے ہوسکتا ہے، جو انھوں نے ان کے ترجمہ میں لکھا ہے، اس ترجمہ کو انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا ہے:

"الشيخ الفاضل العلامة شبلي بن حبيب الله البندولي فريد هذا الزمان المتفق على جلالته في العلم والشأن."

آگے ان کے خصوصیات وکمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حافظہ بڑا قوی تھا، بہت سریع الادراک تھے، دل کی بات پالینے اور متکلم کا مدعا سمجھ لینے میں کمال تھا، نظر باریک، استدلال قوی، ہم نشینوں اور اہلِ صحبت پر ان کا بڑا اثر پڑتا تھا، جس موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے، مخاطب ان کا ہم خیال بن جاتا اگرچہ (بعض اوقات) اس مقصد کے لئے ان کے پاس قوی دلائل نہ ہوتے، تاریخ اسلام اور تمدنِ اسلامی پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی، شعر وادب کا بڑا حصہ ان کو یاد اور نوکِ زبان تھا، مطالعہ نہایت وسیع تھا، آداب واقوام وملل وفلسفۂ اخلاق کے موضوع پر کوئی کتاب مشکل سے ان کی نظر سے بچی ہوگی، حاضر جوابی، نکتہ سنجی اور فارسی اردو اشعار کے برمحل پڑھنے میں ان کی نظیر مشکل سے

ملے گی، معلومات میں وسعت پیدا کرنے اور مذاکرۂ علمی وتصنیف وتالیف کا بے پایاں ذوق رکھتے تھے اور تقریر وخطابت میں بھی مہارت تھی۔"

□□□

باب ششم

مولانا سید عبدالحی صاحب کا نظامت کیلئے متفقہ انتخاب، ندوہ کے استحکام وترقی کیلئے انکی کوششیں، اہم سالانہ جلسے، اہم خدمات اور مساعی

نظامت کے لئے انتخاب

اوپر کی سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس پر آشوب دور میں جب ندوہ کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور اس کی ہستی کو بھی خطرہ لاحق تھا، ملک میں اثر اور مقبول عام اخبارات ورسائل کے پرجوش مضامین سے ندوہ کے موجودہ ارکان کے خلاف بدگمانیوں اور شکایتوں کا ایک بادل چھایا ہوا تھا، جس میں ناراضگیوں اور دھمکیوں کی بجلیاں بھی وقتاً فوقتاً کوندتی تھیں اور مہیب گرج بھی سننے میں آتی تھی، فریقین کی باہمی رضامندی اور اتفاقِ رائے سے نظامت کے لئے ان کا انتخاب عمل میں آیا اور اس طرح (اگر ندوہ کی تحریک مسلمانوں اور علم دین کے مستقبل کے لئے کوئی اہمیت وافادیت رکھتی تھی) تو انھوں نے تقریب بین المسلمین اور اصلاح ذات البین کا وہ کارنامہ انجام دیا، جوان کو اپنے جد امجد امام حسنؓ سے ورثہ میں ملا تھا۔

۱۸؍جمادی الاولی ۱۳۳۳ھ، ۳؍اپریل ۱۹۱۵ء کے جلسۂ انتظامیہ میں رائے شماری سے معلوم ہوا کہ آئندہ دور کے لئے جو رمضان ۱۳۳۳ھ، جولائی ۱۹۱۵ء سے شروع ہوتا ہے، زیادہ تر رائیں مولانا سید عبدالحی صاحب کی نظامت کے لئے آئیں اور اس بنا پر وہ ناظم منتخب ہوئے،(۱) مصالحتی کمیٹی نے بھی (جس کی روداد اوپر آچکی ہے) انھیں کے نام پر اتفاق کیا اور جلسہ سالانہ منعقدہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ، اپریل ۱۹۱۵ء نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور ملک میں ان کی نظامت کا اعلان ہو گیا۔

ان کے دورِ نظامت میں پہلا خوش آئند کام یہ ہوا کہ انجمن طلبائے قدیم سے ارکان کا انتخاب ہوا، اور دارالعلوم کے وہ فضلاء منتخب ہو کر آئے جن سے ندوہ کا نام سارے ملک میں روشن ہوا تھا اور اپنی علمی و عملی صلاحیتوں میں بہت فائق تھے، اور جن کو ندوہ کا حقیقی درد اور اس کی سچی لگن تھی، ان ارکان میں سرفہرست نام مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کا تھا، اس طرح وہ خلیج بھی پٹ گئی جو ابنائے قدیم اور ارکانِ ندوہ کے درمیان پڑ گئی تھی۔

مولانا سید عبدالحی صاحب کی ان تجاویز میں جو انھوں نے سب سے پہلے پیش کیں، ان اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کی تجویز تھی، جو دارالعلوم ہی سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور عرصہ سے وہاں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا نے اس کا اظہار کیا، کہ اس جرم میں کہ وہ ہمارے یہاں کے فاضل اور یہیں کے تعلیم یافتہ ہیں، ان کی ناقدری اور حق تلفی نہیں ہونی چاہیئے، اس وقت تک انگریزی اسٹاف کی تنخواہوں کا معیار بلند تھا، اس لئے کہ گورنمنٹ سے گرانٹ ملتی تھی، اس کی شرط یہ تھی کہ وہ صرف دنیاوی تعلیم میں صَرف کی جائے، اس لئے وہ زیادہ تر انگریزی وریاضی کی تعلیم

(۱) رجسٹر کارروائی مجلس انتظامی محفوظہ دفتر ندوۃ العلماء۔

دینے والے اساتذہ کی تنخواہوں پر صرف ہوتی تھی، مولانا نے مدرسین عربی و دینیات کی تنخواہوں میں اضافہ وترقی اور بجٹ کی توسیع کی تحریک کی، اور وہ منظور ہوگئی۔

اس وقت تک دارالعلوم کے احاطہ میں کوئی مسجد نہ تھی اور طلباء دارالعلوم کے وسیع ہال میں نماز پنجگانہ اور جمعہ ادا کرتے تھے، (۱) مولانا نے مسجد کی تعمیر کی تحریک پیش کی اور یہ طے ہوا کہ وہ مسجد نبوی شریف کے نقشہ پر بنائی جائے۔

ان کے دورِ نظامت کا دوسرا مبارک اقدام یہ تھا، وہ گورنمنٹ گرانٹ جو ۱۳۲۶ھ، ۱۹۰۸ء سے ندوہ کو مل رہی تھی اور جو اگرچہ بغیر کسی تعلیمی وانتظامی مداخلت کے تھی، لیکن گورنمنٹ سے تعلق کا نشان تھی، اور حقیر سی رقم کے لئے اس عظیم ادارہ کو ایسی غیر اسلامی حکومت کا ممنون ہونا پڑتا تھا، جو مسلمانوں کی عظمت کے آخری نشان (خلافت عثمانیہ) کے مقابلہ میں صف آرا تھی، بند کی گئی، اور گورنمنٹ کو اطلاع کی گئی کہ آئندہ ندوۃ العلماء اس کے قبول کرنے سے معذور ہے، مجلس انتظامی کی کارروائی ۳ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ، ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کی روداد میں درج ہے:

> ''جلسۂ انتظامیہ میں کثرتِ آراء سے طے ہوا کہ گورنمنٹ گرانٹ بند کردی جائے اور اس پر عملدرآمد ماہ رواں سے کیا جائے، یہ بھی طے کیا گیا کہ اس کا اثر معیارِ تعلیم پر نہیں ہونا چاہئے اور مولانا حمید الدین فراہی صاحب اور مولانا سید سلیمان

---

(۱) یہ سلسلہ ۱۳۵۲ھ، ۱۹۳۳ء تک جاری رہا، مسجد کی تعمیر کی سعادت بجائے انکے، ان کے خلف الرشید مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم کے حصہ میں آئی، جن کے دورِ نظامت میں مولانا مسعود علی صاحب مرحوم کی حسن سعی اور سرگرمی سے اور انھیں کے انتظام میں دارالعلوم کی موجودہ شاندار مسجد بن کر تیار ہوئی، اور ۲۶ رشعبان ۱۳۵۲ھ یوم جمعہ (۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء) کو اس کا نماز جمعہ کی ادائیگی اور (نواب صدر یار جنگ) مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی امامت ووعظ سے افتتاح ہوا۔

ندوی سے درخواست کی گئی کہ وہ ہر دوسرے مہینہ دس دس روز دارالعلوم میں قیام فرمائیں گے اور طلباء کی استعداد علمی بڑھانے میں کوشش کریں گے۔"(۱)

دورِ نظامت کی مشکلات

مولانا سید عبدالحی کو نظامت کے لئے جو زمانہ ملا، وہ بڑا پرآشوب اور عام بے چینی اور تحریکات کا دور تھا، ۱۳۳۳ھ، ۱۹۱۵ء میں ناظم منتخب ہوئے، یہ جنگ عمومی کا زمانہ تھا، جو ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک جاری رہا، اس زمانہ میں غیر معمولی حالات گرانی و بے اطمینانی سے سابقہ تھا، ہر وقت خطرہ کی فضا قائم تھی، جنگ ختم ہوئی تو انفلوئنزا (جنگی بخار) کا دور دورہ ہوا، جس سے سارے ملک میں موت کا بازار گرم ہوگیا، جس میں کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، دوسری طرف قحط کا زور تھا، اس حالت میں کسی تعمیری تحریک کا چلانا اور اس کے منصوبوں کا پورا کرنا نہایت مشکل تھا، خود مولانا کی زبان سے اس صورتِ حال کا بیان سنئے، انھوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس سالانہ منعقدہ بلگام ۱۸/۱۹/۲۰/ رجب ۱۳۳۷ھ (۱۹/۲۰/۲۱/ اپریل ۱۹۱۹ء) کے موقع پر جو سالانہ روداد پیش کی، اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"جب ہم گذشتہ اپریل میں اجلاس ناگپور کے پنڈال سے باہر نکلے اور اجلاس کی غیر معمولی مصروفیات وانہماک کے بعد ہوش وحواس بجا ہوئے تو ہم نے ہندوستان کو اس حالت میں پایا کہ وہ متزلزل ہو رہا تھا، جنگ کی شدت اپنے انتہائی نقطہ تک پہنچ چکی

(۱) فرد کارروائی قلمی، محفوظہ دفتر ندوۃ العلماء۔

تھی اور قحط کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، اور عام طور پر پریشانی
تھی، ہندوستان ابھی اسی عالمِ اضطراب میں تھا کہ آخرکار قحط
اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوا اور دوسری طرف انفلوئنزا
نمودار ہوا، اب ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں باطمینان وفراغت
کام کرنا، اور کسی تحریک یا تجویز پر باقاعدہ عمل کرنا، سخت دشوار تھا،
اسی طرح مالی وسائل کو ترقی دینا بھی تقریباً ناممکن تھا، حالت یہ تھی
کہ ہمارے وکلاء اگرچہ ملک کا دورہ کر رہے تھے لیکن بعض کو تو صبح
سے شام تک بجز نماز جنازہ پڑھانے کے اور کچھ کام نہ تھا، ایسی
حالت میں چندہ مانگنا اور روپیہ فراہم کرنا کیونکر ممکن تھا، جب کہ
ہر شخص مصائب میں مبتلا تھا، اور کسی کو سر وپا کا ہوش نہ تھا''(۱)

اسی زمانہ میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا، جو گزشتہ ہندوستان کی سب سے بڑی نیم سیاسی، نیم دینی تحریک تھی، وہ ایک طوفان کی طرح اٹھی اور سارے ہندوستان پر چھا گئی، اس کے زلزلہ افگن اثرات سے نہ کوئی تحریک بچی، نہ کوئی ادارہ، نہ کوئی شہر، نہ کوئی قریہ، اپنے سیاسی وتحریکی مزاج کی وجہ سے تعلیم گاہوں کی پرسکون فضا اور ذہنی یکسوئی اور تعلیمی انہماک سے اس کا تضاد تھا، سرکاری مدارس کا مقاطعہ ہو رہا تھا، طلباء درسگاہیں چھوڑ چھوڑ کر جیل خانوں کا رخ کر رہے تھے، اور ان کی ساری توجہ ودلچسپی مطالعہ ومحنت سے ہٹ کر، جلسوں جلوسوں اور ہنگاموں کی طرف منتقل ہوگئی تھی، مدارس کا نظم ونسق درہم برہم تھا، اساتذہ اور منتظمین بلکہ سرپرستوں تک کا طلباء اور نوجوانوں پر کوئی اثر نہیں رہا تھا، اور ایک عام انتشار سارے ملک میں برپا تھا، مولانا سید عبدالحی

(۱) روداد اجلاس ہیزدہم ندوۃ العلماء، بلگام/ص ۳۵۔

صاحب کا اگر چہ جذباتی تعلق اس تحریک کے ساتھ تھا اور وہ خلافتِ عثمانیہ کے مخلص حامیوں میں تھے، چنانچہ انھوں نے اس کی حمایت وتائید میں ایک اپیل شائع کی تھی اور اسی جذبہ کے ماتحت ان کی نظامت میں گورنمنٹ گرانٹ بند کی گئی تھی، مگر ناظم ندوۃ العلماء اور ایک تعلیم گاہ کے سب سے بڑے ذمہ دار کی حیثیت سے انکا فرض تھا کہ وہ دارالعلوم میں تعلیمی فضا قائم رکھنے کے لئے طلباء کو پورے انہاک ویکسوئی کے ساتھ علوم دینیہ کی تحصیل میں مشغول رکھیں، تاکہ وہ کمال واختصاص پیدا کر کے ملت کی صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیں، جس کے بغیر کوئی تحریک اور کوئی جدوجہد بارآور اور نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی، اس سلسلہ میں ان کو جو دقتیں پیش آئیں اور جس طرح انھوں نے اس نازک ودشوار کام کو اس پرآشوب وبلاخیز زمانہ میں جب ذہن توازن کھو چکے تھے، جس طرح انجام دیا، اس کا اب اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسنا کے نہ داند جام وسندان باختن

ان مشکلات پر جو غیر اختیاری اور ناگہانی تھیں، طرفہ یہ ہوا کہ اگست ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ نے ناظمِ ندوۃ العلماء اور ارکانِ مجلس انتظامی سے یہ تحریک کی کہ دارالعلوم کی عمارت کو وہ چھتری کالج کو دیدیں، اس کے بجائے گورنمنٹ ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ کی مسجد عالمگیری کے سامنے لبِ دریا عمارت ومسجد بنوادے گی، اور مزید براں تیس ہزار روپیہ دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے دے گی، یہ ناظم ندوۃ العلماء اور ارکانِ مجلس کے لئے ایک بڑا امتحان تھا، ایک طرف گورنمنٹ کا کھلا ہوا ایماء خواہش اور دوسری طرف ایک گرانقدر رقم کی پیشکش، جس کی اس وقت ندوہ کو بڑی ضرورت تھی، اور بنی بنائی عمارت ایک پرفضا پرسکون مقام پر، بظاہر اس

تجویز کا منظور کرنا غیر دانشمندانہ فعل نہ تھا، اس وقت تک دارالعلوم کی مسجد بھی تعمیر نہیں ہوئی تھی، جو اس پیشکش کو قبول کرنے میں دینی طور پر رکاوٹ پیدا کرتی، لیکن اس میں اس عظیم دینی ادارہ کی بے حرمتی اور اس کا سودا تھا اور یہ اس کے ذمہ داروں کی (جو ملت کے نمائندہ اور معتمد علیہ تھے) خودداری وغیرتِ نفس کے خلاف تھا، چنانچہ وہی ہوا، جس کی اس خوددار اور باوقار مجلس سے توقع کی جاتی تھی، کہ انھوں نے صاف لفظوں میں اس تجویز کو قبول کرنے سے معذرت کی اور بار بار کے خط وکتابت کے باوجود بھی اس تبادلہ کو قبول نہیں کیا۔

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

مدتِ نظامت کی توسیع

"رجب ۱۳۳۸ھ مارچ ۱۹۲۰ء کو مولانا سید عبدالحی صاحب کی مدت نظامت ختم ہورہی تھی، لیکن ۱۴؍جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ، ۶؍مارچ ۱۹۲۰ء کے جلسۂ انتظامیہ میں جب ارکان کی وصول شدہ آراء کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ تمام ارکان نے مولانا سے اس عہدہ پر رہنے کے لئے اصرار کیا تھا، اور یہ لکھا تھا کہ "ان کو اس عہدہ پر برقرار رہنے کے لئے مجبور کیا جائے" جلسے میں شرکت کرنے والے ارکان نے بھی مولانا کو مجبور کیا اور وہ باتفاق آراء دوبارہ ناظم منتخب ہوئے، جلسہ نے مولانا کے جو عذرات تھے، ان کو نہایت غور سے سنا اور بعد غور وبحث کے یہ طے کیا کہ مولانا ممدوح کی معاونت کے لئے دو نائب ناظم مقرر کئے جائیں، اور ان کا انتخاب ناظم کے مشورہ سے عمل میں لایا جائے۔"(۱)

---

(۱) روداد جلسہ انتظامی، قلمی محفوظہ دفتر ندوۃ العلماء۔

یہ مولانا سید محمد علی صاحب کے بعد دوسرا موقع تھا کہ مدتِ نظامت میں توسیع کی گئی اور ارکان وہمدردانِ ندوہ نے ناظم پر اپنے کلی اعتماد واتفاق کا اظہار کیا۔

مولانا سید محمد علی صاحب سے تعلق کی تجدید

غالبًا مولانا سید عبدالحی صاحب کو اس پوری مدت میں اس کا احساس رہا کہ ندوۃ العلماء اپنے بانی اور داعی اول سے کٹ کر رہ گیا ہے، جس نے سب سے پہلے اسکی آواز بلند کی اور سب سے زیادہ اس کے لئے قربانی دی، فرع کا اپنی اصل سے اور وارث کا اپنے مورث سے منقطع ہو جانا کوئی خوشگوار اور خوش آئند واقعہ نہیں، بلکہ بہت کچھ بے برکتی کا موجب ہے، پچھلا دور ایک انتشار واختلاف کا دور تھا اور وہ محض مددگار ناظم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، لیکن اب جب کہ وہ ناظم تھے، انھوں نے اس تعلق کو تازہ کرنا چاہا، جو مولانا کی کنارہ کشی کے بعد بہت مضمحل بلکہ تقریباً شکست ہو گیا تھا، انھوں نے مولانا سید محمد علی صاحب کو بانی ندوۃ العلماء کی حیثیت سے مستقل سرپرست بنانے کی تجویز پیش کی، اور اس سرپرستی میں اس عہد کی دوسری عظیم دینی وروحانی شخصیت مولانا شاہ بدرالدین امیرِ شریعت بہار کو بھی شریک کیا تاکہ دونوں کی دعائیں اور سرپرستانہ توجہات ندوہ کے کام میں مدد ومعاون بنیں اور اس تحریک کا دینی رجحان زیادہ واضح اور مستحکم ہو جائے، ہم ۶؍مارچ ۱۹۲۰ء کے جلسہ انتظامی کی کاروائی میں حسب ذیل اندراج پاتے ہیں:

> ''اس جلسہ میں مولانا سید محمد علی صاحب بانیٔ ندوۃ العلماء، مولانا شاہ بدرالدین امیر شریعت بہار، سرپرست ندوۃ العلماء، مولانا حاجی سر رحیم بخش صاحب (۱) پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی

---

(۱) مولانا سر رحیم بخش صاحب ٹھکا میران صاحب تحصیل تھانیسر ضلع کرنال کے ایک راجپوت زمیندار گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے، ابتدا میں لاہور چیفس کالج کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور طلباء کے اتالیق تھے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے بی. آئی. ای. حامی ندوۃ العلماء منتخب ہوئے۔''

چند جدید تقررات واصلاحات

مولانا سید عبدالحی صاحب چونکہ طبقہ علماء سے وسیع اور گہری واقفیت رکھتے تھے اور اپنے وسیع دائرہ تلمذ نیز نزہۃ الخواطر کی تصنیف کی بنا پر ان کے علمی پایہ اور مرتبۂ کمال سے واقف تھے، اور شروع سے ان کی رائے اور تجربہ صدر مدرسین اور اساتذہ کے انتخاب میں شامل رہا تھا، اس لئے انھوں نے سب سے پہلے بلند پایہ علماء اور ماہرینِ فن کو دارالعلوم میں لانے کی کوشش کی اور اس بارہ میں وہ مولانا سید محمد علی اور علامہ شبلی کے نقش قدم پر چلے۔

دارالعلوم میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کے بعد صدر مدرس کی جگہ خالی تھی اور مدرسہ کسی نامور اور صاحبِ کمال استاد کے درس وتدریس سے محروم تھا، چنانچہ مولانا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) جس میں والیانِ ریاست کے لڑکے پڑھتے تھے، انکی دینداری واخلاقی بلندی کو دیکھ کر ریاست بھاولپور نے ان کی خدمات حاصل کیں، انھوں نے ایسا اعتماد ورسوخ حاصل کیا کہ نواب صاحب بھاولپور کی نابالغی کے زمانہ میں کونسل آف ریجنسی کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے، اور ریاست کے مختار کل قرار پائے، بیعت کا تعلق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے تھا، جن کی خدمت میں ایک مہینہ مسلسل قیام کر کے استفادہ کیا اور مدت العمر انھیں کے مسلک وعقیدہ پر رہے، ان کی وجہ سے بھاولپور کے حکمراں خاندان میں متعدد اصلاحات ہوئیں، اس خاندان میں حج کرنے کا رواج بالکل ختم ہوگیا تھا، ان کی ہدایت وتلقین سے اس کا سلسلہ شروع ہوا، لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں، اور وہ عمر بھر بیٹھی رہتی تھیں، انھیں نے یہ رسم بھی توڑی، وہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے سرپرستوں میں بھی تھے، لیکن اس پختہ دینداری اور تقشف کے ساتھ زمانہ حاضر کے تقاضوں سے واقف اور ندوۃ العلماء کی تحریک کے دل وجان سے حامی تھے، وہ ۱۹۱۹ء کے اجلاس بلگام کے صدر بھی ہوئے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے روحانی رشتہ سے مولانا سید عبدالحی صاحب سے محبت وعقیدت کا خصوصی تعلق رکھتے تھے، ۳ر محرم ۱۳۵۴ھ (۴ر مئی ۱۹۳۵ء) کو ۶۷ر سال کی عمر میں انتقال کیا، غفر اللہ لہ۔

کی اس منصب جلیل کے لئے مولانا سید امیر علی صاحب پر نظر انتخاب پڑی، جو ایک متبحر عالم، کثیر التصانیف مصنف اور فن حدیث ورجال اور فقہ واصول میں پایہ بلند رکھتے تھے، (۱) مولانا اس وقت مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تھے، مگر اپنے تلمیذ رشید کی دعوت پر ۱۳۳۳ھ، ۱۹۱۵ء میں تشریف لے آئے، اور صدر مدرسی نیز اہتمام کا عہدہ سنبھال لیا، مولانا سید علی زینبی (۲) بھی ایک جامع علوم وفنون عالم اور ریاضی وادب میں خاص امتیاز کے مالک تھے، وہ بھی سلکِ اساتذہ میں منسلک اور نیابتِ اہتمام کے فرائض انجام دیتے تھے، مولانا سید امیر علی صاحب کی وفات (۱۳۳۷ھ، ۱۹۲۱ء) کے بعد آپ نے صدارتِ تدریس واہتمام کے لئے شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب (۳) کا انتخاب کیا، جنہوں نے ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ سے حال ہی میں پنشن پائی تھی اور اس سے پہلے بھی وہ ایک دو بار دار العلوم میں اہتمام وصدر مدرسی کے فرائض انجام دے چکے تھے، مولانا کی وفات تک وہی مہتمم دار العلوم اور صدر مدرس رہے، تجوید کے لئے قاری ابراہیم رشید مکی کا انتخاب کیا، جو اپنے فن کے مانے ہوئے استاد تھے اور مکہ مسجد حیدر آباد کے خطیب مقرر ہوئے، پھر ۲۱/ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ، ۲۷/

---

(۱) مولانا کا تفصیلی تعارف مولانا سید عبدالحی صاحب کے اساتذہ کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔

(۲) مولانا امروہہ کے رہنے والے، نہایت جید الاستعداد عالم تھے، خصوصی تلمذ مولانا غلام احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ نعمانیہ لاہور سے تھا، ادب وریاضی میں خاص امتیاز رکھتے تھے، دار العلوم کے علاوہ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کے صدر مدرس اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی وعربی میں استاد رہے، ابن قدامہ کی مشہور کتاب "نقد الشعر" کے حواشی اور متعدد عربی مضامین، ان کی علمی یادگار ہیں، "اسلامی جنتری" جو بکثرت مسجدوں میں آویزاں ہے، انھیں کی مرتب کی ہوئی ہے، یکم ستمبر ۱۹۴۸ء کو وفات ہوئی۔

(۳) مولانا حفیظ اللہ صاحب کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو! نزہۃ الخواطر جلد ہشتم، "یادرفتگاں" از مولانا سید سلیمان ندوی۔

جولائی ۱۹۲۱ء میں جب ان کے استاد شیخ محمد عرب (خلف الرشید شیخ حسین بن محسن انصاری) کے استعفا سے محدث کی جگہ خالی ہوئی تو آپ نے باصرار اس جگہ کے لئے مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی کو زحمت دی، جو شیخ حسین بن محسن انصاری اور مولانا غلام احمد لاہوری کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور جامع معقول و منقول تھے۔(۱)

آپ نے اپنے دور میں اصلاحِ نصاب کے لئے ماہرین کی کمیٹی مقرر کی، اساتذہ سے رائیں طلب کیں اور ان کے تجربات و مشوروں کی روشنی میں نصاب میں مفید اصلاحات و ترمیمات کی گئیں، اس کا انتظام کیا گیا کہ گوشوارہ خواندگی ہر مہینہ ناظم ندوۃ العلماء کے پاس بھیجا جائے اور وہ ماہ بماہ تعلیمی کارگذاری سے واقف رہے۔

اس وقت تک دارالعلوم کے ساتھ طلباء کی رہائش کے لئے کوئی مستقل عمارت (دارالاقامہ) نہ تھا، طلباء دارالعلوم ہی کی عمارت میں رہتے تھے، اس سے مختلف قسم کی انتظامی و تربیتی مشکلات پیش آتی تھیں، اور جگہ کی تنگی بھی تھی، مولانا ہی کے دورِ نظامت میں انہی کے ہاتھوں ۲۷/ رجب ۱۳۳۵ھ (۱۹/ مئی ۱۹۱۷ء) کو دارالاقامہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا، سنگ بنیاد پر ان کا نام بحیثیت ناظم کے اور حسب ذیل عربی عبارت (جو دارالعلوم کی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے) ایک مرمریں

---

(۱) راقم سطور کو مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہے، مولانا مرحوم کو معقولات اور علوم آلیہ میں مولانا غلام احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ نعمانیہ لاہور اور اپنے برادر اکبر مولانا محمود حسن خاں ٹونکی اور حدیث میں شیخ حسین بن محسن انصاری اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے تلمذ تھا، بیعت و اجازت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے تھی، نہایت ذاکر، شاغل، خاشع و عابد، سخی و قانع بزرگ تھے، سادگی اور تواضع میں سلف صالحین کا نمونہ اور ذوق تدریس اور طلباء کے ساتھ شفقت و مساوات میں اساتذۂ پیشیں کی یادگار، تقریباً ۱۸/ برس دارالعلوم کی تدریس حدیث و اہتمام کی خدمات انجام دیں، ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ جنوری ۱۹۴۰ء میں سبکدوش ہو کر ٹونک تشریف لے گئے، جہاں ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ یکم جون ۱۹۴۲ء میں وفات پائی اور موتی باغ ٹونک کے مقبرہ میں مدفون ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

پتھر پر ثبت ہے۔(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"قد أسس بنیان دارالإقامة لدارالعلوم ندوة العلماء یوم السبت

۲۷/ رجب ۱۳۳۵ھ الموافق ۱۹/ مایو ۱۹۱۷م"

(دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دارالاقامہ کی بنیاد بروز ہفتہ ۲۷ر

رجب ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹ر مئی ۱۹۱۷ء کو رکھی گئی۔)

(دستخط ناظم) سید عبدالحی ناظم

۱۹/ ۱۹۱۸ء میں ابتدائی مکاتب کے قیام اور ان کے لئے نصاب کی ترتیب اور مناسب کتابوں کی تصنیف کی تحریک مجلس انتظامی اور جلسۂ عام میں پیش کی، جس پر اگر عمل ہوگیا ہوتا تو وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی اور مسلمان بچے جہالت ولادینیت کے اس سیلاب سے بچ جاتے، جو بعد میں پورے جوش کے ساتھ آیا......

ندوۃ العلماء کے اجلاس ناگپور ۱۹۱۸ء میں تاریخ اسلام کو بطور مضمون اختیاری کے ایف.اے، بی.اے. اور ایم.اے. میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شامل کرنے کی تحریک کی گئی تاکہ مسلمان اپنی گزشتہ تاریخ سے واقف ہوں۔

ندوہ کے سالانہ اجلاس اور ان کی روداد یں

مولانا کے دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء کے چار سالانہ اجلاس ہوئے، پہلا

(۱) ۶/ اپریل ۱۹۲۳ء، ۱۹/ شعبان ۱۳۴۱ھ ان کی وفات کے دو مہینہ بعد ندوۃ العلماء کا جو جلسہ انتظامی لکھنؤ میں منعقد ہوا اس میں "مولانا مرحوم کی حسن خدمات اور بے لوث قومی احسانات کے اعتراف میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ دارالاقامہ جس کا سنگ بنیاد مولانا کے ہاتھوں رکھا گیا تھا وہ ان کی بہترین یادگار ہو سکتی ہے، لہٰذا وہ عمارت ان کے نام سے موسوم کی جائے (رجسٹر کارروائی جلسہ ہائے انتظامی ندوۃ العلماء) یہی دارالعلوم کا پہلا دارالاقامہ ہے، جواب شبلی ہوسٹل یا رواق نعمانی کے نام سے مشہور ہے۔

اجلاس پونہ دکن میں ۱۸/۱۹/۲۰/ جمادی الآخرۃ ۱۳۳۴ھ (۲۲/۲۳/۲۴/ اپریل ۱۹۱۶ء) میں، جس کی صدارت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی نے کی، دوسرا اجلاس مدراس میں ۱۴/۱۵/۱۶/ جمادی الآخرۃ ۱۳۳۵ھ (۷/۸/۹/ اپریل ۱۹۱۷ء) میں، جس کے صدر استقبالیہ مشہور ماہر قانون مسٹر جسٹس مولوی سر عبدالرحیم صاحب اور صدرِ جلسہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی تھے، لیکن علالت کی وجہ سے ان کے نہ آسکنے کی بنا پر مولانا شاہ سلیمان صاحب نے صدارت فرمائی، تیسرا اجلاس ناگپور ممالک متوسط میں ۱۵/۱۶/۱۷/ جمادی الآخرۃ ۱۳۳۶ھ (۲۹/۳۰/۳۱/ مارچ ۱۹۱۸ء) میں، جس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے فرمائی، چوتھا اجلاس بلگام احاطہ بمبئی حال ریاست میسور ۱۷/۱۸/ ۱۹/ رجب ۱۳۳۷ھ (۱۹/۲۰/۲۱/ اپریل ۱۹۱۹ء) میں، جس کی صدارت کے لئے حاجی سر رحیم بخش کا انتخاب ہوا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکے، خطبۂ صدارت بھیج دیا، صدر استقبالیہ آنریبل خاں بہادر سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر صاحب تھے، جو اس وقت احاطۂ بمبئی کے نامور عمائد اور قومی کارکنوں میں تھے، یہ اجلاس باوجود اس کے کہ نسبتاً ایک چھوٹے مقام پر ہورہا تھا، پچھلے تینوں اجلاسوں سے زیادہ کامیاب رہا۔(۱)

اس کے بعد تحریکِ خلافت کا ایسا زور ہوا اور مسلمانوں کی ساری توجہ اور دلچسپی اس سے وابستہ ہوگئی کہ پھر ان کی زندگی میں کسی سالانہ اجلاس کی نوبت نہ آئی۔

---

(۱) راقم سطور رجب ۱۳۸۵ھ نومبر ۱۹۶۶ء میں مجلس مشاورت کے وفد کے ساتھ ریاست میسور کے دورہ پر گیا تھا تو اس کا ایک دن قیام بلگام میں رہا، اگرچہ اس اجلاس کو منعقد ہوئے نصف صدی ہوچکی تھی اور اس زمانہ کے اکثر لوگ دنیا سے رخصت ہوچکے تھے، چند معمر بزرگ ہی باقی تھے جو اس اجلاس میں شریک تھے، لیکن ابھی تک دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی اور لوگ مزہ لے لے کر اس کا تذکرہ کرتے تھے۔

ان اجلاسوں کے منعقد ہونے سے پہلے ندوۃ العلماء کے لائق سفراء، جن میں مولانا غلام محمد صاحب (۱) شملوی پیش پیش تھے، اور دفتر ندوۃ العلماء کا ایک حصہ پہلے سے چلا جاتا جو ان اجلاسوں کی تیاری میں رہنمائی اور معاونت کرتا، اکثر جگہ انجمن معین الندوہ پہلے سے قائم ہوتی جو ندوۃ العلماء کی اعانت کے لئے زمین ہموار کرتی اور اس کے مقاصد کی تبلیغ کا فرض انجام دیتی، ندوۃ العلماء کے یہ اجلاس، ملک کے شستہ وشائستہ ترین اجلاس ہوتے، جن میں ممتاز علماء، چیدہ برگزیدہ جدید تعلیم یافتہ اور مشاہیرِ ملک جمع ہوتے، بلند پایہ اور معیاری تقریریں ہوتیں، جلسے کے انتظامات اور اجلاس کی کاروائی کے ہر جزو سے مذاقِ سلیم اور تہذیب وشائستگی کا اظہار ہوتا، کوئی مبتذل اور عامیانہ اور نزاعی بات ان جلسوں میں نہ ہوتی، یہ جلسے بہت دنوں تک کے لئے اپنی خوشگوار یادیں اور اپنے روشن نقوش چھوڑ جاتے اور ندوۃ العلماء کی تبلیغ وتشہیر کے ماسوا مسلمانوں کی دینی زندگی اور علمی ترقی میں وہ ایک حرکت پیدا کر دیتے۔

ان جلسوں کی ایک روایت بن گئی تھی کہ ناظم ندوۃ العلماء گزشتہ سال کی روداد پیش کرے، جس میں سال بھر کے کاموں اور ندوۃ العلماء ودار العلوم کی پیش رفت اور کارگزاری کا جائزہ لیا جائے، اور بتایا جائے کہ کتنی تجویزوں اور منصوبوں پر عمل ہوا اور کتنے تشنۂ تکمیل ہیں، یہ رودادیں (ہر انجمن اور جلسہ میں) عام طور پر خشک و بے مزہ ہوتی ہیں، اور پروگرام کا یہی حصہ ہے جو سب سے زیادہ بے لطفی اور گرانی کے

---

(۱) مولانا غلام محمد صاحب بڑی غیر معمولی صلاحیتوں اور بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے، بڑے خوش تقریر، شیریں گفتار اور مدبر شخص تھے، اپنی جوانی میں ترکِ دنیا اور فقر اختیار کر لیا تھا اور جنگل میں رہنے لگے تھے، ندوہ کا غلغلہ سن کر بریلی کے جلسہ میں شریک ہوئے اور جوگ چھوڑ کر اسی راستہ کے جوگی بن گئے اور ساری عمر اسی کی خدمت میں بسر کر دی، مجھے ان کی مجلسوں کا لطف اور شفقتوں کا ذائقہ ابھی تک نہیں بھولا ہے، ۱۳۵۳ھ؍۱۹۳۴ء میں وفات پائی۔

ساتھ سنا جاتا ہے، لیکن مولانا عبدالحی صاحب کی روداد میں ان ضروری معلومات اور ناگزیر اعداد وشمار کے ساتھ، جو روداد کا اصل موضوع ہے، بہت سے ایسے حصے بھی ہوتے تھے، جو اہل علم و ادب کے ذائقہ شناسوں کے لئے نہ صرف دلچسپ بلکہ معلومات افزا ہوتے تھے، خصوصاً جب جلسہ کسی ایسے مقام پر ہوتا جس سے مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ وتہذیب کا دوروابستہ ہوتا، تو ان کے داغِ کہن تازہ ہوجاتے اوران کا تاریخی وعلمی ذوق ان کی عنانِ قلم کو بے اختیار عہد ماضی کے تذکرہ کی طرف موڑ دیتا، یہاں پر اس کے صرف دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

پونہ اجلاس (منعقدہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء) کی روداد شروع کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

''جناب صدرِ انجمن! ارکانِ ندوۃ العلماء! داعیانِ جلسہ!

ندوۃ العلماء کی بست دو سالہ زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کا سالانہ اجلاس احاطہ بمبئی میں ایسے شاندار مقام پر منعقد ہوا ہے جو عرصہ دراز سے باعتبار لطافتِ آب وہوا اور موقع محل کے ہندوستان کے عمدہ اور مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ وہ سرزمین ہے کہ جو تقریباً چار سو برس تک علوم وفنون اسلامیہ کا گہوارہ رہ چکی ہے اوراس سرزمین میں ایسے ایسے علمائے کرام پیدا ہوئے ہیں، جن کے علوم وفنون کی روشنی گجرات ودکن تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان سے وسط ہندوستان تک پھیل کر ملک کے ایک ایک گوشہ کو منور کردیا ہے۔

علامہ وجیہ الدین گجراتی اب آپ میں موجود نہیں ہیں،

نگران کے فرزندانِ معنوی ہندوستان میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور جب تک ہندوستان کا ایک مدرسہ بھی قائم ہے، ان کا نام ملک میں احسان مندی کے لئے لیا جائیگا۔

مولانا محمد طاہر صاحب فتنی شہید وفا کی کتاب "مجمع البحار" جب تک باقی ہے، ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب وعجم میں شائقانِ علمِ حدیث کے لئے کحل الجواہر کا کام دیتی رہے گی، نیز فتح اللہ شیرازی کے تین سو برس سے ہندوستان کے مدارس شرمندۂ احسان ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ بیجاپور کی قوتِ جاذبہ کا نتیجہ تھے، اور ہم کو یہ گوہرِ شب چراغ بیجاپور سے ہاتھ آیا تھا۔

حضرات! انقلابِ زمانہ سے صورت حال متغیر ہوگئی ہے، مدرسے اور خانقاہیں دست بردِ زمانہ سے تباہ ہوگئی ہیں، وہ نفوس قدسیہ جن کے واسطے شاہانِ روئے زمین اپنی آنکھیں بچھاتے تھے، جنت نصیب ہو چکے، ان کی تصنیفات غذائے کرم بن چکی ہیں، ان کی اولاد علم و ہنر سے بے بہرہ ہو چکی، خلاصہ یہ کہ علوم اسلامیہ کے منور چہرہ پر جہالت کا پردہ پڑ گیا اور اس تاریکی میں مذہب سے بھی لوگ بیگانہ ہونے لگے۔

حضرات! یہ عجب قسم کا انقلاب تھا، اور اس کا جو نتیجہ نکلتا اس کے خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے، مگر خدا جنّت نصیب کرے مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی اور جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو، جنھوں نے برمحل اس کا علاج تجویز

کیا اور کانپور اور دیوبند میں مدارس اسلامیہ کی بنیاد ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے گزر کر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں مدارس قائم ہو گئے، ان مدرسوں سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ علوم وفنون اسلامی ہندوستان سے معدوم نہیں ہو سکے۔"

بلگام اجلاس میں ان کی تاریخی واقفیت اور مطالعہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے، انھوں نے فرمایا:

"ہم سب آج اس مقام پر مجتمع ہیں جو مدت دراز تک مسلمانوں کی علمی وتمدنی ترقیوں کا گہوارہ رہ چکا ہے، کیا کوئی شخص موجودہ حالات پر نظر رکھتے ہوئے اس بات کو باور کر سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں علماء ومشائخ اور یہاں کے قدرداں حاکموں نے علوم وفنون کی خدمت میں قیمتی حصہ لیا ہے، غیروں کو جانے دیجئے خود ہم کو بھی اس قحط الرجال کو دیکھ کر اپنی گزشتہ خدمات میں شبہ ہو جاتا ہے، اگرچہ فرمانروایانِ دہلی اور سلاطین بہمنیہ دکن کے کارنامے (اس ملک کے سود و بہبود کے متعلق) ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہیں، اور امتدادِ زمانہ نے ان پر جہالت کا پردہ ڈال دیا ہے، مگر کل کی بات ہے کہ شاہانِ بیجاپور کی ہنر پروری اور علم دوستی نے اس سرزمین کے ایک ایک ذرہ کو رشکِ آفتاب بنا دیا تھا، سنسان جنگلوں کو سرسبز باغات اور سربفلک کشیدہ عمارتوں سے تبدیل کر دیا تھا، درندوں کی جگہ آدمی بسائے تھے اور اسی بلگام کو

جو ایک غیر معروف گاؤں تھا، آباد اور پر رونق شہر بنا دیا تھا، نواب اسد خان لاری کے نام سے اب بہت کم لوگ واقف ہوں گے، وہ اور اس کی اولاد زمانۂ دراز تک شاہانِ بیجاپور کے سایۂ عاطفت میں بلگام کے جاگیردار کی حیثیت سے اس سرزمین پر فرمانروائی کرتے رہے ہیں، بلگام کا عالی شان قلعہ (جس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اب تک باقی ہیں) اسی اسد خاں نے ۸۹۱ھ (۱) میں یوسف عادل شاہ بیجاپوری کے حکم سے تعمیر کیا تھا، اس کا اصلی نام خسرو تھا۔

۹۰۰ھ (۲) میں بیجاپور کے محاصرہ کے وقت خسرو نے ایسے کارنامے دکھائے کہ اس کے صلہ میں اسمٰعیل عادل شاہ نے اسد خاں کا خطاب اور بلگام اس کی جاگیر میں عنایت کیا، علاوہ علمی قابلیت کے اسد خاں میں دانشمندی، فراست، سخاوت اور تمام اخلاق حمیدہ خدا نے مجتمع فرما دیئے تھے، تینتالیس ۴۳ر برس تک اس نے شاہان بیجاپور کی وزارت ووکالت کے فرائض انجام دیئے اور اپنی سیر چشمی وفیاضی، تدبر ودانشمندی سے بلگام کو بڑے بڑے متمدن شہروں کا ہمسر کر دیا، اس کے فیل خانہ میں تین ۳۰۰ر سو ہاتھی، اصطبل میں عربی وایرانی چار سو ۴۰۰ر گھوڑے اور اسی ملک کی نسل سے اس سے بھی زیادہ رہتے تھے، اس کا دستر خوان نہایت وسیع تھا، ہزاروں آدمی ہر روز اس کے

---

(۱) مطابق ۱۴۸۶ء (۲) مطابق ۱۴۹۵ء

خوانِ کرم سے بہرہ اندوز ہوتے تھے، اربابِ کمال سے اس کی مجلس ہمیشہ بھری رہتی تھی، اور اس کی ہنر پروری، سیر چشمی کے افسانے دور دور سے علماء ومشائخ کو کھینچ کر بلگام لائے تھے، قابل اور فاضل لوگوں کے اجتماع سے یہ سرزمین مدتہائے دراز تک مرکزعلم رہی۔ ؂

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگار طاق نسیان ہوگئیں

عالمگیر مرحوم نے بیجاپور کو فتح کرنے کے لئے بلگام کو ۱۰۹۹ھ (۱) میں ممالک محروسہ میں شریک کرلیا، چونکہ بلگام کا قلعہ شہزادہ محمد اعظم نے فتح کیا تھا، اس مناسبت سے اسکا نام اعظم نگر قرار پایا، نواب سیف خان اس کے قلعدار مقرر ہوئے، چند دنوں کے بعد چین قلیچ خاں (نواب آصف الدولہ جاہ اول) بیجاپور کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور نواب سیف خان نے ان کی نیابت پر ترقی پائی، اور تقریباً ۱۱۰۶ھ (۲) میں صوبہ کا نظم ونسق بالاستقلال ان کو حاصل ہوگیا۔

بلگام میں نواب اسد خاں لاری کا مقبرہ ہمیشہ زیارت گاہِ خلائق رہا ہے، علاوہ اس کے بہت سے علماء وسادات اس سرزمین میں مدفون ہوئے ہیں، جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں، صرف ایک بزرگ کا میں نام لینا چاہتا ہوں، جو اپنے زمانہ کے مشائخ میں ممتاز

---

(۱) مطابق ۱۶۸۸ء (۲) مطابق ۱۶۹۵ء

درجہ رکھتے تھے، وہ حضرت شیخ عمر بن عبداللہ باشیبان حضرمی کا وجود گرامی ہے، سلسلہ عیدروسیہ سے ان کا تعلق تھا، بلگام میں ان کو جاگیر ملی تھی، عرصہ دراز تک ہدایت وارشاد کے فرائض انجام دیتے رہنے کے بعد ۱۰۶۶ھ(۱) میں وفات پائی اور بلگام میں مدفون ہوئے۔

اس سامعہ خراشی کا مقصد یہ ہے، کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ آپ کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہے؟ یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ بلگام کی مردم شماری کیا ہے، اور اس میں تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور علوم وفنون سے بے بہرہ کس قدر؟

مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آپ نے فرض کفایہ کے ادا کرنے کے لئے اپنے ابنائے وطن میں سے صرف ایک لڑکا دارالعلوم کو عنایت فرمایا تھا، اور افسوس ہے کہ وہ بھی وہاں کی تعلیم سے متمتع نہیں ہوسکا، لیکن اے باشندگان اعظم نگر! آپ کو غور کرنا چاہئے کہ کیا وہ فرض جو آپ کے ذمہ واجب الادا تھا، اس سے ادا ہوگیا؟ قرآن کریم کی آیۃ کریمہ "فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقّهوا في الدين" پر غور کیجئے، اس کے بعد میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

مولانا کے رفقائے کار

مولانا کے دورِ نظامت اور اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ناسپاسی اور حق پوشی ہوگی، اگر ان کے مخلص رفقائے کار اور معاونین کا تذکرہ اور ان کی خدمات کا اعتراف

(۱) مطابق ۱۶۵۶ء

نہ کیا جائے، جنھوں نے مولانا کو اپنا پورا تعاون دیا اور اپنی پوری صلاحیتوں اور خصوصیات کے ساتھ ان کی رہنمائی میں ندوہ کی خدمت انجام دی، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ندوۃ العلماء کی تاریخ میں اتنے باہمی اعتماد وتعاون اور اتنے سکون واطمینان کے ساتھ کبھی کام نہیں ہوا، ان کے رفقائے کار میں سب سے روشن نام اور کام منشی محمد احتشام صاحب رئیس کاکوروی اور صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں (فرزند والا جاہ امیر الملک نواب صدیق حسن خاں بہادر رئیس بھوپال) کا ہے۔

منشی احتشام علی کاکوروی

منشی محمد احتشام علی صاحب، منشی امتیاز علی صاحب مرحوم کے فرزند تھے، جو اودھ کے نامی وکیل وقانون داں تھے، اور بعد میں ریاست بھوپال کے مدار المہام ہو گئے تھے، حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے بیعت وارادت کا تعلق تھا جو آخر دم تک قائم رہا، ندوۃ العلماء کے اولین معاونین ومحسنین میں تھے، اور ان کی اور ان کے بزرگ عزیز منشی اطہر علی صاحب کی دعوت وتحریک ہی کی بنا پر دار العلوم کا قیام لکھنؤ میں عمل میں آیا، انھوں نے گولہ گنج میں نو ہزار روپے کی مالیت کا ایک مکان (جو اب خاتون منزل کے نام سے مشہور ہے) خرید کر ندوۃ العلماء کے حوالہ کیا جس میں ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۲ھ تک دار العلوم رہا اور اسی سے دار العلوم کے تمام قدیم ونامور فضلاء فارغ ہو کر نکلے۔

منشی صاحب دمِ واپسیں تک ندوۃ العلماء اور دار العلوم کے جان ودل سے حامی اور اپنی طاقت بھر اس کے کارکن اور خدمت گزار رہے، طویل عرصہ تک معتمد مال رہے، مولانا سید عبد الحی صاحب علالت یا عذر کی بنا پر جب کچھ طویل رخصت لیتے تو

وہی قائم مقام ناظم منتخب ہوتے، ۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ (۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء) کو ۷۵ سال کی عمر میں اپنی کوٹھی واقع خیالی گنج لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے وطن کاکوری کے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

منشی صاحب ریاست ووجاہت خاندانی کے ساتھ نہایت منتظم، معاملہ فہم اور باخبر شخص تھے، انگریزی داں تھے، عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے رکن رہے، وہ مشرقی تہذیب کا ایک دلآویز نمونہ تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں ان کی وفات پر لکھا تھا:

"کہنا چاہئے کہ اودھ میں قدیم شریفانہ جوہر، وضعداری، دین داری، مروت، سیرچشمی، غربا نوازی اور مسکین پروری کا یہ اخیر نمونہ تھا۔"

ان کے محبّ خاص اور رفیقِ قدیم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کی شائستگی کا، لباس میں، کھانے میں، نشست وبرخاست میں، معاشرت میں، گفتگو میں، پورا جلوہ نمایاں بلکہ تاباں تھا۔"

(مقالاتِ شیروانی)

ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ منشی احترام علی صاحب ندوہ کے معتمد مال منتخب ہوئے اور اخیر زندگی تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

نواب علی حسن خاں صاحب

صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خاں، امیر الملک

والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر رئیس بھوپال کے فرزند اصغر تھے، اساتذۂ بھوپال اور نامی گرامی علماء سے فارسی اور عربی اور علوم دینیہ کی تحصیل کی اور نوجوانی ہی میں اپنے والد نامدار کی ہدایت سے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت ہوگئے،(۱) عرصہ تک ریاست میں معزز تعلیمی عہدہ پر سرفراز رہے۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال کے انتقال کے بعد، جوان دونوں بھائیوں (نواب نورالحسن خاں اور نواب علی حسن خاں فرزندان نواب صدیق حسن خاں) پر مادرانہ شفقت رکھتی تھیں، ۱۹۰۱ء میں بھوپال سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ آگئے اور وہیں لال باغ میں ایک کوٹھی خریدی اور اس میں توسیع و اضافہ کر کے سکونت اختیار کی، جو عرصہ تک اہلِ علم و اہلِ کمال کی فرودگاہ رہی، اور علمی و ملی خدمات میں مشغول ہوگئے، ندوہ کی تحریک سے ان کو ہمیشہ سے شغف تھا، وہ علامہ شبلی سے ذوقاً وقلباً قریب تر اور ان کے سچے قدرداں تھے، اسی کے ساتھ ندوہ کے کاموں سے کبھی علاحدہ اور اس کی خدمت سے غافل نہیں رہے، مولانا سید عبدالحی صاحب کے دورِ نظامت میں معتمد مال رہے اور ان کے انتقال ۱۵ر جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ (۲ر فروری ۱۹۲۳ء) کے بعد وہی ناظم منتخب ہوئے اور اپنی عمر کے آخری دن تک ندوہ کے کاموں سے دلچسپی لیتے رہے۔

آپ ادیب، عالم، سخن فہم، سخن سنج اور صاحبِ قلم تھے، ''فطرۃ الاسلام'' اور ''مآثر صدیقی'' (۴ر جلد میں) ان کی بہترین کتابیں ہیں، اخیر میں ''مردم دیدہ'' کے نام سے ان باکمالوں کے حالات لکھ رہے تھے، جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا، ۳رر مضان ۱۳۵۵ھ (۱۹ر نومبر ۱۹۳۶ء) کو ۷۲ر سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۱) ملاحظہ ہو! مضمون ''سفر سعادت'' تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی از مولف۔

خصوصی معاونین

مقامی ارکان میں سے مولوی سید ظہور احمد صاحب (۱) وکیل اور مولوی محمد نسیم صاحب (۲) وکیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو شہر کے مشغول ترین اور نامور ترین وکیل ہونے کے ساتھ ندوہ کے بے عذر خادم اور دائمی ہمدرد تھے، خاص طور پر قانونی اور انتظامی امور میں، جن کا تعلق حکومت و دفاتر سے ہوتا، ان کی قانونی مہارت وذہانت اوران کی معاملہ فہمی بڑی کام آتی۔

اسی طرح مولانا غلام محمد صاحب شملوی کا کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے، ہمارے محدود علم میں کسی اور تحریک کو شاید ہی ان سے زیادہ بااثر، خوش بیان، سلیقہ مند و خوش تدبیر اور سرگرم سفیر ووکیل ملا ہوگا، انھیں کی مساعی جمیلہ سے پچاس ہزار کی گرانقدر رقم ریاست بھاولپور سے ندوہ کے ہاتھ آئی، وہی بالعموم ندوہ کے سالانہ جلسوں کے لئے زمین ہموار کرتے، عمائدِ شہر سے دعوت بھجواتے، پھر جلسہ کے نظم ونسق

---

(۱) مولوی سید ظہور احمد صاحب الٰہ آباد کے ایک قصبہ منڈارا کے رہنے والے تھے، لیکن زندگی لکھنؤ میں گزری، اودھ چیف کورٹ کے کامیاب وکلاء میں انکا شمار تھا، عرصہ تک آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری رہے، خاموش، نہایت نیک نفس بزرگ تھے، ندوہ کے سرگرم رکن اوراس کے ممتاز مشیر کار تھے، اوراس کی تمام مجلسوں کے اہم رکن رہے، ۱۲/ جمادی الآخرۃ ۱۳۶۱ھ ۲۷/ جون ۱۹۴۲ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے دفعتاً انتقال کیا۔

(۲) آنریبل مولوی محمد نسیم صاحب گڑھی بھٹول ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، اودھ کے چوٹی کے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، اور ایک زمانہ میں لکھنؤ میں ان کا طوطی بولتا تھا، اسی کے ساتھ دینی رجحان نمایاں تھا، مولانا شاہ وارث حسن صاحبؒ سے بیعت کا تعلق تھا، اور نہایت خوش اوقات بزرگ تھے، آخر عمر میں صرف دینی کتابوں کے مطالعہ اور اذکار واشغال سے شغل رہ گیا تھا، تین فرزند تھے، محمد وسیم صاحب بیرسٹر، پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل، پروفیسر محمد حبیب سابق صدر شعبہ تاریخ وسیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اور پروفیسر محمد مجیب حال وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ۱۸/ صفر ۱۳۷۳ھ، ۲۷/ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو انتقال کیا۔

اور مقاصد کی تکمیل میں اپنی ذہانت اور موقع شناسی سے پورا کام لیتے، ان کے بعد مولوی نظام الدین صاحب جھجھری کا نام آتا ہے، جنھوں نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ندوہ کی سفارت اور مقاصد کی تبلیغ واشاعت کا کام انجام دیا، اور جلسوں کو کامیاب بنایا۔

خصوصی کارپرداز

خاموش اور گمنام کام کرنے والوں میں جو مولانا کے (خاص طور پر تحریری کاموں میں) دست وبازو تھے اور جو پورے دفتر رسالہ "الندوہ"، رودادوں کی ترتیب اور مراسلت کی ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے تھے، دو نام بھلائے جانے کے قابل نہیں، ایک مولوی سید عبدالغفور صاحب شر رندوی (۱) مددگار ناظم کا نام، جنھوں نے بڑی تندہی اور خلوص کے ساتھ ناظم ندوۃ العلماء کا ہاتھ بٹایا، مولانا نے مجلسِ انتظامی میں بارہا ان کی لیاقت وکارکردگی کو سراہا ہے، دوسرا نام مولانا اکرام اللہ خاں

---

(۱) مولوی سید عبدالغفور صاحب قصبہ استھاواں بہار کے رہنے والے تھے، جو ایک مردم خیز قصبہ اور سادات کی مشہور بستی ہے، انھوں نے ۱۳۲۶ھ، ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم سے فراغت کی، فراغت کے کچھ عرصہ بعد محرر مراسلات کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا، اور وہ قابلیت ومستعدی سے اس خدمت کو انجام دیتے رہے، ۱۳۳۳ھ، ۱۹۱۵ء میں مولانا عبدالحی صاحب کے ناظم منتخب ہونے کے بعد وہ ان کے پیش کار مقرر ہوئے، اور ۱۳۳۷ھ، ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ مددگار ناظم ندوۃ العلماء کے عہدہ پر ان کا تقرر کیا گیا، مولانا سید عبدالحی صاحب کے وہ نہ صرف نظامت کے کاموں میں مددگار تھے بلکہ انکے خصوصی معتمد علیہ اور سکریٹری بھی تھے، اور عام طور پر سب حساب کتاب انھیں کے پاس رہتا تھا، مولانا کے نہایت مخلص، وفادار اور بے لوث مددگار تھے، ان کے انتقال کے بعد بھی اسی حیثیت سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم ومولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے دورِ نظامت میں بھی کام کرتے رہے، ۲۲ر ربیع الاول ۱۳۷۹ھ، ۲۵ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو انتقال ہوا، شعر وسخن میں نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری سے تلمذ اور ربط حاصل تھا، انہی کے اہتمام میں جلیل کے اکثر دواوین شائع ہوئے۔

صاحب ندوی (۱) کا ہے، جنھوں نے دار العلوم کے اندر اور ندوہ کے دفتر میں نیز مدیر ''الندوہ'' اور رودادوں کے مرتب کی حیثیت سے اپنی غیر معمولی لیاقت ومحنت کا اظہار کیا اور مولانا کے معتمد اور معاون رہے، اس سلسلہ کا ایک تیسرا نام مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب حسنی ندوی مرحوم کا ہے، جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی اور ایک طرح سے تربیت یافتہ تھے، مختلف حیثیتوں سے انھوں نے دار العلوم، کتب خانہ اور دفتر ندوۃ العلماء میں خدمات انجام دیں، مولوی سید عبد الغفور صاحب کی غیر موجودگی میں وہی مولانا کے معتمد اور معاون ہوتے۔(۲)

اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی مغفرت فرمائے اور ان کی مساعی جمیلہ اور خدمات جلیلہ کو قبولیت سے نوازے۔

---

(۱) مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، مطیع اللہ خاں صاحب شاہجہاں پوری کے فرزند، ۱۳۳۱ھ، ۱۹۱۳ء میں دار العلوم سے فارغ ہوئے اور عرصہ تک دفتر ندوۃ العلماء سے منسلک رہے، ڈھائی سال (جولائی ۱۹۱۴ء تا دسمبر ۱۹۱۶ء) تک ''الندوہ'' کے ایڈیٹر رہے، اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی کی خواہش پر مسلم ایجوکیشن کانفرنس علی گڑھ کے صدر دفتر منتقل ہو گئے، اور بقیہ زندگی اسی کی خدمت میں گزاری، ۱۳۳۳ھ، ۱۹۱۵ء میں طلبائے قدیم کی طرف سے ندوہ کی مجلسِ انتظامی کے رکن منتخب ہوئے، ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء سے آخر عمر تک براہِ راست رکن انتظامی منتخب ہوتے رہے۔

مولانا اکرام اللہ خاں صاحب نہایت سنجیدہ، متین وحلیم، اردو کے کہنہ مشق اہل قلم، کامیاب سوانح نگار اور علم مجلسی میں نہایت فائق تھے، ان کی کتاب ''وقار حیات'' اردو کے بہترین تذکروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے، ۱۸ ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ، ۱۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو علی گڑھ میں انتقال کیا، غفر اللہ لہ۔

(۲) مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم کے والد کا نام سید محمد یقین صاحب تھا، ان کا خاندانی تعلق صاحبِ سوانح کے خاندان قطبی حسنی سے تھا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے دور اول میں تعلیم پائی، جب وہ خاتون منزل گولہ گنج میں تھا، اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی وغیرہ طالب علم تھے، پھر دار العلوم میں بحیثیت مدرس فارسی اور کتب خانہ میں نائب ناظر کی حیثیت سے کام کیا، راقم نے صرف ونحو اور ابتدائی عربی کی تعلیم ان سے پائی، نہایت غیور، منتظم اور رعب داب کے بزرگ تھے، نسخ ونستعلیق میں نہایت پختہ اور شیریں لکھتے تھے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

طویل و مسلسل دورِ خدمت و رفاقت

بہر حال مولانا سید عبدالحی صاحب ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء تک ربع صدی سے زائد مختلف حیثیتوں سے ندوۃ العلماء سے وابستہ اور سرد و گرم، عسر ویسر، تنزّل وترقی اور انتشار و یکجہتی میں یکساں طور پر اس کے ہمسفر و دمساز رہے، اور کسی دور میں بھی آپ کے پائے ثبات میں لغزش اور استقلالِ طبیعت میں فرق نہ آیا، ندوۃ العلماء کے دائرہ کے اندر اور ہندوستان کے وسیع رقبہ میں بھی بڑے بڑے سیاسی طوفان آئے، بڑے بڑے انقلابات اور آزمائشوں سے اس تحریک و ادارہ اور پورے ملک کو گزرنا پڑا، لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم رہے اور اپنے لئے خدمت کا جو راستہ عنفوانِ شباب میں تجویز کیا تھا، اس پر دمِ واپسیں تک ثابت قدم رہے، آپ کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ فروری ۱۹۲۳ء کے "معارف" میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا، وہ لکھتے ہیں:

> "مولانا سید محمد علی صاحب ناظم تھے، ان کی نگاہِ انتخاب فوراً اس جوہرِ قابل پر پڑی، وہ دن ہے اور انکی وفات کا دن ہے کہ ندوہ ان کی خدمات سے کبھی محروم نہیں رہا، ندوہ پر کیا کیا انقلابات

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اپنے برادر محترم مولانا سید عبدالحی صاحب سے گہری عقیدت اور محبت رکھتے تھے، اور ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، انجمن آل ہاشم کو (جسکی بنیاد مولانا سید عبدالحی صاحب کے ہاتھ سے پڑی تھی اور عرصہ سے مردہ اور معطل تھی) دوبارہ زندہ کیا، اور اس کے ذریعہ خاندان کے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا انتظام اور بے روزگاروں کو روزگار دلانے کی کوشش کی، مولانا مدنیؒ سے بیعت کا تعلق تھا، اور نہایت خوش اوقات، ذاکر وشاغل تھے، ۱۶ر شوال ۱۳۷۷ھ (۶ر مئی ۱۹۵۸ء) کو وفات پائی اور حضرت شاہ علم اللہؒ کے حظیرہ میں دفن ہوئے، مولوی سید ابوبکر حسنی ایم.اے. حال استاد عربی نہرو یونیورسٹی دہلی ان کے فرزند ہیں۔

آئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے اور کتنے گئے، کتنے معتمد وناظم عزل ونصب ہوئے، کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے، مگر ان تمام حالات وحوادث کے طوفان میں ثبات و استقلال کی صرف ایک چٹان تھی جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کی ذات تھی۔"

اور جب ان کے دیرینہ رفیقِ کار، صدیقِ حبیب، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ان کی وفات کے بعد ندوہ کے پہلے جلسۂ سالانہ منعقدہ لکھنؤ شعبان ۱۳۴۳ھ (مارچ ۱۹۲۵ء) کی صدارت کی اور وہ اسٹیج پر آئے اور ان کی نگاہوں نے، جو اس چہرہ کو ہمیشہ دیکھنے کی عادی تھیں، جب انکو نہ دیکھا تو بصد حسرت ویاس فرمایا:

"حضرات! جب کہ میں اس مجمع عظیم پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میری نیاز آگیں آنکھیں اس چہرہ کو ڈھونڈھتی ہیں جو جمال وکمال کے نور سے ہمارے دلوں کو ایک ثلث صدی تک منور کرتا رہا، جمال میں حسب ونسب کا نور تھا، کمال میں علم وعمل کا، میری مراد مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء سے ہے، کسی مقصد عالی کے حصول میں مخلصانہ اتحادِ عمل دلوں میں وہ ربط وتعلق پیدا کر دیتا ہے جس کو موت بھی فنا نہیں کر سکتی، یہی ربط ہے جو ہماری نگاہوں کو اس پاکیزہ صورت کی تلاش میں ہر طرف لے جاتا ہے، آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر ان کے حسنِ عمل کا نور ندوۃ العلماء کے درودیوار سے تاباں ہے اور فضل ربانی شامل

حال ہے تو صدیوں تک رہے گا، سید صاحب مرحوم کی مردم شناسی، معاملہ فہمی، علمی خدمات اور اخلاصِ عمل، وہ صفات ہیں جو اپنی آپ ہی نظیر ہیں، رحمہ اللہ تعالیٰ وجزاہ عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء."(۱)

❑❑❑

(۱) روداد اجلاس نوزدہم، ندوۃ العلماء بمقام لکھنؤ/ص ۳۰۔

باب ہفتم

عائلی زندگی، طبابت وکسب معاش، نظام الاوقات، مرض ووفات

عائلی وخانگی زندگی

کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم وفاضل، مصنف ومفکر، سیاسی رہنما یا دین وملت کا خادم ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے اسکی عائلی ومعاشرتی زندگی، اس کے اپنے اہل وعیال اور گھر والوں کے ساتھ اخلاق وتعلقات، اس کے متعلق ان کا تأثر اور شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور خواہ کوئی شخص اپنے اجتماعی وملی مقاصد کی تکمیل میں کتنا ہی انہماک اور تصنیف ومطالعہ میں کتنا ہی استغراق رکھتا ہو اس کی ذاتی اور گھریلو زندگی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، بلکہ درحقیقت اس کے کامل انسان اور مثالی مسلمان ہونے کا یہی معیار ومیزان ہے، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے "خیر کم خیر کم لأهله وأنا خیر کم لأهلی" (۱) (تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے بہتر ہوں) پھر ملّی واجتماعی خدمت میں شدید مشغولیت، گوناگوں ذمہ داریوں، عشق واستغراق کی حد تک پہونچے ہوئے ذوقِ مطالعہ وتصنیف کے ساتھ خانگی زندگی کے جھمیلوں اور نزاکتوں کو خوشگواری کے ساتھ نباہنا، اہل وعیال کے نہ صرف حقوق ادا کرنا اور ضوابط کی پابندی کرنا، بلکہ ان

(۱) ترمذی عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔

کے ساتھ جذباتی لگاؤ، انس ومحبت اوران کی رعایت ودلجوئی ایک ایسی شخصیت کے لئے جس کو ''فنا فی العلم'' و ''فنا فی التصنیف'' کا خطاب دینا بیجا نہ ہوگا، اعلیٰ درجہ کے توازن اور اعتدال کی دلیل اوراس ذات قدسی کا پرتو ہے جس کی زبان سے دنیا نے ''رفقاً بالقواریر'' (۱) کے الفاظ سنے، اور جو اپنی نماز کو جس سے زیادہ محبوب شئے اس کے نزدیک کوئی اور چیز نہیں تھی کسی بچے کی آواز کو سن کر مختصر کردیا کرتا تھا، کہ شاید اس کی ماں جماعت میں ہو اوراس کی طبیعت بچہ کے رونے سے پریشان ہورہی ہو، مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کی عائلی اور داخلی زندگی اس نور سے منور تھی، وہ باہر کی دنیا کے لئے ایک عظیم مصنف وعالم تھے، ندوۃ العلماء کے حلقہ کے لئے ایک ملی کارکن اور کامیاب ناظم تھے، اہل شہر کے ایک حاذق طبیب اور کامیاب معالج تھے، اور اہل محلّہ کے لئے ایک دینی پیشوا اور بابرکت ہستی تھے، لیکن گھر والوں کے لئے ایک سرپرستِ خاندان، ایک رقیق القلب اور پُرمحبت انسان، ایک شفیق باپ اور ناز بردار مربی تھے، اور آپ کی خانگی زندگی ہر حیثیت سے پرمسرت وخوشگوار اور پرسکون وباوقار تھی۔

۷؍جمادی الآخرۃ ۱۳۰۹ھ (۱۰؍دسمبر ۱۸۹۱ء) یوم جمعہ آپ کا اپنے ماموں مولوی سید عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی سے عقد ہوا تھا، یہ بی بی بڑی نیک، سلیقہ مند اور فرمانبردار تھیں، ۱۳۱۹ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، جب کہ آپ کی عمر صرف ۳۳؍سال تھی، آپ کی حساس، محبت آشنا اور وفا شعار طبیعت پر قدرتاً اس کا بڑا اثر پڑا، جس کا اندازہ اس عربی مرثیہ سے ہوتا ہے، جس میں آپ نے اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا ہے۔

---

(۱) حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ شغدف میں سوار تھے، ساتھ بعض ازواج مطہرات بھی تھیں، ساربان نے جس کا نام انجشہ تھا، حدی خوانی شروع کردی، جس سے عرب میں اونٹ بے خود اور تیز رفتار ہوجاتے ہیں، آپ نے انجشہ کو خطاب کرکے فرمایا ''رفقا بالقواریر'' انجشہ شیشوں (نازک ہستیوں) کا خیال رکھو۔

إلى الله أشكو من فراق وغربة بليت بها من بعد وصل وقربة

فيا طول حزني وابتلائي بمحنة ويا عظم خطبي من أذلها وحسرتي

ويا حسرتي من وحدتي وتجشمي ويا أسفي يا هم قلبي ولوعتي

أيا أسرتي بالله هل غاب عنكم كما غاب عني نور عيني و مهجتي

أ زينب هل آنستِ مني بغدرة فعذّبتني في نار همّ وفرقة

رحلت وقد قامت هموم نواصب وغبت وقد نامت عيون المسرة

مرحومہ نے صرف ایک یادگار اپنے پیچھے چھوڑی تھی (مولوی حکیم ڈاکٹر) سید عبدالعلی، جو اس وقت صرف نو سال کے تھے، چونکہ یہ حادثہ لکھنؤ میں اچانک پیش آیا تھا اور طرفین میں نہایت محبت وموافقت تھی، اس لئے مولانا کی طبیعت پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور انھوں نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا، آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید فخر الدین صاحبؒ اور حضرت سید شاہ ضیاء النبی صاحبؒ، دونوں حضرت مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادیؒ کے مجاز اور قرابتوں اور خاندانی رشتوں میں منسلک تھے، اور دونوں میں نہایت اتحاد والفت تھی، اس حادثہ کے بعد ان کے دل میں اس بات کا شدید تقاضہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے صاحبزادہ کی دوسری شادی حضرت شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کی ان صاحبزادی سے کریں جو اپنی دینداری، سلیقہ مندی اور پڑھنے لکھنے کے ذوق کی وجہ سے ان کو نہایت عزیز تھیں، لیکن مولانا کی طبیعت شادی کی طرف بالکل راغب نہ تھی، اور ان کی طرف سے انتہائی سعادت مندی کے باوجود اس معاملہ میں مسلسل خاموشی تھی، راقم سے مولانا کے نہایت بے تکلف اور عزیز دوست منشی عبدالغنی صاحب مرحوم نے یہ واقعہ سنایا کہ میں ایک مرتبہ رائے بریلی گیا، مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب نے مجھ سے بڑے درد سے کہا کہ ہماری ڈیوڑھی اب بے چراغ

رہے گی، سید شادی نہیں کرنا چاہتے، ہمارے بعد اس گھر میں کوئی چراغ جلانے والا بھی نہ گا، تم سید (۱) کو اس پر راضی کرو، میں نے لکھنؤ میں آ کر مولوی صاحب سے کہا کہ آپ کے والد صاحب کی بڑی خواہش اور تمنا ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں، اگر آپ نے انکار کیا تو ان کی ناراضگی کا ڈر ہے، آخر کار مولانا باپ کی اطاعت اور تعمیل حکم کے خیال سے راضی ہو گئے اور شاہ ضیاء النبی صاحب کے یہاں پیغام بھیج دیا گیا۔

مرقعہ خطوط میں بھی ان کے والد ماجد کا ان کے نام ایک خط ہے، جس میں اس اطلاع کے بعد کہ میں نے شاہ ضیاء النبی صاحب کے یہاں تمہارا پیام دیدیا ہے، یہ الفاظ آئے ہیں: "زنہار زنہار! میرے خلاف مرضی کے نہ کرنا کہ میری پسند میں تمہارے دارین کی بہبود وفلاح مضمر ہے اور مجھ سے بڑھ کر تمہارا بہی خواہ کون ہوگا۔"

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خاندان میں شاہ ضیاء النبی صاحب کا گھر سب سے زیادہ کھاتا پیتا اور خوشحال و باوجاہت تھا، بلکہ ضلع کے نامی گرامی زمینداروں میں ان کا شمار تھا، اور مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کے یہاں اسی قدر اس چیز کی کمی تھی، گھر میں کسی کسی وقت فاقہ ہو جانا بھی کوئی نادر بات نہ تھی، مولانا سید عبدالحی صاحبؒ نظامتِ ندوۃ العلماء میں چالیس پچاس روپے ماہوار کے ملازم تھے اور وہی دونوں گھروں کے متکفل تھے، ایسی حالت میں جب یہ پیام پہنچا تو مستورات کو اس کے قبول کرنے میں بڑا تردد ہوا کہ عورتیں ان معاملات میں زیادہ دوربیں اور حساس ہوتی ہیں، لیکن حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کو مولانا سید عبدالحی صاحب کے ساتھ بڑی محبت تھی، انھوں نے شاہ صاحب سے روحانی استفادہ بھی کیا تھا، اور وہ ان کی علمیت وصلاحیت سے بھی واقف تھے، پیام آتے ہی منظور کر لیا، اور ۱۳۲۲ھ

---

(۱) خاندان میں مولانا کی یہی عرفیت تھی۔

(۱۹۰۴ء) میں یہ رشتہ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت دی، (۱) اور آخر عمر تک انھوں نے رفاقت و خدمت کا فرض انجام دیا اور مولانا کو ایسا سکون خاطر اور دلجمعی نصیب ہوئی کہ وہ اطمینان کے ساتھ اپنی دینی خدمات اور تصنیفی مشاغل کو انجام دے سکے۔

طبابت وکسب معاش

غالباً ۱۹۰۵ء ۱۳۲۳ھ میں عقد ثانی کے بعد جب دفتر نظامت شاہجہاں پور سے لکھنؤ منتقل ہوا، آپ نے ترکِ ملازمت کا مستقل ارادہ کرلیا اور رضا کارانہ طریقہ پر بلا معاوضہ ندوۃ العلماء کی خدمت کا عزم فرمایا، چنانچہ آپ نے مددگار ناظم کی تنخواہ جو اس وقت پچاس روپے تھی، ترک کردی اور مطب شروع کیا، محلّہ بازار جھاؤلال ہی میں، جہاں سکونت تھی، ایک کمرہ میں آپ نے مطب کا سلسلہ شروع کردیا، پہلے مہینہ میں جو آمدنی ہوئی وہ آپ نے پوری والدہ ماجدہ کی خدمت میں بھیج دی، (۲)

---

(۱) ان ہی بی بی سے جن کا نام خیر النساء تھا، راقم سطور اور اس کی دو بہنیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے والدہ صاحبہ کو حفظ قرآن کی دولت، نوافل وعبادت کے ذوق، دعا اور مناجات کی حلاوت سے نوازا تھا، اور بڑی موزوں طبیعت عطا فرمائی تھی، ان کے کلام کے دو مجموعے ''باب رحمت'' اور ''کلید باب رحمت'' کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں جو سراسر مناجات ونعتیہ کلام پر مشتمل ہیں، اور بہت سے دیندار گھرانوں میں وظیفہ کی طرح پڑھے جاتے ہیں، تصنیفات میں ''ذائقہ'' اور ''حسنِ معاشرت'' مطبوعہ ''الدعاء والقدر'' (غیر مطبوعہ) اپنی زندگی کے حالات اور دعاؤں کی قبولیت کے تجربات میں یادگار ہیں، ۱۹۴۷ء، ۱۳۶۶ھ میں حج وزیارت کی سعادت سے بھی بہرہ یاب ہوئیں، اور نصف سال سے زائد حرمین شریفین میں قیام کا موقع ملا، طویل عمر پاکر شب وروز عبادت ودعا اور ذکر واذکار میں گذری تھی، ۷/ جمادی الآخرۃ ۱۳۸۸ھ (یکم ستمبر ۱۹۶۸ء) کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور ۴۷/ سال کی مفارقت کے بعد اپنے باکمال شوہر اور رفیقِ زندگی سے جا ملیں، اور ان کے پہلو اور شیخ المشائخ شاہ علم اللہؒ کی زوجہ محترمہ کی پائیں آسودہ خاک ہوئیں، ان کے مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو ''رضوان'' کا محترمہ خیر النساء بہتر نمبر بابت نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء۔

(۲) بروایت والدہ صاحبہ مرحومہ۔

۳۸ رسال کی عمر میں آپ نے باقاعدہ مطب شروع کیا اور آخر عمر تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔

مولوی حکیم سید ڈاکٹر عبدالعلی صاحب لکھتے ہیں:

''معاش حاصل کرنے میں مولانا کو کوئی انہماک نہیں تھا، آپ کی سیرت توکل کا پورا مظہر تھی، کبھی اس پر غور کرنا تو کجا یہ خیال بھی دل میں نہ آتا تھا کہ مطب کی آمدنی بڑھانے کی تدبیریں کی جائیں، جس زمانہ میں آپ کی آمدنی گھٹ جاتی تھی تو بجائے اس کے کہ آپ وہ طریقے اختیار کرتے جو دنیادار پیشہ ور اختیار کرتے ہیں، مغرب کے بعد مسجد میں جا کر بیٹھ جاتے اور قرآن مجید کی بعض سورتیں تلاوت کرتے رہتے، وہ جائز صورتیں بھی جو آپ مریضوں کی توجہ مائل کرانے کے لئے اختیار کر سکتے تھے، کبھی آپ کے وہم میں بھی نہ گزرتی تھیں، آپ کا مطمحِ نظر مریض کا نفع رہتا تھا اور اسی کے لئے اکثر ایسا ہوتا کہ مریض حال کہتا اور آپ نبض دیکھتے اور جب آپ تشخیص کر لیتے بغیر اس کے مریض حال کہنا ختم کرے نسخہ لکھوا دیتے، اسی لئے بعض لوگوں کو شکایت رہتی کہ آپ توجہ نہیں کرتے اور اس طرح سے آپ کے مطب کو نقصان پہونچتا تھا، اگر آپ چاہتے تو اور طبیبوں کی طرح اپنی نباضی کو فروغ کا آلہ بنا سکتے تھے، اگر آپ نبض سے تشخیص کے بعد بجائے نسخہ لکھوانے کے مریض کے حال کو خود بیان کر دیا کرتے تو آپ کے پیشہ پر اس کا بہت اچھا اثر

پڑتا، مگر اسے آپ تضییع اوقات سمجھ کر گوارہ نہ کرتے تھے، آپ مریضوں سے بیکار باتیں بھی نہ کرتے، صرف اتنی ہی گفتگو کرتے جتنی ضرورت ہوتی، جب آپ کو تشخیص پر اعتماد نہ ہوتا تو مریض کو مشورہ دیتے کہ کسی اور طبیب، ڈاکٹر سے رجوع کرے، اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی شخص آپ کو کسی مریض کے دیکھنے کے لئے فیس دے کر لے جانا چاہتا اور مریض کی حالت سن کر اسے اس قابل سمجھتے کہ مکان پر آسکتا ہے تو آپ مشورہ دیتے کہ مکان پر لے آئے، اس طرح آپ کی فیسیں ضائع ہوتی تھیں، اکثر آپ ندوہ کے جلسوں یا احباب واعزا کے علاج بلا معاوضہ یا اور کسی سبب سے باہر چلے جاتے اور جب آپ کے مطب کو نقصان پہنچ جاتا اور آپ کے بہی خواہ عرض کرتے تو کہتے رزق کا ذمہ دار خداوند تعالیٰ ہے، یا ہنس کر چپ ہو جاتے، بہت سے گھرانوں کے علاج آپ بلا فیس کرتے تھے، (۱) ''فن طب میں آپ دو امور میں ممتاز تھے، ایک اصول کی پابندی، دوسرے تشخیص ونباضی، نسخہ قلیل الاجزاء اور ارزاں لکھتے تھے، حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے اکثر نسخے بیاض سے نقل کروا دیتے تھے۔'' (۲)

جو لوگ آپ کے مطب میں آتے تھے وہ مشکل سے دوسرے اطباء کی طرف رجوع کرتے، آپ نے بڑے بڑے عسیر العلاج اور مزمن امراض کا چند مفردات اور

---

(۱) ترجمۂ مصنف/ص/۱۶۔

(۲) ایضاً/ص/۲۲۔

معمولی وروزمرہ ادویہ سے علاج کیا،(۱) لکھنؤ کے بہت سے گھرانوں میں آپ کے نسخے بہت عرصہ تک استعمال ہوتے رہے اور لوگوں نے بیاضوں اور کتابوں پر وہ نسخے لکھ لئے، بہت سے فضلائے مدارس اور ذی استعداد علماء نے آپ سے طب کی کتابیں پڑھیں اور مطب سیکھا، ان میں مولانا حکیم شاہ یاور حسین صاحب (۲) گوپاموی برادر نواب ناظر حسین صاحب رئیس گوپامئوی، ومولوی حکیم بہاء الدین گوپاموی، مولوی حکیم فضل الرحمٰن صاحب سواتی حال مقیم آمبور صوبہ مدراس، مولانا افضل علی صاحب ساکن صبیحہ ضلع بارہ بنکی مجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حکیم عبدالمجید خاں اعظمی اور خود آپ کے فرزند اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظام الاوقات

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھتے ہیں:

"روزانہ کے معمولات یہ تھے، سویرے اٹھ کر نماز پڑھتے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے، اسکے بعد مطالعہ میں مصروف ہوجاتے یا تصنیف کا کام شروع کردیتے، اتنے میں چائے

(۱) مولانا سید طلحہ صاحب ایم.اے. جو مولانا سید عبدالحی صاحب کی غیر موجودگی میں بعض زمانوں میں ان کے مطب میں بیٹھتے تھے اور حکیم غلام رضا خاں شریفی دہلوی کے شاگرد ہیں، اس قسم کے کئی واقعات بیان کرتے ہیں کہ نے چند روزمرہ کے مفردات سے جو سوءِ ہضم وغیرہ کے علاج میں استعمال ہوتے ہیں، لکھنؤ کے نامی گرامی حکماء کے مقابلہ میں مالیخولیا اور مراق وغیرہ کا علاج کیا اور کامیاب رہے۔

(۲) مولانا (ابوسعید محمد) یاور حسین صاحب، قصبہ گوپامئو ضلع ہردوئی کے مشہور فاروقی خاندان کے چشم وچراغ تھے، جس کے ایک نامور اور حوصلہ مند فرد خان جہاں نواب انورالدین خان نے بارہویں صدی کے وسط میں جنوبی ہند میں ایک سلطنت قائم کرلی تھی، جوارکاٹ کے نام سے عرصہ تک قائم رہی اور اس کے حکمراں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آجاتی، چائے پی کر پھر مطالعہ میں مصروف ہوجاتے یا مطب کا وقت آجاتا تو مطب چلے جاتے، مطب سے آکر کھانا کھاتے یا مطالعہ وتصنیف میں مصروف ہوجاتے، کھانے کے وقت کھانا کھاکر قیلولہ کرتے، ظہر کے وقت اٹھ کر نماز پڑھ کر پھر مطالعہ و تصنیف شروع کردیتے، یہاں تک کہ عصر کا وقت آجاتا، عصر کی نماز پڑھ کر اگر کوئی ملنے آجاتا تو اس سے ملتے ورنہ پھر مطالعہ و

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) نواب والا جاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ میں پیدائش ہوئی، والد کا نام نواب عاشق حسین تھا اودھ کے مشترک خاندانوں کے نظام کی بنا پر (جس میں خاندان کا بڑا فرد اصل جاگیردار اور منتظم قرار پاتا تھا) ان کا بچپن نہایت عسرت و جفاکشی میں گذرا ابتدائی تعلیم وطن میں پائی پھر جامع العلوم کانپور میں درسیات کی تکمیل کی ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور وہاں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور دوسرے اساتذۂ حدیث سے حدیث کی تکمیل کی دیوبند سے آنے کے بعد ۱۳۲۴ھ میں مدرسہ طبیہ دہلی میں داخل ہوئے پھر وہاں کی تعلیم ترک کرکے لکھنؤ آکر مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سے تعلیم شروع کی اور کتب طب سبقاً سبقاً پڑھیں مطب میں پابندی سے حاضری دی ۱۳۲۶ھ میں مولانا سید سرفراز علی صاحب کے ہاتھ پر ہردوئی میں بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ قادریہ میں داخل ہوئے، چند سال کے بعد ۱۳۳۹ھ میں اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے مرشد نے خلافت نامہ لکھ کردیا جس میں ان کے مقامات وکمالات روحانی کا بلند الفاظ میں اظہار واعتراف تھا، تصنیفات کی تعداد باون ہے جو زیادہ تر اصلاحی وفقہی اور سیرت ومناقت کے موضوع پر ہیں۔

گوپامئو واپس آکر درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ روحانی مدارج عالیہ ومبشرات وفیوض باطنی سے حصۂ وافر پایا تھا اتباع شریعت واستقامت اور مشغولیت بحق میں اپنے زمانے میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔

۱۳۴۲ھ میں اعصاب پر فالج کا اثر محسوس ہوا، تین روز تک برابر روتے رہے، رفتہ رفتہ پورے جسم اور اعصاب میں تعطل پیدا ہوگیا اسی حالت میں کئی برس گذارے، لیکن معمولات واوراد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، راقم سطور نے ان کو اس حالت میں دیکھا جب کہ جسم کے کسی عضو میں کوئی حرکت نہ تھی لیکن تمام معمولات اپنے وقت پر ادا ہورہے تھے۔

۱۸ رمضان ۱۳۶۰ھ کو انتقال فرمایا اور حسب وصیت صحن مسجد خیر اللہ شاہ صاحب کے سامنے دفن کیا گیا۔

تصنیف میں مصروف ہو جاتے، اگر طبیعت سست ہوتی تو کبھی
کبھی مکان یا مسجد کے سامنے گلی میں چہل قدمی کر لیتے، مغرب
کی نماز کے بعد پھر مطالعہ وتصنیف میں مصروف ہو جاتے، اسی
درمیان میں کھانا کھا لیتے اور نماز پڑھ لیتے۔
مریضوں کو دیکھنا اور ان کا حال سننا، نسخوں میں ترمیم کرنا، احباب
سے ملنا، ندوہ کا کام کرنا، ان کاموں کے اوقات مقرر نہیں تھے،
ندوہ کا کام کبھی مطب کے بعد، کبھی ظہر کے بعد کرتے تھے۔"(۱)

درس وتدریس ووعظ وتذکیر

ندوۃ العلماء کے کام اور تصنیفی مشاغل اور علاج ومعالجہ کی مشغولیت کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ اکثر جاری رہتا تھا، اپنے فرائض منصبی کے علاوہ ابتداء میں کچھ عرصہ تک آپ نے دارالعلوم میں تعلیمِ ادب وافتا کے فرائض بھی انجام دیئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ سے "مقامات حریری" پڑھی ہے، سید صاحب نے کئی بار ذکر فرمایا کہ مولانا مرحوم کا معمول تھا کہ پچھلا سبق سنے بغیر اگلا سبق نہیں پڑھاتے تھے، بعض زمانوں میں آپ نے بعض ذی استعداد طلبہ کو "شمس بازغہ" پڑھائی جو فلسفہ کی ایک بلند پایہ کتاب ہے، مولوی حکیم محمد حنیف علی صاحب، رعب شاہ آبادی مرحوم کے (جو ایک جید الاستعداد عالم اور عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں قادرالکلام شاعر تھے اور جنھوں نے ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا) کلیات کے مقدمہ میں ان کے شاگرد رشید منشی عبدالرحمٰن خاں لکھتے ہیں: "منقولات میں مولانا حاجی مولوی امیر علی صاحب محدث مترجم ہدایہ اور ادب ومعقولات حکیم مولوی عبدالحی

(۱) ترجمہ مصنف/ص ۲۰۔

صاحب مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء سے مطالعہ فرمائی۔‘‘ (۱)

مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھتے ہیں:

’’ادب، حدیث، قرآن، طب کا درس دیتے تھے، ادب کا درس برسوں سے، طب کا درس چند سال سے چھوٹ گیا تھا، مگر حدیث کا درس وفات کے دن تک جاری رہا، آخری زمانہ میں حدیث کا درس چند گھنٹوں کے مطالعہ کے بعد دیتے تھے، اکثر بارہ بجے رات تک جاگتے تھے، جب تک ندوہ میں ملازم رہے ندوہ کا کام، اس کے بعد مطالعہ وتصنیف کا کام، اس وقت تک کرتے رہتے۔‘‘ (۲)

’’آخر میں حدیث میں مزاولت اتنی بڑھ گئی تھی کہ تاریخ کا مذاق بھی ماند پڑ گیا تھا، فقہی مسائل میں آپ فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اس کی بنیاد کتاب وسنت پر ہوتی تھی، لکھنؤ میں حدیث پڑھنے والوں کی اتنی کمی ہے کہ آپ کو ہمیشہ یہی تمنا رہی کہ حدیث پڑھانے کا موقع ملے۔ (۳)

اور آپ کی آخری تمنا یہ تھی کہ لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے اور سب ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر آپ اپنے وطن دائرہ شاہ علم اللہ میں مستقل قیام اختیار کریں بقیہ زندگی حدیث شریف کے درس میں صرف کر دیں۔

---

(۱) کلیات رعبؔ مطبوعہ نولکشور (۱۹۲۲ء)، ص/۹۔

(۲) ترجمہ مصنف/ص/۱۹۔

(۳) ترجمۂ مصنف/ص/۲۲۔

ابتدا سے آپ کا معمول مسجد نوازی میں (جو آپ کے محلّہ کی مسجد تھی) نماز جمعہ کے بعد وعظ کہنے کا تھا، آپ کا وعظ نہایت دلپذیر، سادہ اور مؤثر ہوتا تھا اور قدیم علمائے ربانی کے طرز پر خالص دینی وعظ کا نمونہ ہوتا تھا، آپ اگرچہ کوئی شعلہ نوا اور آتش بیان مقرر نہ تھے، آپ کی تقریروں اور دینی مواعظ میں شیرینی اور دلآویزی تھی، اور وہ تکلفات سے بری ہوتے تھے اس لئے دلوں پر اثر اور لوگوں کو بہت نفع ہوتا تھا، ایک زمانہ میں سامعین کی ایسی کثرت ہونے لگی کہ مسجد کا اندرونی و بیرونی حصہ بھی بھر جاتا تھا اور سامنے میدان میں جہاں پکریا کا درخت تھا صفوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا، شہر کے بہت سے عمائد اور ممتاز تعلیم یافتہ حضرات آپ کے وعظ و امامت کی وجہ سے اسی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے، بعد میں آپ نے مشغولیت یا اس لئے کہ (ایک مرتبہ سانپ کے کاٹ لینے کی وجہ سے (۱) آپ زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے، وعظ کا معمول ترک فرمادیا، لیکن امامت کا سلسلہ بہت آخر تک جاری رہا۔

حلقۂ احباب

آپ کا حلقۂ تعلق و خدمت اور دائرہ تعارف و تعاون اگرچہ وسیع تھا لیکن حلقۂ احباب محدود و مخصوص تھا اور اس میں زیادہ تر وہی لوگ شامل تھے جن سے آپ کو دینی و روحانی مناسبت یا علمی و ذوقی یگانگت تھی، اس میں پیش پیش وہی لوگ تھے جن کا یا تو آپ کے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے تعلق ارادت و بیعت تھا یا آپ کے محبوب استاد مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے، ان میں چار پانچ حضرات بہت ممتاز تھے، رضی الدولہ صمصام الملک نواب سید نور الحسن خاں (فرزند اکبر والا جاہ

(۱) پٹنہ سے لوٹتے ہوئے غازی پور میں ان کو کالے سانپ نے کاٹا طبیب العائلہ (ص/۶۵-۶۶) میں اس کا مفصل حال لکھا ہے۔

امیر الملک نواب سید صدیق حسن خاں بہادر والی بھوپال) الحاج منشی رحمت اللہ صاحب، الحاج منشی سید محمد خلیل صاحب نہٹوری (۱)، الحاج شاہ محمد خاں صاحب (قائم گنج ضلع فرخ آباد) مولوی نعیم الدین صاحب ہسوی اور منشی عبدالغنی صاحب ساکن محلہ بازار جھاؤلال، ان میں نواب نورالحسن خاں مرحوم کا پایہ بہت بلند تھا، جو آپ کے محض دوست و پیر بھائی نہ تھے بلکہ عاشق صادق اور محب واثق تھے، مولانا مرحوم نے حاشیہ گل رعنا میں جس انداز سے ان کا تذکرہ کیا ہے اس سے اس تعلق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مرنے سے تقریباً پندرہ سال پہلے مجھ سے شناسائی ہوئی اور یوماً فیوماً اتنی بڑھی کہ ان کو بغیر مجھ سے ملے چین نہ آتا تھا، ہر روز ایک دو بار تشریف لاتے اور گھڑیوں بیٹھتے اور اس فکر میں رہتے کہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

گھر میں اگر کبھی کسی کو چھینک آگئی اور ان کو معلوم ہو گیا تو فوراً تشریف لاتے اور کہتے چلئے فلاں مریض کو دکھانا ہے وہاں پہونچتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ علمی اذکار یا کھانے پینے کے شغل میں سارا وقت کٹ جاتا اور کسی مریض کے دیکھنے کی نوبت نہ آتی اور کچھ بہانہ نہ ملتا تو حسب معمول صبح سے آکر مطب میں بیٹھ جاتے جس وقت بھیڑ چھٹ جاتی کہتے میں نے فلاں کتاب نئی منگوائی ہے چل کر دیکھو یا میں نے تمہارے لئے خاص کر فلاں فلاں کھانے پکوائے ہیں، غرض کہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ لے

---

(۱) ملاحظہ ہو مضمون ''ایک گمنام درویش و خادم دین'' ''تعمیر حیات'' لکھنؤ شمارہ نمبر/۱۷-۱۸، جولائی ۶۶ء۔

جانے کا تلاش کر لیتے، مگر باوجود اس کے کہ ہر وقت یکجائی رہتی
دور باش اور ادب کا رکھ رکھاؤ اخیر وقت تک قائم رکھا جس سے
زیادہ تصور میں نہیں آسکتا، میں ان سے عمر میں چھوٹا اور فضیلت
علمی میں کم پایہ تھا، مگر محبت کا قانون سب سے نرالا قانون ہے،
خدا جانے کیوں وہ میرا ادب کرتے تھے، گاڑی میں کبھی ننگے سر
نہیں بیٹھتے، کبھی لیٹتے نہیں، کبھی بغیر سہارے بیٹھے بیٹھے تھک
جاتے تو دوسرے کمرے میں چلے جاتے، وہاں تھوڑا سا آرام
کر کے پھر آ کر بیٹھ جاتے، مرض الموت میں باوجود شدتِ تنفس
کے جس وقت میں آجاتا گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرتے، اور خود نہ
اٹھ سکتے تو آدمیوں کو حکم دیتے کہ وہ اٹھا کر بٹھائیں، میں نے ہر
چند کوشش کی کہ وہ اس وضعداری کو اب ختم کر دیں مگر نہیں مانا،
صرف اس وقت لیٹے جب سکرات کی حالت میں اٹھ نہ سکتے
تھے اور حیف صد ہزار حیف کہ یہ گنج خوبی ۸؍محرم ۱۳۳۶ھ (۱) کو
پیوند خاک ہوگیا۔" (۲)

ان میں سے ایک مولوی نعیم الدین ہسوی کے سوا جو مولانا کے بچپن کے ساتھی اور پیر بھائی تھے، تمام مذکور الصدر حضرات لکھنؤ ہی میں رہتے تھے، اور تقریبا ایک ہی محلّہ یا پاس کے محلّہ میں قیام تھا، منشی رحمت اللہ صاحب کے سوا جو حضرات مولانا محمد نعیم صاحب سے بیعت تھے، سب حضرات مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

(۱) ۲۴؍اکتوبر ۱۹۱۷ء

(۲) حاشیہ "گل رعنا" تذکرہ خواجہ میر درد/ص ۱۷۷، ۱۷۸۔

کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل تھے۔

لکھنؤ کے باہر کے احباب اور ارکانِ ندوہ میں ان کو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (سابق صدر الصدور وامور مذہبی ریاست حیدرآباد) سے زیادہ مناسبت اور ذوقی اتحاد تھا، نواب صاحب مرحوم حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب کے خصوصی ارادتمندوں میں تھے، اور اس رشتہ سے آپ کے پیر بھائی بھی ہوتے تھے، پھر ادب وتاریخ کا ذوق اور کتابوں کا شوق بھی دونوں میں مشترک تھا، مزاجوں میں بھی خصوصی مناسبت تھی، دونوں کو خدا نے توازن واعتدال کی دولت سے نوازا اور متانت ووقار کی صفت سے آراستہ کیا تھا، اسی مناسبت کی بنا پر مولانا نے ''گلِ رعنا'' میں اس کے ذکر کی تقریب نکال کر حاشیہ میں ان کا ذکر فرمایا جس کے لفظ لفظ سے ان کی سچی قدردانی اور جوہر شناسی اور تعلق وارتباط کا اندازہ ہوتا ہے، اس تذکرہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو ممدوح الصدر کی خدمت میں تیس برس (۱) سے نیاز حاصل ہے، اس وجہ سے میں نے ان کے انھیں اوصاف کا ذکر

---

(۱) یہاں پر یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ جس دن مسجد دار العلوم کا عملی افتتاح ہوا اور نواب صاحب مرحوم نے امامت اور وعظ فرمایا، اسی شب میں میں مولانا مسعود علی مرحوم کے جھونپڑے کے سامنے سے گزر رہا تھا، جس میں رہ کر انھوں نے مسجد تعمیر کرائی تھی، دیکھا تو نواب صدر یار جنگ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی بیٹھے ہوئے ہیں، یاد نہیں مجھے دیکھ کر نواب صاحب نے پاس بلالیا، یا میں نے سلام کیا تو بڑی شفقت کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دی، اور فرمایا کہ میں نے ''گل رعنا'' میں جب نواب نور الحسن خاں مرحوم کا تذکرہ پڑھا، اور یہ معلوم ہوا کہ ان سے پندرہ سال کا تعلق تھا تو مجھے بڑا رشک آیا، لیکن جب میں اپنا خود تذکرہ پڑھا تو یہ رشک جاتا رہا کہ میرے تعلق کی مدت اس سے دو چند نکلی، یہ بھی فرمایا کہ کتاب پڑھ کر ہی معلوم ہوا کہ مولانا کو سخن فہمی اور ادب وشاعری کا ایسا ذوق عطا ہوا ہے۔

کیا ہے جن کا خاص طور پر میرے دل پر اثر ہے، ان کی علمی خدمتیں اتنی نمایاں ہیں کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔"(۱)

اس موقع پر نواب صاحب کا ایک خط نقل کرنا بے محل اور خالی از دلچسپی نہ ہوگا، جو انھوں نے "گل رعنا" میں اپنا تذکرہ پڑھ کر ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی کے نام لکھا، اس سے ان کے تأثر و تعلق کا اظہار ہوتا ہے، اس خط پر ۲۶؍جون ۱۹۳۶ء کی تاریخ ہے۔

گرامی گوہر سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آج چوتھا دن ہے گل رعنا دیکھ رہا تھا اپنا حال پڑھا تو دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ فاتحہ پڑھ کر ثواب بخشا، دعائے مغفرت کی، فارغ ہو کر پھر پڑھنے لگا معاً دیباچہ سامنے آیا پڑھ گیا، خاتمہ پر سعدی کی مشہور نظم تھی، آخر کے شعر نے کیا کہوں دل پر کیا اثر ڈالا، محسوس طور پر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی جو فاتحہ اور دعا ہوئی اس کا جواب ہے۔

مگر صاحبدلے روزے زرحمت
کند برحال ایں مسکیں دعائے

دیر تک یہ کیفیت رہی، اس کے بعد خیال ہوا کہ صاحبدلے میں کوئی بشارت تو نہیں، معاً جو حال اپنا پڑھ چکا تھا، یاد آیا ختم کیفیت یا دوران کیفیت میں یہ بھی خیال آیا کہ یہ حال و خیال

(۱) حاشیہ گل رعنا تذکرہ میر تقی میر۔

آپ کو لکھوں اس کی تعمیل یہ خط ہے۔

والسلام ختم الکلام

دستخط (حبیب الرحمٰن)

نواب صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ مولانا کو اپنی کوئی فارسی غزل لکھ بھیجی، مولانا نے شاید تواضعاً لکھا ہوگا کہ میری تحسین، تحسین ناشناس ہوگی، اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''جناب مکرم، ہدیۂ سلام، آپ سخن ناشناس ہیں تو سخن شناس کون ہوگا؟ صاحب ذوق سلیم جس کے دل میں درد کی چاشنی ہو ضرور شعر فہم ہوگا، ذوق نہ ہوتا تو قند پارسی کیوں کام بخش ہوتا، درد نہ ہوتا تو خاک رہِ جاناں کی حسرت دل میں کس طرح ہوتی؟ ذوق، ہمدردی، دراز آہنگی کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے، نوائے دل پر توجہ فرمائیے کہ کس پردہ سے اٹھ رہی ہے۔''

اس کے بعد اپنی ایک تازہ غزل لکھ بھیجی ہے۔

راقم سطور نے مولانا مرحوم کے اکثر احباب کو دیکھا ہے اور سالہا سال ان کی بزرگانہ شفقتوں کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ سب مولانا کی محبت وعقیدت سے سرشار اور ان کے ذکر خیر سے رطب اللسان رہتے تھے، میں نے اپنی زندگی میں مشکل سے کسی کے ایسے مخلص اور معتقد احباب دیکھے ہوں گے، ان کا حال یہ تھا کہ گویا ان کی نظر میں ان کے سوا کوئی سماتا نہیں تھا اور زبان حال کہتی تھی۔

ہمہ شہر پر زخوباں منم وخیال ما ہے\
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بکس نگاہے

انتقال پر مدت دراز گزر جانے کے بعد بھی ان کا تعلق تروتازہ تھا اور جب تذکرہ کرنے پر آتے تو کرتے چلے جاتے، الحاج منشی سید محمد خلیل صاحب نے مجھ سے کراچی میں ۱۳۸۲ھ میں فرمایا (جب کہ مولانا کے انتقال پر تقریباً چالیس سال گزر چکے تھے) کہ جس رات کو مولوی صاحب کا خیال آجاتا ہے یا ذکر چھڑ جاتا ہے تو نیند اڑ جاتی ہے اور رات آنکھوں میں گزر جاتی ہے۔

مرض ووفات

مولانا مرحوم کی صحت عام طور پر اچھی رہتی، علاوہ وقتی و عارضی شکایات کے دو بیماریاں مستقل تھیں، جن کا کبھی کبھی حملہ ہوتا تھا ایک وجع مفاصل، جس کی وجہ سے ایک مرتبہ ان کو وفات سے ایک یا دو سال پہلے نظامت کے کاموں سے تین چار مہینہ کے لئے چھٹی بھی لینی پڑی (۱) اور اس دوران میں جب وہ مطب اور ندوہ کا کام نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے تفریحاً شعراء کا تذکرہ لکھنا شروع کیا جو ان کی وفات کے بعد ''گل رعنا'' کے نام سے شائع ہوا، (۲) دوسرا مرض ضغطۂ قلب کا تھا جو ان کو ننھیال سے ورثہ میں ملا تھا اور کئی ننھیالی بزرگوں کو اس سے فجائی موت واقع ہوئی تھی۔

زندگی کے آخری حالات وواقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت روز

---

(۱) مولانا شروانی کے ایک عیادتی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دورہ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ (اگست ۱۹۱۹ء) میں پڑا تھا، اس سے اچھے ہوئے تو عرصہ تک ضعف رہا اسی زمانہ میں عرصہ تک معمول رہا کہ آپ مطب اور ضرورت سے فارغ ہو کر نواب نورالحسن خاں کی کوٹھی واقع گھسیاری منڈی پر چلے جاتے اور وہیں آرام فرماتے تھے، راقم جس کی عمر اس وقت چھ سات سال کی تھی اس کو بخوبی یاد ہے۔

(۲) مولانا سید طلحہ صاحب راوی ہیں کہ ''میں لاہور سے ایک مرتبہ چھٹیوں پر آیا، تو فرمایا کہ اس مرتبہ بیماری اور ضعف کے سبب سے میں نے ایک ہلکا کام کیا ہے، یعنی ''گل رعنا'' تصنیف کی اور یہ بھی کہا کہ مرزا صاحب (مرزا مظہر جان جاناں) کے اس قدر اشعار تمھیں کہیں نہیں ملیں گے۔

بروز دنیا سے اچاٹ ہوتی جارہی تھی اور انقطاع و یکسوئی کا رجحان بڑھ رہا تھا، بعض مرتبہ ایسے ارشادات بھی فرماتے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب اس دار فانی کو خیر باد کہنے والے ہیں، منشی سید محمد خلیل صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں حاضر ہوا تو دیکھا اوپر کے صحن میں ٹہل رہے ہیں اور کوئی شعر وردِ زبان ہے، میں دیر تک بیٹھا رہا، مگر خلاف معمول التفات نہ فرمایا جیسے میری آمد کا احساس ہی نہیں ہوا، تھوڑی دیر کے بعد معذرت کی اور کہا کہ میں ایک شعر پڑھ رہا تھا جس میں کھویا ہوا تھا، پھر وہ شعر سنایا۔ ؎

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ایں نکو یا آں نکو

گل رعنا کے دیباچہ کو دسمبر ۱۹۲۱ء ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ کو لکھا گیا ہے، سعدیؔ کے دو شعروں پر ختم فرمایا جو اس لحاظ سے کہ ٹھیک اس کے ایک سال بعد اس دنیا سے رحلت فرمائی بالکل الہامی معلوم ہوتے ہیں، شعر یہ ہیں۔ ؎

غرض نقشے است کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے رحمت
کند برحال ایں مسکیں دعائے

جس روز یہ واقعۂ ارتحال پیش آیا اس روز کوئی علامت اس بات کی نہیں تھی، کہ آج اس دار فانی سے سفر ہونے والا ہے، ۱۵ر جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ (۲ر فروری ۱۹۲۳ء) کو جمعہ تھا، جمعہ کی نماز اپنے محبّ و محبوب دوست سید نور الحسن خاں مرحوم (جو تقریباً ۵ر سال پہلے انتقال کر چکے تھے) کی کوٹھی سے متصل مسجد میں پڑھی اور نواب

مرحوم کے دولت کدہ پر ان کے صاحبزادوں کے ساتھ دو پہر کا کھانا تناول فرمایا، راقم سطور جس کی عمر اس وقت دس سال کی تھی ہمراہ تھا، وہاں سے گھر واپسی ہوئی تو مجھے یاد ہے کہ عصر و مغرب کے درمیان بالائی صحن پر ٹہلنا شروع کیا، جیسے کوئی اندرونی تکلیف یا فکر ہو، میرے بڑے بھائی مولوی حکیم سید عبدالعلی صاحب اس وقت میڈیکل کالج لکھنؤ کی طرف سے طلباء کے ساتھ مدراس کے میڈیکل کالج میں بعض طبی معلومات ومطالعہ کے لئے گئے ہوئے تھے، گھر پر صرف والدہ صاحبہ، بڑی پھوپھی صاحبہ (اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحب ایم.اے. پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور) اور میری دونوں بہنیں تھیں، والد صاحب مرحوم نے بڑے اہتمام واصرار کے ساتھ والدہ صاحبہ اور پھوپھی صاحبہ کو میرے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب کی عیادت کے لئے جن کو معمولی سی تکلیف ہوگئی تھی، کتب خانہ ودفتر ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج میں جہاں اس وقت ان کا قیام تھا بھیج دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بالکل یکسوئی اور تنہائی چاہتے تھے، مغرب کی نماز انھوں نے حسب معمول پڑھی، وہ نہایت ضابط وباہمت تھے، کسی کو کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا، اسی اضمحلال اور درد کی بے چینی میں ندوۃ العلماء کے ضروری کام انجام دیتے رہے، اس مراسلہ کو غور سے ملاحظہ فرمایا جو ندوۃ العلماء کے صیغۂ وظائف کے واسطے جنرل حافظ عبید اللہ خاں (فرزند نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال) کی خدمت میں بھیجا جانے والا تھا، اور نواب سید علی حسن خاں صاحب معتمد مال کا لکھا ہوا اور خوشنویس کا صاف کیا ہوا تھا، مراسلہ میں ایک دو جگہ خوشنویس نے کتابت کی غلطی کی تھی اس کی صحت اپنے قلم سے فرمائی اور اس کے بعد اپنے دستخط کیے اور مولوی عبدالغفور صاحب ندوی مددگار ناظم کو ہدایت فرمائی کہ ارکانِ انتظامیہ سے بلاتاخیر دستخط کرانے کے بعد جلد از جلد اس کو بھوپال روانہ کردیں۔(۱)

---

(۱) ماخوذ از روداد ناظم ندوۃ العلماء نواب علی حسن خاں پیش کردہ دراجلاس نوازدہم (۱۹۲۵ء) ۱۳۴۴ھ۔

مغرب کے بعد مجھے یاد ہے کہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم جن کا ہر جمعہ کو آنے اور کچھ دیر بیٹھنے کا معمول تھا تشریف لائے ہوئے تھے اور بھی دارالعلوم کے کچھ حضرات آتے رہے، اور مولانا نے کسی کو کچھ محسوس نہ ہونے دیا، پھر آپ نے مولوی عبدالغفور صاحب کو بلوایا اور ان سے فرمایا کہ درد کی کچھ تکلیف ہے اور ڈاکٹر محمد نعیم انصاری (جن کا مطب چند قدم کے فاصلہ پر تھا) کو لانے کے لئے کہا، مجھے یاد ہے کہ آپ نے کچھ سنترے بھی منگوائے غالباً تسکین و فرحت حاصل کرنے کے لئے جب وہ سنترے آئے تو بجائے خود تناول فرمانے کے میری طرف اشارہ کیا کہ اس کو دے دو، تقدیری امر کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت گھر پر موجود نہ تھے، مولوی عبدالغفور صاحب ڈاکٹر ٹنڈن کو بلانے گئے (جو شہر کے ایک نامور ڈاکٹر تھے اور قیصر باغ میں رہتے تھے) وہ بھی قسمت سے نہیں ملے، مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنے پاؤں برابر کر لئے میں پاؤں دابنے لگا، سینہ سے ایک مسلسل آواز نکل رہی تھی، بزرگوں کا تذکرہ پڑھنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ غالباً ذکر قلبی تھا پھر وہ آواز بند ہوگئی، گھر میں مردوں میں کوئی نہ تھا، میری بہنوں کے کچھ سمجھ میں نہ آیا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ اپنے مولوی صاحب کو اوپر بلا لاؤ، اس زمانہ میں مولوی محمود علی صاحب (جو لکھنؤ کے ایک صاحب علم خاندان کے فرد تھے) مجھے فارسی پڑھانے کے لئے مقرر تھے، وہ جمعرات کو اپنے گھر واقع جھوائی ٹولہ چلے جاتے تھے، اور جمعہ کا دن گزار کر آتے تھے، وہ اسی وقت آئے تھے، میں نے ان کو زحمت دی وہ ایک تجربہ کار اور دیرینہ سال بزرگ تھے سمجھ گئے کہ واقعہ فاجعہ پیش آچکا ہے لیکن غالباً اپنی زبان سے اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا، مجھ سے کہا کہ منشی رحمت اللہ صاحب (جو والد مرحوم کے ایک مخلص دوست تھے اور قریب ہی رہتے تھے) کو بلا لاؤ، اتنے میں منشی صاحب اور حکیم عسکری

صاحب جو ہماری ہی سڑک پر مطب کرتے تھے، آئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے، بعض اور ڈاکٹر بھی آئے اور انھوں نے نبض وغیرہ دیکھ کر بالاتفاق اس کی تصدیق کی، یہ عشاء کی نماز کا وقت تھا۔

میں والدہ صاحبہ اور پھوپھی صاحبہ کو بلانے کے لئے کتب خانہ بھیجا گیا، ان کا آنا اور یہ منظر دیکھنا، ساری عمر نہ بھولے گا، دیکھتے دیکھتے ہمارے گھر کی بساط الٹ چکی تھی، اور چراغ گل ہو چکا تھا، گھر و خاندان ہی کا چراغ نہیں شہر و ملک کا چراغ، جس کی روشنی میں لوگوں نے اسلاف کے مٹے ہوئے نقشِ قدم اور کاروانِ رفتہ کے کتنے دھندلے نقوش، سلف صالحین و علمائے متقدمین کے کتنے کارنامے، جو تہ بہ تہ پردوں میں چھپے ہوئے تھے، کاغذ کے صفحات پر دیکھے اور آئندہ نسلیں بھی ان کو دیکھتی رہیں گی، جو چراغ ثلث صدی تک دلوں کو حرارت و نور سے بھرتا رہا اور حلقۂ احباب ہی میں نہیں، بزمِ علم و دین میں بھی شمعِ انجمن بنا رہا، خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں دوڑ گئی اور ان کے احباب، ندوہ کے ارکان، دار العلوم کے اساتذہ، شہر کے محبین و معتقدین جوق در جوق آنے لگے، لیکن ان کی ہمدردیوں اور تعزیتوں کا جواب دینے والا ایک کمسن بچہ تھا جو اس کے سمجھنے سے قاصر تھا، کہ دفعتاً یہ کیا ہو گیا اور چھوٹے سے گھرانے نے نہیں، بلکہ پورے ملک و ملت نے شام کے دھندلکے میں کس گوہر شب چراغ کو گم کر دیا اور یہ آنے والے تعزیت کرنے والے، کس مرتبہ اور حیثیت کے لوگ ہیں، اور ان کا کس طرح جواب دینا چاہئے، کبھی کوئی شفقت سے اسے پاس بٹھا لیتا، کوئی سینہ سے لگا لیتا، کوئی سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا، آنکھیں اشکبار اور دل مضطرب تھے، جو اس تعزیت کا سب سے زیادہ مستحق اور اس کے شکریہ ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا، وہ تقریباً یہاں سے ایک ہزار میل پر اجنبی ماحول میں مطالعہ میں منہمک

اوراس پورے قصہ سے بے خبر تھا، گھر میں چند مستورات اور عزیزوں میں سے ایک عزیز (والد صاحب کے پھوپھی زاد بھائی) مولوی سید عزیز الرحمٰن ندوی کے علاوہ کوئی نہ تھا، یا والد صاحب کے وہ جاں نثار دوست تھے جو عزیزوں سے کم نہ تھے، لیکن وہ سب مغموم و دلفگار، سارا خاندان رائے بریلی میں تھا اور چونکہ ناگہانی طور پر یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس لئے سب بے خبر تھے، پہلی گاڑی سے جو اس وقت دس بجے شب میں چلتی ہے، اطلاع کرنے کے لئے آدمی بھیجا گیا جو رات کو دو بجے کے قریب پہونچا، وہاں جس نے سنا عالمِ حیرت میں رہ گیا۔

رات ہی رات محلہ کے پرخلوص نوجوانوں نے، جو جان و دل سے محبت کرتے تھے، تابوت تیار کیا، تین بجے شب کے قریب موٹر کے ذریعہ نعش رائے بریلی گئی، صبح کی ٹرین سے اور مختلف سواریوں سے شہر کے عمائد علماء، ارکانِ ندوۃ العلماء، اساتذہ وطلبائے دارالعلوم اور معتقدین ومحبین کی ایک بڑی جماعت نماز جنازہ میں شرکت اور آخری دیدار کے لئے گئی، دنیا سے الگ تھلگ اس گاؤں نے جو دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے موسوم ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے بعد بہ یک وقت اتنے علماء وصلحاء کا مجمع اور اتنی بڑی تعداد میں اہل علم و دین کا اجتماع نہیں دیکھا تھا، غسل کے لئے جب چہرہ کھولا گیا تو گلاب کی طرح شاداب تھا، اور ہونٹوں پر تبسم تھا، کہ زندگی کا شبہ ہوتا تھا، نمازِ ظہر کے بعد حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی مسجد کے صحن و میدان میں نماز جنازہ ہوئی، مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم نے امامت کی، اشک آلود آنکھوں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس جسد مبارک کو لحد میں اتارا گیا، جس کی ساری زندگی علم و دین کی خدمت اور آثار اسلامی کی احیاء وحفاظت میں گذری، جس کے قلم نے ہزاروں علمی و دینی شخصیتوں کو اپنی کتابوں کے ذریعہ نئی زندگی بخشی۔

کس کو لائے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

آپ کو اپنے خاندان کے جلیل القدر مشائخ اور اپنے عہد کے رفیع المرتبت داعی اور مصلح حضرت شاہ علم اللہؒ اور حضرت سید محمد عدل کے پائیں سپرد خاک کیا گیا، اور عرصہ دراز کے بعد یہ خطیر تمام افرادِ خاندان کی متفقہ رائے اور فیصلہ کے مطابق اس نئے مہمان کے لئے کھولا گیا جو ان آسودگانِ خاک کے لئے نیا نہ تھا، اس وقت آپ کی عمر قمری حساب سے ۵۵ اور شمسی حساب سے تقریباً ۵۳ر سال کی تھی، یہ واقعہ ۱۶ر جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ (۲ر فروری ۱۹۲۳ء) کا تھا، مشایعت کرنے والوں کا مجمع شہر کو واپس ہوا، دار العلوم ندوۃ العلماء میں تین دن کی تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ سب کچھ ہو گیا اور بھائی صاحب کو خبر نہ ہوئی، جب وہ مدراس سے حیدرآباد، اورنگ آباد ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے اور انھوں نے اس وقت کی پورٹ حج کمیٹی کے صدر کو والد صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کا سلام پہنچایا، تو وہ ان کا منہ دیکھنے لگے کہ خبر سارے اخباروں میں شائع ہو کر سارے ملک میں پھیل گئی تھی، ان کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور انھوں نے بجائے خود کہنے کے اخبار کا وہ شمارہ سامنے کر دیا، جس میں خبر شائع ہوئی تھی، انھوں نے یہ سفر کس طرح طے اور وہ کس طرح اس صاعقہ اثر خبر کو برداشت کر سکے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، مجھے اتنا یاد ہے کہ جب وطن پہنچے تو سیدھے قبر پر گئے، میں بھی ساتھ ہو لیا، ان کا قبر پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا، اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے، سب سے زیادہ صدمہ انھیں اس بات کا ہوگا کہ وہ اس آخری وقت میں ان کے پاس نہ تھے اور آخری خدمت بھی نہ انجام دے سکے، ٹھیک یہی واقعہ (۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ) ۷ر مئی

۱۹۶۱ء کو ان کے معاملہ میں میرے ساتھ پیش آیا کہ میں غم نصیب بھی ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے بجائے ان کی تربت پر حاضر ہوا۔

بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

حلیہ و پسماندگان

والد صاحب نہایت متناسب الاعضاء، میانہ قد اور وجیہ و جمیل تھے، بدن دوہرا تھا، لبوں پر اکثر اوقات مسکراہٹ رہتی تھی، رنگ گندمی کھلتا ہوا، پیشانی درخشاں، آنکھیں فراخ، بینی موزوں و ستواں، ہونٹ ہلکے، داڑھی زیادہ تر سیاہ، چند بال سفید، نہایت جامہ زیب، لباس ہمیشہ لطیف و نفیس پہنتے تھے، عمامہ کا دائمی معمول تھا اور بہت خوبصورت عمامہ باندھتے تھے (۱)، آپ کی ذات میں بڑی کشش و محبوبیت تھی، جو دیکھتا وہ خود بخود احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا، جس مجلس میں ہوتے نمایاں اور ممتاز ہوتے۔

پسماندگان میں دو لڑکے مولوی حکیم سید عبد العلی (جو اس وقت میڈیکل کالج لکھنؤ کے چوتھے سال میں زیر تعلیم تھے) راقم سطور ابو الحسن علی، دو لڑکیاں ایک امتہ العزیز (والدہ مولوی سید محمد ثانی، مولوی سید محمد رابع اور مولوی سید محمد واضح سلمہم) دوسری امتہ اللہ عائشہ (مصنفہ ''زادِ سفر''، ''بابِ کرم'' اور بچوں کی ''قصص الانبیاء'' ''موجِ تسنیم'' وغیرہ و مدیرہ ''رضوان'') ایک پوتا سید حسن (۲) اور ایک نواسہ سید محمود حسن (۳) ابن

(۱) حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ نے، جو عمامہ کے ہمیشہ پابند رہے، مجھ سے فرمایا کہ میں نے یہ عمامہ کا معمول تمہارے والد سے اخذ کیا ہے۔ (۲) فرزند اکبر ڈاکٹر سید عبد العلی، جس کا نام سید حسن تھا اور اس نے دادا کی وفات کے کچھ ہی عرصہ کے بعد انتقال کیا۔ (۳) ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے اور دادا سید خلیل الدین احمد صاحب نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام پر نام رکھا، طبیعت بڑی سادہ و صالح پائی تھی، اوائل عمری ہی سے مختلف امراض کا شکار رہے، آخر کار ۸ر محرم ۱۳۶۱ھ، ۵ر اپریل ۴۲ء کو ۲۱ رسال کی عمر میں طویل علالت کے بعد لکھنؤ میں انتقال کیا اور تکیہ شاہ علم اللہ کے خاندانی قبرستان میں مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

رشید احمد چھوڑا۔

چند تعزیت نامے

کثیرالتعداد تعزیت ناموں میں یہاں صرف تین تعزیت نامے نقل کیے جاتے ہیں، جو بعض خصوصیات کے حامل ہیں، ان میں سے جو تعزیت نامہ اس راقم سطور کے نام ہے، وہ اس حیثیت سے ایک تاریخی وادبی حیثیت رکھتا ہے، کہ ایک ناموروصاحب کمال پدر بزرگوار کے کمسن فرزند کو لکھا گیا ہے، اوراس کی عمروفہم کی پوری رعایت کی گئی ہے، یہ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں ناظم ندوۃ العلماء کا تعزیت نامہ ہے، جو راقم سطور کے نام ہے، دوسرے دو تعزیت نامے دو نامور ادیبوں اور عالموں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ہیں، نواب علی حسن خاں مرحوم کا تعزیت نامہ حسب ذیل ہے:

''۳؍رجب ۱۳۴۱ھ، ۱۹؍فروری ۱۹۲۳ء یوم جمعہ

عزیز من ابوالحسن سید علی سلمہ اللہ تعالیٰ

دعائیکہ از تہِ دل برخیزد حرز جان عزیز باد، تم کو اس کا افسوس اور قلق ہوگا کہ تمہارے شفیق اور فخرِ روزگار، پدر بزرگوار جناب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے انتقال فرمایا، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

لیکن اے عزیز لخت جگر! اگر غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ دنیا کا یہی دستور ہے اور کوئی بھی دنیا میں نہ ہمیشہ رہا ہے اور نہ رہے گا ۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اسی واسطے جو خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں وہ دنیا کی چند روزہ بہار کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے اور آخرت کی زندگی کو حیات جاودانی سمجھتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جس میں خدا اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی ہوتی ہے۔

تمہارے خاندان میں بھی ایسے بزرگانِ دین گزرے ہیں، جنہوں نے اسلام کی راہ میں بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں، جن کی وجہ سے ان کے نام اب تک روشن ہیں اور خدا نے ان کو جنت دی ہوگی، تم انھیں بزرگوں کی اولاد میں ہو، تمہاری رگوں میں انھیں کا خون ہے، اس واسطے تمہارے ساتھ خدا کی رحمت شامل ہے اور انشاء اللہ تم بھی ایسے صالح، عالم و فاضل، زاہد و عابد نکلو گے۔

ایسی حالت میں تم اپنے دل میں یہ خیال نہ کرو کہ بابا نہیں ہیں، تو ہم کیونکر اور کس طرح پڑھیں گے، میں نے سنا ہے کہ تم پریشان ہوکر لوگوں سے یہ کہتے ہو، خدا کے فضل سے تمہارے بڑے بھائی جو بڑے قابل، بڑے فاضل ہیں، تمہاری تعلیم کا بہت اچھا انتظام کریں گے، علاوہ اس کے اس وقت سب لوگوں کی توجہ اور نگاہیں تمہاری طرف ہیں، پس تم ہرگز ہرگز نہ گھبراؤ، خدا چاہے گا تو بہت اچھی طرح اور بڑے آرام اور آسائش سے پڑھو گے، آخر میں میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہاری عمر دراز کرے کہ

خاندان کا نام روشن کرو۔"

والدعا

تمہارا دردمند، شریک ماتم

خاکسار محمد علی حسن

انچارج ناظم ندوۃ العلماء

دوسرا تعزیت نامہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا بنام ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب۔

"عزیزم سلمہٗ، بعد سلام مسنون، کل کی ڈاک میں ندوۃ العلماء کے دفتر سے بہت ہی دردناک خبر پہونچی، آپ کے والد صاحب کی رحلت کی کیفیت پڑھ کر دل پر ایک کیفیت گزری، جو بیان میں نہیں آسکتی، حیف سی ۳۰ سالہ ربط قلبی یوں دفعۃً ختم ہوا، ایک محبت تھی جو اس عالم سفلی سے ماورا تھی، اس کا اس طرح خاتمہ ہوا، ۹ر فروری ملاقات کے واسطے مقرر تھی، افسوس ہے کہ بہت دور ہوگئی، وہ اوصاف جو خالق ذوالجلال نے میرے دوست میں جمع فرمادیئے تھے، بہت بیش بہا اور نایاب تھے، اب ان اوصاف کو آنکھیں ڈھونڈیں گی اور نہ پائیں گی، وہ صداقت و صدقِ عمل، طبع غیور، علم کا صحیح مذاق، دین کا حقیقی ذوق کہاں ملیں گے، غفرله وجعل الجنة مثواه، آپ نعم الخلف ہیں، اور مولوی صاحب کے نورِ چشم، خداوند تعالیٰ ہماری آنکھوں کو آپ کی سعادت وکامیابی سے منور رکھے، آپ کو صبر واجر عطا فرمائے،

اِنا للہ و اِنا اِلیہ راجعون۔

اے ہمنفساں محفل ما

رفتید ولے نہ از دل ما

حبیب الرحمٰن، حبیب گنج

۵؍فروری ۱۹۲۳ء‘‘(۱)

تیسرا تعزیت نامہ مولانا سید سلیمان ندوی کا حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی صاحب کے نام ہے، جو اعظم گڑھ سے لکھا گیا۔

’’برادرم سلمہ اللہ......................السلام علیکم

حادثہ جانکاہ کی نسبت کلماتِ صبر لکھنا بیکار ہے، کہ مرنے والا صرف آپ کا باپ نہیں بلکہ ہم سب کا باپ تھا، خدا کی مرضی، میں واقعہ کے تیسرے روز لکھنؤ پہونچا، پہنچنے کے ساتھ اطلاع ملی، خرمنِ صبر پر بجلی گری، آپ نہ تھے، راستہ میں تھے، چند گھنٹے ٹھہر کر علی گڑھ و دہلی چلا گیا، وہاں سے لکھنؤ واپس آیا تو میں بیمار ہو گیا، اور آپ رائے بریلی میں تھے، یہاں اسی بیماری کی حالت میں واپس آیا، افسوس کہ لکھنؤ میں میری بیماری کا مسیحا نہ رہا۔

آپ سے میری ملاقات نہ ہوسکی، معلوم نہیں آئندہ آپ کے کیا ارادے ہیں، میرا خیال ہے کہ آپ مطب کی مسند پر بیٹھ جایئے، اور سلسلۂ تعلیم بھی جاری رکھئے، اسی فکر میں تھا کہ کل مولوی غلام

(۱) ۱۸؍جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ۔

محمد صاحب شملوی کا تار آیا کہ انھوں نے جنرل عبیداللہ خاں سے
مدد وظائف میں آپ کے لئے کوشش کی ہے، مجھے لکھا ہے کہ تم
یہاں کے چند اکابر اور خود جنرل صاحب کو لکھو، چنانچہ میں آج لکھ
رہا ہوں، بہتر ہے کہ آپ حصول وظیفۂ تعلیم کی درخواست جلد
جنرل صاحب کو بھیج دیجئے گا، ان کے صحیح آداب والقاب اچھے
صاحب (۱) سے معلوم ہونگے، اس بارے میں شرم نہ کیجئے اور
اس کو قابل احتراز نہ سمجھئے، میں بھی آپ کا خیر خواہ اور بھائی ہوں۔
ندوہ کے متعلق جو کچھ ہوسکتا ہے کرونگا، مگر اصلی انتظار آپ کی
تکمیل کے وقت کا ہے، خدا وہ دن لائے۔

مولانا کی تصنیفات بحفاظت رہیں، انشاء اللہ سب چھپیں گی،
تذکرہ شعراء اردو کا آخری دور طبقہ متأخرین مجھے نہیں دیا تھا، اگر
مسودات میں ہو تو بھیج دیجئے، ذرا تلاش کیجئے۔

والسلام

سید سلیمان

۱۷ فروری ۱۹۲۳ء (۲)

□□□

(۱) اس سے مراد سید رشید الدین صاحب مودودی ہیں، جو نواب سید نور الحسن مرحوم کے داماد تھے اور لکھنؤ کے
خاندانِ سادات کے چشم و چراغ۔

(۲) یکم رجب ۱۳۴۱ھ

باب ہشتم

نمایاں صفات، مزاجی خصوصیات، ذوق ورجحانِ طبع

اخلاق کریمہ

مولانا کے فرزند اکبر مولوی حکیم سید عبد العلی صاحب جو مولانا کی وفات کے وقت جوان وصاحب اولاد بھی تھے اور دینی علوم کی تکمیل کرنے کے بعد طب جدید کی تعلیم میں مشغول تھے، اکابر علماء اور اپنے وقت کے صلحاء کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ذہانت وقوت مشاہدہ سے بھی نوازا تھا، انھوں نے اپنے والد ماجد کی زندگی، معاشرت اور اخلاق وعادات کا بہت غور سے مطالعہ کیا تھا اور ایک سعید اولاد اور ذہین عالم کی حیثیت سے انکے باریک سے باریک اور مخفی سے مخفی پہلوؤں سے واقف تھے، اس لئے بمصداق "صاحب البيت أدرىٰ بما فيه" ان کی شہادت اور ان کا بیان ایک واقف کارترین آدمی کا بیان ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آپ نہایت حلیم، متین، صابر، متوکل، خلوت پسند، سخی، حق گو، راست باز، آزاد خیال، راضی برضائے حق، محبّ ملک وقوم، ہمدرد بنی آدم، رقیق القلب، کریم النفس بزرگ تھے، نمود ونمائش

سے آپ کو سخت نفرت تھی، کسی کو نقصان پہونچانا یا کسی کا دل دکھانا، آپ کے مذہب میں کفر تھا، خود تو کجا، اگر کسی کے متعلق سن لیتے تو اس سے نفرت ہو جاتی۔

آپ نہایت متقی تھے، اور مال حرام سے عمر بھر اللہ نے آپ کو بچایا، معاملات میں سختی سے شرع کی پابندی کرتے، آپ نے سودی قرض کبھی نہیں لیا، نہ مشتبہ مال کھایا، آخر عمر میں دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوگئی تھی، اگر آپ کو معاش سے کچھ بھی اطمینان ہوتا تو وطن کی ندی کے کنارے گوشہ نشیں ہو کر حدیث و قرآن کے درس میں اپنی عمر صرف کر دینے کی تمنا رکھتے تھے۔

مل کر کام کرنے (تعاون علیٰ البر والتقویٰ) کی قابلیت جو آج کل مسلمانوں میں مفقود ہے، آپ میں ایسی پائی جاتی تھی کہ ندوہ کے ارکان و معتمدین سب آپ پر اعتماد کرتے تھے اور کسی کو کوئی شکایت آپ سے نہ تھی، تعاون کی حالت میں دو زریں اصولوں پر ہمیشہ آپ کا عمل رہا:

۱. دوسروں کے جذبات کا لحاظ رکھنا اور ان کے اختیارات میں دخل نہ دینا۔

۲. اپنے اختیارات کے حدود میں بھی دوسرے معتمدین یا ارکانِ کونسل سے مشورہ لے لینا۔" (۱)

---

(۱) ترجمۂ مصنف/ص ۲۱۔

معاشرت وحسن سلوک

معاشرت کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''آپ نے جب سے کمانا شروع کیا، صرف کمانے سے تعلق رکھا، خرچ دوسروں کے ہاتھوں سے ہوتا تھا، آپ کا قاعدہ تھا کہ اپنی آمدنی اپنے کسی شاگرد، دوست یا عزیز کے سپرد کر دیتے تھے، اور خانہ داری سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے، وہی کھانے پینے کا سب انتظام کرتے اور آپ گھر میں رہنے والوں کی طرح خود بھی کھالیتے۔

دنیا سے آپ کو جو کچھ تعلق تھا، وہ کتب بینی اور تصنیف وتالیف تھا، اس سے زیادہ آپ نے دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھا، ہمیشہ تنہا ایک کمرے میں رہتے تھے اور بے ضرورت کوئی بات زبان سے نہ نکالتے تھے، نہ بے ضرورت کسی کے یہاں جاتے تھے، نہ کسی کو بے ضرورت بلاتے تھے، اگر کوئی آجائے تو حسن خلق سے پیش آتے تھے، دعوتیں بہت کم کرتے تھے، دستر خوان وسیع تھا، اور اکثر مستقل مہمان مقیم رہتے تھے، جب تک جوان رہے اور بدن میں قوت اور امنگ رہی، ان کی آسائش کا انتظام بڑے جوش سے کرتے، اکثر رات کو بے وقت و بے اطلاع آجانے والے مہمانوں کی وجہ سے تخت یا فرش پر سونا پڑتا اور بدمزہ کھانا کھانا پڑتا، مگر کبھی پیشانی پر شکن نہیں آتی، آخر عمر میں

ان کی آسائش کا انتظام انھیں پر چھوڑ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اب محنت و تکلیف اٹھائی نہیں جاتی، اس زمانہ میں اکثر آپ کو نہ مہمانوں کے آنے کی خبر ملتی نہ جانے کی، اکثر لوگ اپنے کاموں سے آتے اور آپ کے یہاں ٹھہرتے اور کام کر چکتے تو بغیر ملے چلے جاتے، آپ کو بعد میں معلوم ہوتا تو کبھی ملاقات نہ ہونے پر افسوس کرتے اور کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی اثر نہ لیتے، اکثر لوگ آپ کے مکان کو سرائے یا ہوٹل سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

آپ والدین کے مطیع و فرمانبردار اور اہل وعیال پر شفیق تھے، جو اعزا و احباب حاجتمند رہتے، ان کے ساتھ سلوک وصلہ رحمی اس طرح سے کرتے کہ گھر والوں کو خبر نہ ہوتی اور بعض وقت خود اس کو خبر نہ ہوتی جس کے ساتھ سلوک کرتے، اکثر قرض کے نام سے آپ دے دیا کرتے، اور اعزا و احباب کے ساتھ ایسا برتاؤ تھا کہ ہر شخص آپ کو بہترین بہی خواہ سمجھتا اور آڑے وقت پر کام آنے کی امید رکھتا۔

آپ کی معاشرت میں تصنع یا تکلف کو ذرا دخل نہ تھا، کہ جب آپ کو کسی کے اخلاص پر پورا اعتماد ہو جاتا تھا تو آپ اس کے یہاں سے بے تکلف کھانے کی کوئی چیز منگوا لیتے، اسی کے ساتھ عزتِ نفس و غیرت کا یہ عالم تھا کہ آپ اکثر اوقات واجب الوصول رقوم کے مطالبہ میں پس و پیش کرتے تھے اور قرض تو کبھی آپ نے دے کر وصول نہیں کیا۔

برادری کے حقوق ادا کرنے کا آپ کو بہت خیال رہتا تھا، تمام خاندان میں آپ اس امر میں ممتاز تھے کہ حتی الامکان خاندان یا احباب کی ہر تقریب میں بذات خود یا مجھے بھیج کر شرکت کرتے تھے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو کسی اور عزیز کو بھیج دیتے، اساتذہ یا مشائخ آتے تھے تو چلتے وقت نذر دیتے تھے، حاجتمند اعزا واحباب کو گرانقدر تحائف اور کبھی کبھی نقد کی صورت میں بھیجتے رہتے تھے، رشتہ میں چھوٹے لوگ آتے تھے تو چلتے وقت ان کو بھی دیتے، اس قسم کے اکثر کام آپ کو قرض لے کر پورے کرنے پڑتے مگر معمول میں فرق نہ آتا تھا، آپ کا دینا ایسا تھا جس کی صحیح تعریف مشہور عرب شاعر زہیر نے کی ہے ؎

تــراه إذا مـــا جـئـتـــه متهـلّــلا

كـأنك تـعـطيـه الـذي أنت سائله (۱)

اکثر مساکین و بیوگان کے وظائف ماہوار مقرر تھے۔

والد صاحب کے احباب اور ان سے تعلق رکھنے والوں کا آپ کو بہت خیال رہتا تھا، اگر ان سے ایذا بھی آپ کو پہنچتی تھی تو بھی ان کے ساتھ سلوک میں فرق نہیں آتا تھا، اسی طرح میری والدہ مرحومہ (۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا) کی ماماؤں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے اور مجھے تاکید کرتے رہتے

(۱) جب تم (ہرم بن سنان کے پاس) سوال کرنے آؤ گے تو اس کو مسرور و متبسم پاؤ گے، جیسے کہ تم اس سے سوال کرنے والے نہیں بلکہ اس کو دینے والے ہو۔

کہ نانیہال کے لوگوں کا خیال رکھو۔‘‘(۱)

قناعت وتوکل

’’دن بھر کی آمدنی شام تک خرچ کر دینا، آپ ضروری سمجھتے تھے اور رات کو روپیہ باقی رکھنا آپ برا جانتے تھے، بعض مرتبہ شام کو پوچھ بیٹھتے کہ روپیہ تو باقی نہیں ہے؟ اگر باقی ہوتا تو اسی وقت مطالبات ادا کرنے کا حکم دیتے تھے، اسی وجہ سے زکوٰۃ آپ پر کبھی فرض نہیں ہوئی۔‘‘(۲)

اس قناعت وتوکل کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ آپ کو عیال دار ہونے اور اقربا کے ساتھ سلوک کرنے کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ کی ضرورت رہتی تھی، اور آپ کی باہر کی فیس سو روپئے یومیہ تھی، جو اس زمانہ کی اشیاء کے نرخ اور معیار زندگی کے لحاظ سے قابل لحاظ رقم تھی، آپ کو اگر شرح صدر نہیں ہوتا تو آپ باہر جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے، آپ کے ہر وقت کے رفیق وجلیس منشی عبدالغنی صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ گونڈہ کے ایک بڑے زمیندار (جو آپ کے زیر علاج تھے) کا آدمی آپ کو گونڈہ لے جانے کے لئے آیا، آپ نے مریض کا حال سنا تو جانے کے لئے طبیعت آمادہ نہیں ہوئی اور آپ نے عذر کر دیا، میں نے آپ سے جانے کے لئے اصرار کیا اور ملامت کی، کہ آپ خدا کی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں اور آمدنی کے ایسے جائز مواقع ضائع کر دیتے ہیں، بہت کہنے سننے سے آپ سوار ہوئے اور اسٹیشن کے

(۱) ترجمہ مصنف ص ر ۱۷، ۱۸، ۱۹۔

(۲) اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ترکہ میں صرف ایک روپیہ چھوڑا تھا، یہ شاید اب بھی محفوظ ہے، یا چند فیسیں جو ایک ہندو رئیس راجہ پرتاپ نیرّ اٹاوہ کے ذمہ باقی رہ گئیں تھیں اور بعد میں وصول ہوئیں۔

لئے روانہ ہوئے، لیکن امین آباد کے چوراہے سے یا کچھ آگے پہنچ کر واپس آگئے اور فرمایا کہ شرح صدر نہیں ہوتا، خدا کی قدرت کہ کچھ دیر کے بعد تار آیا کہ مریض کا انتقال ہوگیا، حکیم صاحب کو زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں، فرمایا کہ اگر میں چلا جاتا تو کیسی خفت وندامت ہوتی۔

صلہ رحمی اور اصلاح ذات البین کی کوشش

آپ پر جو ذوق سب سے زیادہ غالب تھا اور جو طبیعت ثانیہ بن گیا تھا، وہ علیٰ قدر مراتب رشتہ داروں کے حقوق کو پہچاننا، ان کو ادا کرنے کی کوشش کرنا، ان کی غمخواری اور ان کے ساتھ حسن سلوک، بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرنا، خاندانی نااتفاقیوں اور رنجشوں کے خاتمہ کی کوشش کرنا، بچھڑے ہوؤں کو ملانا اور روٹھوں کو منانا، جس کی قرآن وحدیث میں نہایت تاکید آئی ہے اور سیرت نبویؐ اس کی تعلیمات اور عملی مثالوں سے پُر ہے۔

ایک زمانہ میں آپ کے خاندان میں کچھ زمین وجائداد کے سلسلہ میں اور کچھ بعض افسوسناک واقعات کے نتیجہ میں نہایت ناچاقی اور کشیدگی تھی، تکیہ کا چھوٹا سا خاندان دو حصوں میں بٹ گیا تھا، اور ملنا جلنا، سلام وکلام بھی موقوف ہوگیا تھا، صرف غمی کے موقع پر برسوں کے بچھڑے ہوئے ملتے تھے، ایک ایسے خاندان میں جو تعلیمات نبوی اور اسوۂ رسول ﷺ پر عمل کرنے کا زیادہ مستحق تھا اور جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی جامع ومصلح شخصیت ماضی قریب میں پیدا ہوچکی تھی، اس حمیت جاہلیہ کے پیدا ہوجانے سے آپ کے دل کو سخت صدمہ تھا، زبانی افہام وتفہیم اور ترغیب و ترہیب کے علاوہ آپ نے اس مقصد کے لئے ایک مستقل رسالہ ''اصلاح'' کے نام

سے تصنیف فرمایا، جو اس موضوع پر نہایت مؤثر رسالہ ہے، اور چونکہ اس میں دلی جذبات کی صحیح ترجمانی ہے، اس لئے آج بھی اس میں اثر باقی ہے، اس رسالہ کی تمہید میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں سب سے بڑا عیب جو ہم مسلمانوں میں پیدا ہوگیا، ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کرنے کا خیال دلوں سے اٹھ گیا ہے، ہمارا کوئی کام خودغرضی سے خالی نہیں ہوتا، طمع وحرص کی ترغیبوں نے ہم کو مغلوب کردیا ہے، جھگڑوں کا طوفان موجزن ہے، بھائیوں کی سبکی سے خوشیاں منائی جاتی ہیں، تنگدستی نے حواس کو ایسا مختل کردیا ہے، کہ نہ اپنی ہستی سجھتی ہے نہ دوسروں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، ہمارے حرکات وسکنات پر خودغرضی فرمانروا ہے، قوم کو، ملک کو، وضع کو، غرض جو کچھ ہم کو مل سکے اس کو اپنی غرض پر قربان کرنے کو ہر وقت ہم آمادہ رہتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کی حالت ایسی نہ تھی، ان کے اخلاق ایسے پاکیزہ تھے، جنکی مثال دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں، اخلاق، محبت، مروت، دوستی، دوستی کا برتاؤ، دوستی کا پاس، دلی نیکی، فیاضی، متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت، سب ان میں جمع تھے، جن دو شخصیتوں میں دوستی ہوجاتی تھی تو اس کا نباہ ان کی ذات تک ختم نہیں ہوجاتا تھا، بلکہ ان کی اولاد اور اعزا تک پہونچتا تھا، ایک دوست کا بیٹا اپنے باپ کے دوست کو چچا کہتا تھا، اس کے

بیٹے کو بھائی خیال کرتا تھا، اسی طرح ان کے گھر کی بیویوں میں باہم ارتباط پیدا ہو جاتا تھا، اور کئی پشتوں تک اس کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔

اس زمانہ میں یہ سب باتیں موقوف ہو گئی ہیں، اخلاق باقی نہیں رہا، محبت دلوں سے کافور ہو گئی، مروت کرنا بیوقوفی میں داخل ہے، دوستی اور دوستی کا پاس اگلے لوگوں کی سادہ لوحی سمجھی جاتی ہے، نہ چھوٹوں کو بڑوں کا ادب رہ گیا ہے، نہ بڑوں کو چھوٹوں کی الفت رہ گئی ہے، غریبوں کے ساتھ ہمدردی کی جگہ ''قومی ہمدردی'' نے لے لی ہے، مگر یہ بے معنی لفظ صرف زبانوں پر ہے، دل میں اس کا اثر کچھ نہیں۔

دوستی کے رشتہ کے لحاظ سے عزیزداری کے برتاؤ کی اب خواہش نہ کرو، یہ دیکھو کہ اب عزیزداروں میں بھی عزیزداری باقی ہے یا نہیں، ماں باپ کو اپنی اولاد سے اور اولاد کو اپنے ماں باپ سے، اب اسی وقت تک پاسداری رہتی ہے جب تک کہ کوئی معاملہ نہیں پڑتا، غیروں کے ساتھ بھولے سے اگر نیکی ہو جائے تو ممکن ہے، مگر عزیزوں کے ساتھ نیکی کرنا گناہ کبیرہ ہے، غیروں سے کسی وقت ہنسنا تو جائز ہے مگر اپنوں سے کھل کر ملنے میں کسر شان ہے، غیروں سے کھنچنا بداخلاقی ہے مگر عزیزوں سے ترش روئی کرنا خودداری میں داخل ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اپنے خاص عزیزوں سے رشتہ ظاہر کرنے میں ہم کو تامل ہے،

بات بات پر لڑنا ہمارا شیوہ ہوگیا ہے، ذرا ذرا سی بات پر عزیزوں سے بگاڑ لیا جاتا ہے، رشتے ناتے توڑ دیئے جاتے ہیں، قصہ مختصر ہماری اخلاقی حالت ایسی پست اور ردی ہوگئی ہے جس نے ہمارے دل کو، دماغ کو، عبادات ومعاملات کو سبھی چیزوں کو راہ راست سے منحرف کردیا ہے، اور ہماری وہ حالت ہوگئی ہے جو آفتاب رسالت کے چمکنے سے پہلے عرب کی حالت تھی۔

اس خیال سے کہ شاید دوستوں کو اس کی خبر نہ ہو کہ اسلام میں صلہ رحمی کی کس قدر تاکید فرمائی گئی ہے، اور قطع رحمی سے کتنا ڈرایا گیا ہے، قرآن وحدیث کے ارشادات کا ایک مجموعہ پیش کرتا ہوں، مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام کو عموماً اور میرے خاندان کے بزرگوں اور عزیزوں کو خصوصاً اس سے فائدہ پہونچے، اگر ایک گھرانے میں بھی اس سے نفع اٹھایا گیا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنی محنت کا صلہ پایا، ﴿إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب﴾"(۱)

پھر اس کے بعد صلۂ رحم کے فوائد جو احادیث صحیحہ میں وارد ہوئے ہیں، ذوی القربیٰ کا مرتبہ اور درجہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اور قرابت داروں کے حقوق ازروئے شریعت وسیرت بیان کئے ہیں، اور تفصیل کے ساتھ واقعہ افک میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر اتہام پر حضرت ابوبکرؓ کی برہمی، پھر قرآن کی ہدایت کے بعد ان کا حضرت مسطح کے ساتھ سلوک کے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس

---

(۱) رسالہ اصلاح/ص/۳، ۴، ۵۔

سے ذاتی ایثار وقربانی کا سبق لینے کی تلقین کی، اس کے بعد بڑے جوش و درد کے ساتھ لکھتے ہیں:

''مسلمانو! حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی قوت ایمانی کا نتیجہ تھا کہ وہ مغفرت کی خوشخبری کو سنتے ہی اپنے دکھ درد کو بھول گئے اور جس کو وہ ساری دنیا سے زیادہ اپنا بدخواہ اور دشمن سمجھتے ہوں گے، اس کے ساتھ پھر حسن سلوک کرنے لگے، ایک ہم ہیں جو ذرا ذرا سی باتوں پر اپنے عزیزوں سے روٹھے رہتے ہیں، بولنا چالنا بند کردیتے ہیں، ان کی جان ومال، عزت وآبرو کے درپے ہوجاتے ہیں، ان پر مقدمے چلائے جاتے ہیں، مقدموں میں کامیاب ہونے کے لئے جھوٹے گواہ بناتے ہیں، جعلی دستاویزیں تیار کرتے ہیں، عمال کو رشوت دیتے ہیں، اور جو ہم میں زیادہ منچلے ہیں وہ حریفوں کو زیر کرنے کے لئے ان کے گھر میں چوریاں کرواتے ہیں، انکے کھلیانوں میں آگ لگوا دیتے ہیں، ان کے گھر میں افیون رکھ کر پولیس کے ذریعہ سے ان پر فوجداری کے مقدمے قائم کرادیتے ہیں، جو ان سے بھی زیادہ منچلے ہیں وہ بدمعاشوں کو ہموار کرکے ان کو مروا ڈالتے ہیں، اور پھر یہ خوش فہم اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں'' ۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر در پے امروز بود فردائے (حافظ)(۱)

(۱) رسالہ اصلاح/ص/۲۲، ۲۳۔

پھر اس مختصر رسالہ کو خواجہ حافظ کی ایک دردانگیز غزل پر ختم کیا ہے، جس میں وہ انقلابِ زمانہ اور دلوں کے تغیر پر خون کے آنسو روئے ہیں، جس کا مطلع ہے:۔

یاری اندر کس نمی بینیم یاراں راچہ شد
دوستی کو آخر آمد دوستداراں راچہ شد

اور جس کا مقطع ہے:۔

حافظ اسرار الٰہی کس نمی داند خموش
از کہ می پرسی کہ دورِ روزگاراں راچہ شد

انھوں نے صرف اپنے دردِ دل کے لئے اظہار ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی کوشش میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، چنانچہ ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں خاندان کے سب سے معمر بزرگ سید قطب الدین احمد صاحب جب ٹونک سے تشریف لائے تو آپ نے ان سے درخواست کی کہ وہ مقاطعہ اور خاندانی تنازعہ کو ختم کرانے کے لئے اپنے پورے اثرات اور اپنا حق بزرگی استعمال کریں، چنانچہ انکی سعی مشکور سے یہ تنازعہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوا اور برسوں کے بچھڑے گلے ملے۔

اخفائے حال

آپ نہایت کم سخن تھے، بے ضرورت بات کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، اس کم سخنی اور اخفائے حال کا نتیجہ تھا کہ قریبی تعلق رکھنے والوں اور بعض ایسے دوستوں اور بزرگوں کو جن کے ساتھ برسوں اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے کا موقع ملا، آپ کے بعض ضروری حالات اور نمایاں کمالات کا بھی علم نہ ہوسکا، حد یہ ہے کہ مولانا سید محمد علی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء کو جن کی رہنمائی میں آپ نے سالہا سال دفتر نظامت کے

کام انجام دیئے اور جو حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ خاص تھے، پوری مدت نظامت میں اس کا علم نہیں ہوسکا کہ مولانا مرحوم کا بھی حضرت مولانا سے بیعت وارادت کا تعلق ہے، مولانا مونگیری ایک مکتوب میں جو ندوہ کی نظامت سے مستعفی ہونے کے بعد لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''انھیں کاغذات سے معلوم ہوا کہ آپ کو حضرت مولانا ومرشدنا علیہ الرحمہ سے بیعت ہے، اس سے اخوت اسلامی کے علاوہ دوسری خاص اخوت ثابت ہوئی، اس بنا پر کہتا ہوں کہ اس ہیچکارہ کے اگر عیب پر آپ کو اطلاع ہو تو براہِ خدا شائستہ عنوان سے مطلع کیجئے گا۔''(۱)

لکھنؤ میں طالب علمی، پھر معتمدی ونظامت ندوۃ العلماء اور ایک نامور و کامیاب طبیب کی حیثیت سے آپ نے تقریباً چالیس سال گزارے، لیکن بہت کم لوگ آپ کے دینی مرتبہ اور روحانی مقام سے واقف ہوسکے، عام طور پر لوگ آپ کو ایک عالم اور طبیب ہی کی حیثیت سے جانتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے، مجھ سے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے خود بیان فرمایا کہ جب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ (۲) نے

(۱) مرقع خطوط محفوظہ۔ (۲) مولانا عین القضاۃ صاحب حیدرآبادی ثم لکھنوی فخر المتاخرین مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ اور اپنے عہد کے شیوخ کبار میں تھے، سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت موسیٰ جی ترکیسری سے خلافت تھی، ساری عمر خانہ نشینی اور عزلت گزینی وتوکل واستغنا میں گزاری، مسجد ومدرسہ فرقانیہ کے سوا جس کے وہ بانی تھے، شہر میں بھی انکا کہیں آنا جانا نہ تھا، ۲؍رجب ۱۳۴۳ھ (۲۷؍جنوری ۱۹۲۵ء) کو آپ نے وفات پائی، اور مدرسہ فرقانیہ واقع محلہ ٹکسال کے احاطہ میں دفن ہوئے، آپ کی وفات کا واقعہ جس طرح پیش آیا اس کا چرچا لکھنؤ کی مجلسوں میں مہینوں رہا، ملاحظہ ہو ''نزہۃ الخواطر جلد ہشتم''۔

فرمایا کہ مولانا صاحب کو کسی نے پہچانا نہیں، مجھے اگر وقت پر اطلاع ملتی تو میں انکے جنازہ میں شرکت کے لئے جاتا۔

طبعی خصوصیات

کھانا معمولی کھاتے تھے، لباس صاف پہنتے تھے، نگاہ دور بیں نہ تھی اس لئے عینک لگاتے تھے، سردی اور گرمی دونوں زیادہ محسوس کرتے تھے، اور سردی میں زیادہ کپڑے پہنتے تھے اور گرمی میں راحت اور ٹھنڈک کا بہت اہتمام کرتے، ہر چیز میں اقتصاد و اعتدال پسند کرتے تھے، جب کوئی چیز پسند آجاتی اور طبیعت کے موافق ہوتی تو پھر اس کی قیمت کا لحاظ نہیں فرماتے تھے، سفر اونچے درجہ میں آرام کے ساتھ فرماتے تھے، سکون قلب اور اطمینان کو روپیہ پیسہ پر مقدم رکھتے، شہر میں مریضوں کو دیکھنے کے لئے اکثر فینس اور پالکی میں جاتے جو اس زمانہ کے حکماء شرفاء کے لئے معزز سواری تھی، کسی زمانہ میں گھوڑا گاڑی بھی رکھی تھی، لیکن اس کے جھمیلوں اور فکروں کی وجہ سے فروخت کردی، غصہ بہت کم آتا تھا، کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے، بعض باورچیوں نے مسلسل آپ کو بے مزہ کھانا کھلایا اور کھانا جرایا، مگر آپ نے نہ کبھی ٹوکا، نہ سرزنش کی، سالن میں نمک بھی کم ہوتا تو نہ کہتے، ان کے دوستوں نے ایسے بہت سے واقعات مجھے سنائے۔

پان و تمباکو کے عادی تھے، تصنیف و تالیف کے وقت خاصدان (جو بڑی نستعلیقی اور تکلف کے ساتھ بھرا رہتا تھا) سامنے رہتا تھا، اور آپ شغل فرماتے رہتے۔

ذہنی و علمی کمالات

مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جو طولِ صحبت و رفاقت کی وجہ سے ان

کے صحیح مزاج شناس اور شب و روز کے حاضر باش تھے، لکھتے ہیں:

''آپ کا حافظہ کمزور تھا، مگر نہایت ذہین تھے، ذکاوت وفراست کا یہ حال تھا کہ آپ کے مخالف آپ کی فراست سے ڈرتے رہتے تھے، دوراندیشی اور معاملہ فہمی میں اپنی نظیر آپ تھے، طبیعت ایسی سلیم تھی کہ ہر چیز کی اہمیت اسی تناسب سے سمجھتے جس تناسب کو فطرت نے قائم کر دیا ہے، تدبر اور عقل سے بہرہ وافر پایا تھا۔''(۱)

آپ کے گوناگوں صفات وکمالات میں جو چیز مرکزی حیثیت رکھتی ہے، جس کو آپ کی شخصیت کی کلید کہنا درست ہوگا، وہ سلامتِ طبع اور شرافتِ نفس کی صفت ہے، جو آپ کے تمام اخلاق پر حاوی، اعمال کا محرک اور کامیابیوں کی کنجی تھی، بے اعتدالی، بے جا عصبیت اور غلو اور مبالغہ سے آپ کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں تھی، اس کا اندازہ خصوصیت کے ساتھ ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھویں جلد اور ان معاصرین کے تذکروں کے مطالعہ سے ہوتا ہے، جن میں سے بعض سے آپ کو مسلک یا ذوق کا اختلاف تھا، بعض سے زندگی میں اختلافات رہ چکے تھے، اور بعض شخصیتوں سے آپ کو ارادتمندی وعقیدت تھی لیکن نہ کہیں محاسن وکمالات کے اعتراف میں بخل وحق تلفی کا شائبہ معلوم ہوتا ہے، نہ کہیں عقیدتمندی کا غلو ومدح سرائی میں افراط وبے اعتدالی۔

ادب کا ذوق آپ کو فطرت میں ملا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ادب میں پایۂ بلند رکھتے تھے، وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی پوری ہزار سالہ علمی تاریخ میں ایسی سلیس وشگفتہ عربی زبان لکھنے والا (ہمارے علم میں) نہیں

(۱) ترجمۂ مصنف/ص ۲۱ر۔

گزرا، عربی زبان کے متعدد نامور مبصر ونقاد مثلاً علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی اور ادیب شہیر علی طنطاوی آپ کی انشاء اور تحریر کے بڑے قائل اور مداح ہیں، (۱) آپ شاعر بھی تھے مگر شباب کے ساتھ آپ نے شعر گوئی کو بھی جواب دیدیا تھا، پہلے عالی پھر آزاد تخلص کرتے تھے، اردو، فارسی اور عربی میں آپ کا کلام موجود ہے۔

---

(۱) کسی شخصیت کو ترجیح دینے یا اس کے امتیاز وتفوق کا فیصلہ کرنے میں زمانہ کا فرق اور مذاق کی تبدیلی ایک اہم عامل ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ہندوستان میں عربی زبان کے ایسے محقق اداشناس ادیب اور قادر الکلام شاعر پیدا ہوئے جن کی مثال دوسرے ملکوں میں بھی ملنی آسان نہیں مثلاً ''العباب الزاخر'' کے مصنف امام صغانی لاہوری، ''تاج العروس'' شرح قاموس کے مصنف علامہ سید مرتضٰی زبیدی بلگرامی جیسے لغوی ومحقق اور علامہ سید عبدالجلیل واسطی بلگرامی اور ان کے نواسے علامہ سید غلام علی بلگرامی جیسے جامع کمالات ادیب وشاعر، جن کے کمال کے اعتراف اور مدح وثنا سے مصنف ''نزہۃ الخواطر'' سرشار اور ان کی تصنیفات اس سے لبریز ہیں، لیکن چونکہ آخری علمی دور تک حریری کا سحر ہندوستان کے تمام ادبی حلقوں پر چھایا ہوا تھا اور اسی کے مقامات عربی نثر وانشاء کا قابل تقلید نمونہ سمجھے جاتے تھے، جس ادیب نے بھی کوئی کتاب عربی نثر پر لکھی وہ مقفّٰی ومسجع عبارت اور صنائع لفظی کی رعایت سے آزاد نہیں ہوسکا، علامہ آزاد کی ''سبحۃ المرجان'' اس کا ایک نمونہ ہے، جو اگرچہ تاریخ وتراجم پر ہے لیکن ان رعایتوں اور پابندیوں سے گرانبار ہے، اس طویل علمی وتصنیفی دور میں چار شخصیتیں (ہمارے محدود مطالعہ میں) مستثنٰی قرار دی جاسکتی ہیں، جن کی تحریروں میں اہل زبان (عرب عربا) کی حلاوت وسلاست کے نمونے اور مطالب کی ادائیگی پر قدرت نظر آتی ہے، زمانہ کے تقدم وتاخر کے لحاظ سے ان کے نام لکھے جاتے ہیں، ملا محمود جونپوری، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا محسن ترہتی صاحب الیانع الجنی، اور نواب صدیق حسن خاں قنوجی، لیکن ان میں سے کسی کو تاریخ وسیر پر بالاستقلال قلم اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، جس میں اس کمال کا پورے طور پر اظہار ہوتا ہے، اور مختلف مقاصد پر بے تکلف لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ سب حضرات اور وہ قابل احترام شخصیتیں جن کا اوپر تذکرہ آیا ہے، اپنے علمی کمالات، تبحر اور عربی دانی میں بدرجہا فائق تھے، اور مولانا کا ان سے مقابلہ کرنا اور ان کو ترجیح دینا سوءِ ادب اور بدمذاقی ہے، جس سے ان کی روح کو بھی اذیت ہوگی، لیکن یہ انقلاب زمانہ اور ذوق وطرز کی تبدیلی کا کرشمہ تھا اور ضرورت کا اقتضا کہ ان کو خالص عرب مصنفین کے لکھے ہوئے تذکروں کے وسیع مطالعہ کا موقع ملا، اور ایک ایسے زمانہ میں انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا جب عربی زبان حریری، بدیع الزماں اور قاضی فاضل کی رواج دی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہوچکی تھی، اس لئے انھوں نے عربی زبان میں ایسے سلیس وشگفتہ تحریر کا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر ہندوستان کے عربی لٹریچر کے ذخیرہ میں نہیں ملتی۔

عربی وفارسی میں آپ کے کلام کا وہی طرز ہے جو اس زمانہ کے عام علماء اور ادب سے ذوق رکھنے والے فضلاء کا ہے، پھر بھی کلام میں زبان کی حلاوت، الفاظ کا صحیح انتخاب اور روانی پائی جاتی ہے، غالبًا یہ صحیح المذاق عرب اساتذہ کی تعلیم وصحبت کا نتیجہ ہے، یہاں ایک نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

خیر البریة رأسهم ورئيسهم　　ابن الكرام أخو الندى والسودد

رحب الزراع حليف مجد سابغ　　خدن الصلاح شقيق عز سرمد

نور الهدىٰ غوث الورىٰ غيث الندىٰ　　غرض المنىٰ متمسك المستنجد

كهف الأرامل عون قلب خائف　　مولى البرية ملجأ المسترفد

المصطفىٰ المختار من تمت به　　نعم المليك الواحد المتوحد

أوفى البرية ذمة وأمانة　　بصداقة ووثاقة وتودد

ذاك المتوج بالأمانة والتقى　　ذانت كرامته مقام السودد

آپ کا کمال اور جوہر سخن فہمی کا ملکہ خداداد ہے، تاریخ نکالنے کی آپ نے مشق نہیں کی تھی، مگر نکالتے تھے تو خوب نکالتے تھے، ادب کے علاوہ آپ کو تاریخ سے خاص لگاؤ تھا اور آپ اسلامی ہندی تاریخ میں بلند پایہ رکھتے تھے، اور اس شعبہ میں آپ کو (کم سے کم) اپنے عہد میں خصوصیت وامتیاز حاصل تھا۔

تصانیف کی اشاعت وطباعت کے سلسلہ میں بڑے قانع اور متوکل واقع ہوئے تھے، اپنے والد ماجد کی طرح صرف تصنیف وتحقیق سے سروکار تھا، اشاعت کی ذمہ داری اپنے ذمہ نہیں سمجھتے تھے، نہ اس کی کوئی عجلت تھی، شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اشاعت کا غیب سے ایسا سامان فرمایا جو کم مصنفین کو نصیب ہوتا ہے، اور آپ کو اس سلسلہ میں مخلوق کا کم ممنون ہونا پڑا، تصانیف کے بارے میں آپ کا ذوق واصول

یہ تھا کہ تصنیف پر اتنا وقت گزر جانا چاہئے کہ مصنف اس میں ترمیم واضافہ کر سکے اور اس پر نظر ثانی کرنے کا اس کو موقع ملتا رہے، اس زمانہ کے مصنفین کی طرح آپ کا دستور نہیں تھا کہ آج کتاب لکھی اور کل شائع ہو جائے، یا ادھر کتاب لکھی جاتی رہے ادھر کتابت وطباعت ہوتی رہے، اس لئے آپ کی تصنیفات میں مطالعہ وفکر کی پختگی اور تنقیح وتحقیق نظر آتی ہے۔

عقیدت ومحبت کا تعلق اور معاصرین کے بارے میں رائے

دین ودنیا کے ہر کام میں اتباعِ سنت کا لحاظ رکھتے تھے، اور اسی کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے، ذات نبوی سے وابستگی رکھتے تھے، جس کو عشق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتے اور آپ نے بہت سے مضامین کا ان کو سرنامہ وعنوان بنایا ہے

داغ غلامیت کرد رتبۂ خسرو بلند

میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

محمدؐ عربی کا بروئے ہر دوسرا است

کسیکہ خاک درش نیست خاک بر سر او

بزرگوں اور دینی شخصیتوں میں سے آپ کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور اس عصر کے علماء ومشائخ میں اپنے پیر ومرشد حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے خاص عقیدت ونسبت تھی، حضرت سید صاحب کا ذکر جہاں کہیں کرتے ہیں بڑی والہانہ عقیدت اور شیفتگی سے کرتے ہیں، بالعموم حضرت سید احمد شہیدؒ اور کہیں ''سیدنا'' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

معاصر علماء ومشائخ میں مولانا عبدالکریم صاحب (نواسہ وداماد وخلیفہ

حضرت گنج مرادآبادی) کی تعریف اوران کے علوئے حال کا اعتراف کرتے تھے، اپنے شہر کے مشہور نقشبندی شیخ اور عارف مولانا عین القضاۃ صاحبؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے اور کبھی کبھی ان کے حلقہ میں شریک ہوتے، بعض طالبین کو جنھوں نے بعض باطنی امراض کی شکایت کی اور ارشاد وتربیت کے طالب ہوئے، مولانا محمد علی صاحب مونگیری کی خدمت میں بھیجا، میں نے ایک مرتبہ بھائی صاحب سے دریافت کیا کہ والد صاحب مرحوم اپنے معاصرین میں کس کے زیادہ معتقد اور اس کے اخلاص وللّٰہیت کے قائل ومعترف تھے، تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کے۔(۱)

□□□

(۱) وہ خطوط میں بھائی صاحب کو، جب وہ دیوبند میں تعلیم پا رہے تھے، مولانا محمود حسن صاحب اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کے اخلاق کا مطالعہ کرنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:
''مولانا محمود حسن کی ذات قدسی نمونۂ سلف ہے، ان کے اخلاق کا مطالعہ رکھو۔''

باب نہم

ہندوستان کی دینی وعلمی عظمت،
ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی تدوین،
مولانا کی اہم تاریخی تصنیفات عربی میں

ہندوستان کی دینی وعلمی عظمت

اسلامی تاریخ کا ہر شناسا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہندوستان عالم اسلام کی طلائی زنجیر میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسلامی افکار وعلوم میں اپنا خصوصی کردار ادا کرچکا ہے، مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی کتاب ''الثقافۃ الإسلامیۃ في الہند'' پر ایک اجمالی نظر ڈالنے ہی سے اس دعوے کی تصدیق ہوجائے گی، کہ اسلامی علوم وفنون کی خدمت میں ہندوستان کا حصہ کسی دوسرے ملک سے کم نہیں بلکہ بیشتر ممالک سے زیادہ ہے۔

یوں تو ہندوستان میں اسلامی قافلوں کی آمد کا سلسلہ پہلی صدی ہجری کے وسط ہی سے شروع ہوگیا تھا، لیکن ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں عالم اسلام پر تاتاریوں کے حملہ کے بعد یہاں مسلمانوں میں ہندوستان کی طرف ہجرت کا عام رجحان پیدا ہوگیا تھا، اور وہ اس عہد میں سب سے مضبوط اسلامی حکومت کا مرکز اور عالم اسلام کے ایک سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے اسلام کا سب سے مضبوط قلعہ سمجھا

جاتا تھا، یہ رجحان ایران، ترکستان اور ماوراء النہر میں زیادہ تھا، کیونکہ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں یہی علاقے تاتاری یورش کا خاص طور پر نشانہ بنے تھے، ہندوستان کی اسلامی حکومت علم وفن کے ان قافلوں کا بڑی فراخدلی سے استقبال کرتی تھی، اور اہل فضل وتقویٰ کے لئے اس کا سینہ ہمیشہ کشادہ رہتا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ تاتاری جن کو ناقابل شکست سمجھ لیا گیا تھا، جب ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو ان کو منہ کی کھانی پڑی، اوران کا زور ٹوٹ گیا، تاریخ بتاتی ہے کہ صرف علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ تا ۷۱۶ھ) کے عہد میں ہندوستان پر تاتاریوں کے پانچ حملے ہوئے، لیکن علائی فوجوں نے انھیں شکست فاش دے کر ان کا منہ پھیر دیا اور ہمیشہ کے لئے ان کے حوصلے پست ہو گئے، اس طرح علمائے اسلام کو درس وتالیف اور اشاعتِ علم ودین کا پرسکون موقع ملا، ہندوستان میں اسلامی ثقافت میں اس وقت برگ وبار آئے جب سارا عالمِ اسلام خزاں کے لپیٹ میں تھا، اور علم وادب، فکر وفن کی دنیا میں ہر طرف انحطاط وزوال چھایا ہوا تھا، عالم عربی جس پر عجمی النسل فرمانرواؤں اور مصر وشام پر ترکی النسل ممالک کی حکومت تھی، ذہنی اضمحلال اور علمی تعطل کا شکار تھے، ہر طرف تقلید عام تھی، ابداع واختراع کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا، اس تاریک عہد میں اسلام کا درخت ہندوستان میں نئے برگ وبار پیدا کر رہا تھا، دیہات وقصبات تک میں علماء واہل نظر کے بے شمار حلقے قائم تھے، جن میں اہل قلم یکسوئی سے علمی خدمت میں مصروف تھے، مشائخ اور صوفیاء زہد وعبادت اور ارشاد وافادہ کے لئے خانقاہوں کو آباد کئے ہوئے تھے، ان کی اتنی کثرت تھی کہ اس زمانہ کی تاریخ وتذکرہ پڑھنے والے کو بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہاں علم وتالیف، تربیتِ قلب، تہذیبِ نفس کے سوا کوئی اور مشغلہ ہی نہ تھا، اور علماء وصوفیا کے علاوہ کوئی بستا ہی نہ تھا۔

ہندوستان کی تاریخ اور مشاہیر رجال کے تذکرہ سے عرب مؤرخین کی بے اعتنائی

لیکن متعدد وجوہ سے ہندوستان عرب مؤرخین کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا، ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ ہندوستان اس عالمی گزرگاہ سے الگ تھا جس سے علم وفن کے کارواں گزرتے تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ فارسی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تالیف وتصنیف کی زبان بھی بن گئی تھی، خوش قسمتی سے حج کی تقریب سے علمائے ہند کو عرب جانے کا موقع ملتا تھا، اور عقیدت کی کشش ان کو بار بار کھینچ لے جاتی تھی، بہت سے لوگ مستقل ہجرت کرکے وہاں کے مشائخ سے علوم خصوصاً حدیث میں استفادہ کرتے تھے، واقعہ یہ ہے، اگر حج کی تقریب نہ ہوتی تو عالم عربی کو بھی کسی کولمبس کی ضرورت ہوتی جو اس انوکھی دنیا کا پتہ لگاتا۔

اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حافظ سخاویؔ نے اپنی مشہور کتاب ''الضوء اللامع'' میں جو نویں صدی کے علماء کے حالات پر مشتمل ہے، ہندوستان کے صرف اٹھاسی علماء کا ذکر کیا ہے، اور علامہ شوکانی یمنی نے ہندوستان سے قریب ہوتے ہوئے بھی ''البدر الطالع'' میں ساتویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک ہندوستان کے علماء میں صرف سات کا ذکر کیا ہے، محبی نے ''خلاصۃ الأثر'' میں گیارہویں صدی کے علمائے ہند میں سے چودہ کا تذکرہ کیا ہے، حالانکہ ان کی کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے ان کی تعداد بارہ سو نوے ۱۲۹۰/ ہے، اسی طرح مرادیؔ نے ''سلک الدرر'' میں بارہویں صدی کے صرف سات علماء کا تذکرہ لکھا ہے۔

ہندوستان کی تصنیفات کی خامیاں اور ان میں کارآمد مواد کی کمی

طبقات اور تراجم رجال کی طرف علمائے ہند نے ہر دور میں توجہ کی ہے جو طبعی بات بھی تھی، اور اس کے بہت سے دواعی بھی تھے، اور بعض بڑے مصنفین نے تو اس کو اپنا خصوصی موضوع بنالیا تھا، لیکن یہ کام تمام تر یا اس کا بیشتر حصہ فارسی میں ہوا ہے، پھر ان میں اتنا اختصار ہے کہ ان کتابوں میں چند ہی شخصیتوں کے تراجم ہیں، تمام ہندوستان کا احاطہ نہیں کیا گیا، بعض کتابیں تو دو یا تین صدی کے حالات پر ختم ہو جاتی ہیں، اور اکثر وہ ہیں جو کسی خاص طبقہ، مسلک یا کسی خاص فرقہ کے ساتھ مخصوص ہیں، یا ان کے مصنفین میں ایک خاص طرح کا رجحان پایا جاتا ہے۔

تاریخ وطبقات کی ان کتابوں میں اس زمانہ کے ذوق ورجحان اور ایرانیوں کے طرز تحریر وانشاء کی وجہ سے جو سارے ہندوستان پر چھایا ہوا تھا، اور یہاں کے مصنفین بھی آنکھ بند کر کے اس کی نقل کرتے تھے، اور جس کا امتیاز پر تکلف عبارت، استعاروں اور تشبیہات کی کثرت اور صنائع وبدائع کی رعایت ہے، ان کتابوں میں وہ بنیادی اور کارآمد مواد بہت کم ملتا ہے جس سے کسی سیرت وشخصیت کا مکمل ڈھانچہ تیار ہوتا ہے، اور شخصیت کے متعلق صحیح تخیل قائم ہوتا ہے، اور اس کے صحیح خط وخال اور حقیقی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، زیادہ تر مصنف کے زور قلم یا وفور قابلیت یا جوش عقیدت کا اظہار ہوتا ہے، پچاسوں صفحات پڑھ جانے کے بعد بھی ایک صفحہ کا مفید مواد بعض اوقات مشکل سے ملتا ہے، مثال کے طور پر تاریخ میں ''طبقات ناصری'' میں کسی حملہ یا جنگ کا حال پڑھا جائے یا کسی بزرگ مثلاً شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، یا مخدوم علاء الدین علی صابر کے حالات ''سیر الاقطاب'' وغیرہ میں پڑھے جائیں تو

مؤرخانہ حیثیت سے ایک دو صفحے کے قابل بھی مواد ہاتھ نہیں آتا اور اس کی روشنی میں ان کا تذکرہ اس کے عہد کے لوگوں کے لئے مرتب نہیں کیا جا سکتا، (۱) مواد و معلومات کی اسی قلت و نایابی کی وجہ سے یا قدیم العہد مصنفین کی طرز تحریر کی بنا پر ان بزرگوں کے تذکرہ نگاروں کو سخت زحمتیں پیش آ رہی ہیں، اور اسی اشتباہ والتباس اور قلت معلومات کی وجہ سے بعض بے باک مصنفین اور اہل قلم نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ مخدوم علاء الدین علی صابر پیران کلیری کی کوئی تاریخی شخصیت نہیں ہے، اور درحقیقت اس نام کی کوئی شخصیت حضرت بابا فرید گنج شکر کے خلفاء و مریدین میں گزری ہی نہیں، یہی حال شیخ احمد کھٹوی کی شخصیت کا ہے، جو نویں صدی میں سلسلۂ مغربیہ کے ایک جلیل القدر شیخ اور گجرات کے مقبول ترین بزرگوں میں ہیں، جن کا مدفن سرخیز احمد آباد میں مرجع خلائق ہے، اور انہیں کے نام پر دارالسلطنت کا نام احمد آباد رکھا گیا، ان کا تذکرہ پڑھیے شاید ایک صفحہ کے برابر بھی ضروری معلومات اور سنین و واقعات جو اس زمانہ کے لئے سرمۂ بصیرت بنے، نہیں ملیں گے، وقس علی ھذا.

ان تاریخوں کی کم مائیگی اور ان میں ضروری و بنیادی معلومات کی کمی کا شکوہ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے (جو اس راہ کے غالباً سب سے بڑے رہ نورد اور علمی تجربہ کار رہیں) بڑی خوبی سے اپنی کتاب ''یادِ ایام'' (تاریخ گجرات) میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) اس کلیہ سے مولانا سید محمد مبارک کرمانی معروف بمیر خورد کی کتاب ''سیر الاولیاء'' بڑی حد تک مستثنیٰ ہے جو سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے حالات میں لکھی گئی ہے، اور بڑی مفید معلومات اور کارآمد مضامین پر مشتمل ہے، جن سے بڑی حد تک ان کی خصوصیات و مزاج کا اندازہ ہو سکتا ہے، اور ان کی اور ان کے زمانہ کی تصویر سامنے آ جاتی ہے.

''ملک کی بدمذاقی دیکھئے کہ ابتدا سے اب تک ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب تاریخ نویسی کے صحیح معیار پر نہیں اترتی، جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے معلوم ہوتا ہے، رزم و بزم کا کوئی افسانہ ہے، قرنا وکوس کے ذکر سے اگر کوئی صفحہ خالی ملے گا تو چنگ و رباب کے ذکر سے اس کو خالی نہ پائیں گے، اگر مقفیٰ عبارتوں اور مسجع فقروں کے خارزار میں آپ کا دامن الجھ گیا تو یہ بھی ملنے کا نہیں، ایسی حالت میں کیا توقع ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی زندگی کی صحیح تصویر ایسے ناتمام مرقع میں پائیں گے۔

کچھ ان بزرگوں کے حالات میں کتابیں ملتی ہیں جو کسی سلسلۂ طریقت کے ساتھ مربوط تھے، مگر اس بدمذاقی کا کچھ ٹھکانا ہے کہ ان کتابوں سے ان کے نام ونسب ونشو ونما وتربیت، طریقہ ماند بود اور علمی مشاغل کی نسبت تحقیق کرنا چاہیں تو ایک حرف نہ ملے گا، قرنا وکوس کا تو یہاں کچھ کام نہیں، مگر چنگ ورباب یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، مصنف کا سارا زور ان کے کشف وکرامات بیان کرنے پر صرف ہوجاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ نوع انسان کے ماوراء کوئی اور ہستی نظر آتی ہے، وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، نہ خصائص انسانی سے ان کو کچھ سروکار ہے، نہ علمی مشاغل سے ان کو کچھ واسطہ ہے، ان کا صرف یہ کام ہے کہ قانونِ فطرت کو ہمیشہ توڑتے رہیں اور

مو الید ثلاثہ وعناصر اربعہ پر اپنی حکومت وخود مختاری اسی طرح
قائم رکھیں۔......

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ شیخ احمد کھتوی جن کا ذکر خیر میں اوپر کر چکا ہوں اور جو گجرات کے سرمایۂ ناز تھے، ان سے ایک نہیں بیسوں کرامتیں صادر ہوئیں اور ان کو مؤرخین گجرات نے آب و تاب سے نقل کیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ ان کا مبلغ علم کیا تھا اور ان سے اہل گجرات کو کس طرح سے فائدہ پہنچا، جب یہی بزرگ سفر حج سے واپس ہوتے ہوئے سمرقند پہنچتے ہیں اور اصول فقہ کے ایک مسئلہ پر، جس پر علماء گفتگو کر رہے ہیں اور حل نہیں ہوتا، یہ تقریر کرتے ہیں تو غل مچ جاتا ہے، لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں اور ان کو صدر مجلس میں جگہ دیتے ہیں، مگر جب یہی بزرگ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں تو فضل وکمال سے ان کو کچھ سروکار نہیں رہتا۔''

عربی زبان میں تصنیف اور ایک ہمہ گیر اور منظّم کوشش کی ضرورت

اس لئے اس کی بڑی ضرورت تھی کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس خلا کو پر کیا جاتا اور اس کے لئے ایک ایسی شخصیت سامنے آتی جس میں بلند حوصلگی، وسعت نظر، علمی تنوع اور قوت مطالعہ کے ساتھ وسعت قلبی، علمی رواداری، فراخدلی، صبر وتحمل کی صفات بدرجہ اتم ہوتیں، ہندوستان کے مختلف مکاتب خیال اور مختلف علمی حلقوں اور روحانی سلسلوں پر اس کی نظر وسیع ہوتی، عربی اور فارسی زبانوں کی کتابوں

سے (جن میں یہ مواد پایا جاتا ہے) وہ بے تکلف استفادہ کرسکتا اور اس عظیم کام یعنی ہندوستان کا تعارف عالم اسلام سے کرانے کے لئے وہ عربی زبان کا انتخاب کرتا جو عالم اسلام کی بین الاقوامی زبان ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے دوام بخشا ہے اور جس کو قرآن کی برکت نے زندۂ جاوید بنادیا ہے، اس کے لئے ایسی بے تکلف اور رواں عربی لکھنے والے کی ضرورت تھی، جو مقفیٰ اور مسجع عبارت اور صنائع و بدائع کی ان پابندیوں سے آزاد ہو، جن میں عام طور پر دور انحطاط کے عربی مصنفین اور انشاپرداز گرفتار ہیں۔

نزہۃ الخواطر کی تالیف کا مبارک عزم اور اس کی مشکلات

وہ بڑی مبارک گھڑی تھی جب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے اس کارِ عظیم کا بیڑا اٹھایا، حالانکہ اس وقت وہ ایک نوجوان طالب علم تھے اور علم و ادب کے شہر لکھنؤ کے درسی حلقوں سے علمی پیاس بجھا رہے تھے، اس صدی کے شروع میں انھوں نے علماء و مشاہیر ہند کی ایسی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، جو ہندوستان میں داخلۂ اسلام سے اس وقت تک کے حالات پر مشتمل ہو، غالباً یہ خیال انھیں اپنے محبوب استاد مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کی زیرِ تصنیف کتاب کے جو اسی موضوع پر تھی، چند اوراق دیکھ کر آیا ہو، مگر یہ خیال ان کی عمر و لیاقت سے اس وقت بلند تھا، لیکن ہمت بلند ماہ و سال کے حسابات کی پابند نہیں ہوتی، انھوں نے اس کام کی تکمیل کا فیصلہ کرلیا، اور اس کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کردیں، ہمارا اندازہ ہے کہ مسلسل تین سال تک یہی کام ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ رہا، یہ ان کی ذہانت اور دور بینی تھی کہ انھوں نے کتاب کی زبان کے لئے عربی زبان کو ترجیح دی، جو ہندوستان میں ان کے زمانہ میں اپنے آخری نقطۂ زوال تک پہونچ چکی تھی، یہ زوال ان درسی کتابوں کا نتیجہ تھا جو عرصہ سے ہندوستان میں عربی

نثر وانشاء کا واحد نمونہ بلکہ سدرۃ المنتہیٰ سمجھی جاتی تھیں، یہ ایک علمی مہم جوئی تھی کہ اس طالب علم نے جس کا ادبی نشو ونما "مقامات حریری" اور اسی طرز کی دوسری کتابوں کے ماحول میں ہوا تھا، ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا جس میں زبان وبیان کے تنوع کی سخت ضرورت تھی اور جس کے لئے اس کے پاس عجمی اسالیبِ بیان کے سوا کوئی دوسرا نمونہ نہ تھا، اس وقت ہندوستان کے عرب ممالک سے وہ ثقافتی تعلقات اور مصر وشام کے مجلّات ورسائل اور تازہ تصانیف کے پہنچنے کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں جو آج میسر ہیں، حالات واسباب کا تقاضا تھا کہ وہ یہ کتاب یا فارسی میں تصنیف کرتے جس پر اس زمانہ کے علماء کی طرح ان کو اچھی قدرت حاصل تھی، یا اردو کا انتخاب کرتے جو ان کی مادری زبان تھی اور جس کے وہ ممتاز اہل قلم تھے، لیکن انھوں نے اپنے اور اپنے ملک کے ساتھ انصاف کیا کہ کتاب کی زبان عربی رکھی، اس لئے کہ فارسی چراغ سحری ہو رہی تھی اور اس کے سمجھنے والوں کا حلقہ روز بروز محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا تھا، جہاں تک اردو کا تعلق ہے وہ ابھی اپنے ارتقاء کے منازل طے کر رہی تھی، بہرحال وسیع عالم اسلام اور علمی دنیا کے لئے ذریعہ تعارف نہیں بن سکتی تھی۔

مصنف نے جب اس علمی وتصنیفی سفر کا آغاز کیا تو انھیں اس کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا طول پکڑے گا اور مشکلات کا اس درجہ سامنا ہوگا، اور ان کتابوں سے نپٹنا پڑے گا، جنہیں سجع اور رعایت لفظی سے گرانبار کر دیا گیا تھا اور جو زیادہ تر خوارق وکرامات کے تذکروں سے بھری ہوئی تھیں، اور جن میں سنہ وتاریخ، اساتذہ وشیوخ کی تفصیل، ممدوح کے علمی وعملی کارناموں کا تذکرہ اور اس کے اصلی اوصاف وشمائل اور اخلاق وعادات کا ذکر برائے نام ہوتا ہے، اس دور کے سیاسی وتمدنی حالات کا تذکرہ تو بڑی چیز ہے اس میں بنیادی سوانحی معلومات کی بھی بڑی کمی ہے، چنانچہ محقق سیکڑوں

صفحات پڑھ جاتا ہے، مگر اس کو حقیقی تاریخ کا ایک صفحہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے، اور اس موضوع پر کام کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک تاریک سرنگ میں سے گزر رہا ہے، جس میں ہوا اور روشنی کا گزر نہیں، اس لئے ضروری تھا کہ تاریخ کے علاوہ ان کتابوں پر بھی نظر ڈالی جائے جن کا اس موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، مگر ان میں وہ چیزیں مل جاتی تھیں جو تراجم وسیر کی براہ راست کتابوں میں نہیں ملتی اور کبھی ایسی گمشدہ کڑی بھی ہاتھ آجاتی ہے جس کے بغیر ایک تذکرہ مکمل نہیں ہوسکتا۔

اس کی بھی ضرورت تھی کہ مصنف محض کتابوں ہی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان علماء کے متعلقین سے مراسلت بھی کرتے، گمنام کتب خانوں کا بھی جائزہ لیتے اور منتشر مخطوطات سے بھی استفادہ کرتے، ایسے وسیع علمی ماحول اور ندوۃ العلماء کی نظامت کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف دینی وملی حلقوں سے مصنف کا رابطہ تھا، اس لئے ان چیزوں نے بھی ان کے کام میں مدد دی، غالباً اس کتاب کی تالیف ان کی زندگی کی سب سے بڑی لذت تھی اور ان کی زندگی کا سب سے پرمسرت اور خوشگوار وقت وہ ہوتا تھا، جب وہ سب کاموں سے فارغ ہوکر اس کام میں مشغول ہوتے تھے، اس لئے عمر بھر وہ اس کام کی طرف متوجہ رہے اور کوئی سیاسی ہنگامہ یا شخصی حوادث یا پیشۂ طبابت کی مصروفیت جو ان کا ذریعۂ معاش تھا، ان کے سدّ راہ نہیں ہوئے، ندوۃ العلماء کی نظامت اس کے سالانہ جلسۂ انتظام بھی اس کام میں مخل نہیں ہوا۔

نزہۃ الخواطر کا مختصر تعارف

یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں تیار ہوئی، (۱) اس میں ساڑھے چار ہزار سے

---

(۱) چھپنے کے بعد ۲۰×۲۶/۸ رسائز پر باریک عربی ٹائپ میں تقریباً تین ہزار صفحات میں آئی ہے۔

زائد شخصیتوں کے تراجم ہیں، اس کی تصنیف میں مصنف نے جن مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کی تعداد تین سو کتابوں سے کم نہیں ہے، وہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ہیں۔(۱)

کتاب کی پہلی جلد میں ان اسلامی شخصیتوں سے لے کر جو قرنِ اول میں ہندوستان آئیں اور جن کو مصنف نے طبقۂ اول میں شمار کیا ہے، ساتویں صدی ہجری تک کے مشاہیر کے حالات ہیں، ہر صدی کے لوگوں کو ایک طبقہ شمار کیا گیا ہے، چونکہ ان ابتدائی صدیوں کے مشاہیر کے حالات میں بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے، اور بہت اچٹتا ہوا سا تذکرہ عربی یا فارسی تاریخوں میں ملتا ہے، اس لئے جلد کی ضخامت بہت کم ہے، طباعت کے وقت اس میں دو مقدمات کا اضافہ کیا گیا ہے، ایک ''ہندوستان اور تاریخ اسلام میں اس کا مقام'' جس میں پوری کتاب پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، اور ہر صنف کے ممتاز اہل کمال کا ایک جگہ نام آ گیا ہے، اسی کے ساتھ مصنف کے مقاصد اور کتاب کی خصوصیات کا تعارف بھی آ گیا ہے، دوسرا مقدمہ مصنف کے حالات وتصنیفات کے بارہ میں ہے، دونوں مقدمات مصنف کے فرزند اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے نام کے ساتھ طباعت کے وقت شامل کئے گئے ہیں۔

دوسری جلد تنہا آٹھویں صدی کے مشاہیر کے تراجم پر مشتمل ہے، کتاب کی یہی جلد سب سے اول شائع ہوئی تھی، اسی طرح سے ہر جلد میں ایک ایک صدی کے مشاہیر کے تراجم ہیں، یہاں تک کہ ساتویں جلد، تیرہویں صدی کے مشاہیر اور آٹھویں (آخری) جلد، چودہویں صدی کے مشاہیر کے ساتھ مخصوص ہے، جن میں

(۱) ان مآخذ کی فہرست نام بنام انکے قلم کی لکھی ہوئی ان کے مسودات میں دستیاب ہوئی۔

سے ایک بڑی تعداد سے مصنف کو معاصرت، ذاتی واقفیت اور دید وشنید کا تعلق ہے، قدرۃً یہ دو آخری جلدیں سب سے زیادہ ضخیم ہیں۔

کتاب کی اشاعت کی تقریب

پرانے مصنفین کی طرح مصنف بھی بڑی خاموشی کے ساتھ اس کام میں مشغول رہے، اس طویل اور پر مشقت علمی سفر کے بارے میں زیادہ فکرمند بھی نہیں ہوئے، حتیٰ کہ اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں کو بھی اس کی بھنک نہیں لگنے دی، جن کے ساتھ روزانہ کا اٹھنا بیٹھنا تھا، کتاب کی اشاعت کے لئے انھوں نے نہ کسی ناشر کی تلاش کی اور نہ کسی علمی مجلس یا ادارہ سے سلسلہ جنبانی کی، اسی اثنا میں وقت موعود آ گیا اور انھوں نے ۱۵ر جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ (۲ر فروری ۱۹۲۳ء) کو دنیا کو خیر باد کہا، اور اپنے پیچھے یہ ضخیم ذخیرہ یادگار چھوڑا، جو تقریباً دس سال تک علمی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہا، ظاہر ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا کام ایک اکیڈمی یا حکومت کا تھا، اس کی سرپرستی ہی میں وہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ سکتی تھی۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دائرۃ المعارف حیدرآباد نے جب علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی ''الدرر الکامنۃ فی أعیان المأۃ الثامنۃ'' شائع کی تو اس کتاب کے بعض واقف کاروں نے دائرہ کے ذمہ داروں کو مشورہ دیا کہ ''الدرر الکامنۃ'' کی تکمیل کے لئے ''نزہۃ الخواطر'' کی دوسری جلد شائع کی جائے جس میں آٹھویں صدی کے علمائے ہند کا تذکرہ ہے، یہ مولانا سید ہاشم صاحب ندوی کا دور تھا جو اس وقت دائرہ کے ناظم و مہتمم تھے، اس طرح ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں یہ کتاب ''الدرر الکامنہ'' کے تکملہ کی حیثیت سے سامنے آئی، اور اس طرح قیمت وافادیت نے اس کی اشاعت کی راہ

ہموار کی، اس کے لئے اس کو کسی کا منت کش نہیں ہونا پڑا اور علمی دنیا اس مخفی خزانہ سے آشنا ہوئی۔

کتاب کی اشاعت کیلئے دو جلیل القدر محرک ومعاون

ساتھ ہی مستشرقین و محققین کا مطالبہ ہوا کہ مکمل کتاب چھپنی چاہئے، اس کی اشاعت میں مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی مساعی جمیلہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

اس کی تقریب یوں پیش آئی کہ مولانا کو اپنی بیش قیمت کتاب ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' کے سلسلہ میں مشائخ وعلماء کے مفصل حالات کی ضرورت تھی، انھوں نے ''نزہۃ الخواطر'' کا دوسرا حصہ دیکھا تو ان کو اس کتاب کی قدر و قیمت اور اس میں جو معلومات یکجا آ گئے ہیں، ان کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور وہ اس کتاب کی اشاعت کے پرجوش داعی ومبلغ بن گئے، راقم الحروف کے نام اپنے ایک گرامی نامہ میں جو یکم نومبر ۱۹۴۵ء کا لکھا ہوا ہے، انھوں نے اپنے اس گہرے تأثر کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

> ''یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد مرحوم کی چیزوں سے یوں تو مجھے بچپن سے ہی خاص دلچسپی رہی ہے لیکن ''نزہۃ الخواطر'' کی قدر و قیمت مجھ پر اپنی اس کتاب کے لکھتے وقت جتنی ظاہر ہوئی، اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، اللہ کے اس مخلص بندہ نے کمال کر دیا ہے، سمندروں کو کھنگال گئے، لیکن پتہ بھی چلنے نہیں دیا، خدا کرے کہ ان کی محنت سے استفادہ کا موقع دنیا کو مل جائے، ایک انقلابی کام ہے جسے وہ کر کے چلے گئے ہیں، اب یہ ہم لوگوں کی توفیق کی بات ہے کہ اس سے خود مستفید ہوں اور دوسروں کو

مستفید ہونے کے مواقع پیدا کریں۔''

مولانا نے کتاب کی اشاعت کی تحریک کی اور ایک محضر تیار کر کے جس پر تقریباً ہندوستان کے چوٹی کے علماء کے دستخط تھے، نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں پیش کیا، (۱) اس کوشش سے کتاب کا پہلا حصہ ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں منظر عام پر آ گیا، یہ جناب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب مرحوم سابق ناظم دائرۃ المعارف کے دور کا واقعہ ہے، اس کے لئے موصوف اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں تیسرا حصہ شائع ہوا، اور کچھ عرصہ بعد اس کا چوتھا حصہ شائع ہوا۔

اب ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے، دولت آصفیہ کا جس کی سرپرستی میں ایسے بہت سے عظیم الشان علمی کام انجام پا رہے تھے، خاتمہ ہو چکا تھا، اس لئے دوسرے کاموں کے ساتھ یہ سلسلہ بھی رک گیا اور بظاہر اس کی امید نہیں باقی رہی کہ کتاب کی بقیہ جلدیں جو زیادہ ضخیم تھیں شائع ہو سکیں گی، لیکن ان کی طباعت کا اس طرح غیب سے سامان ہو گیا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات کی تلاش تھی جو کہیں دستیاب نہیں ہوتے تھے، لکھنؤ کے ایک سفر میں مولانا نے اس کتاب کا مطالعہ فرمایا، اس میں سے اکثر کے حالات اس کی غیر مطبوعہ جلدوں میں مل گئے، مولانا نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور خود مولانا ابوالکلام سے جن کی وزارتِ تعلیم سے دائرۃ المعارف کا خصوصی تعلق تھا، اس سلسلہ کی تکمیل کی تحریک

(۱) مولانا اپنے ایک مکتوب میں جو مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے نام ہے اور ۱۲ر رمضان ۱۳۶۲ھ ۲۵ر ستمبر ۱۹۴۳ء کو لکھا گیا، تحریر فرماتے ہیں، نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں مولانا عبدالحی مرحوم والی کتاب ... معروضہ میں نے پیش کر دیا ہے، وعدہ کیا ہے کہ اس کو مجلس تصنیف و تالیف میں بھیج دوں گا، ابھی تک اس کے آگے کارروائی نہیں بڑھی ہے۔ (مکاتب گیلانی / جلد اول، ص ر ۲۳۸، ۲۳۹)

کی، مولانا آزاد مصنف مرحوم اور کتاب سے ذاتی طور پر واقف تھے، انھوں نے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کیا اور اس کا وعدہ فرمایا کہ وہ دائرہ کو اس کی طرف متوجہ کریں گے، چنانچہ ان کی تحریک سے بقیہ جلدوں کی طباعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے اس کی جلدیں شائع ہونی شروع ہوئیں، یہاں تک کہ ۱۳۷۹ھ ۱۹۵۹ء میں اس کا ساتواں حصہ شائع ہوا۔ (۱)

کتاب کی تکمیل

اب صرف اس کی آٹھویں جلد باقی تھی، مگر یہ حصہ تکمیل واضافہ کے بغیر اشاعت کے قابل نہ تھا، اور یہ کام بڑی محنت وعرق ریزی اور تحقیق وجستجو کا طالب تھا، اس لئے متواتر کئی سال گزر گئے اور اس کو ہاتھ نہ لگایا جاسکا، یہ آٹھویں جلد ۵۵۳ تراجم پر مشتمل تھی، اور مصنف کے لکھے ہوئے ناتمام تراجم کی تعداد ۳۵۰ تھی، جن میں کہیں بعد کے حالات، جدید تصنیفات اور اکثر جگہ سنین وفات کے لئے بیاض چھوٹا ہوا تھا، فاضل گرامی ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب حال ناظم دائرۃ المعارف کے اصرار اور تقاضہ سے توکلاً علی اللہ راقم سطور نے اس کی تکمیل کی ہمت کی اور ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) میں یہ حصہ بھی مکمل ہو کر دائرہ کو پہونچ گیا، اور بفضلہٖ تعالیٰ اس سوانح کی اشاعت کے وقت یہ حصہ بھی تیار ہو کر کتاب مکمل ہوگئی۔ (۲) یہ حصہ ۵۴۸ صفحات میں آیا ہے۔ (۳)

---

(۱) الحمدللہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی بھی نوبت آگئی اور اس وقت تک چار ابتدائی حصے (جلد اول، دوم، سوم، چہارم) نظر ثانی اور تصحیح کے بعد دوبارہ شائع ہو چکے ہیں۔

(۲) اس مضمون کا بیشتر حصہ راقم کے اس مقدمہ سے ماخوذ ہے جو اس نے آٹھویں جلد کے لئے عربی میں لکھا تھا، اور مولوی شمس تبریز خاں رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے قلم سے اس کا ترجمہ رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں شائع ہوا، مصنف نے اس کتاب میں اس کو شامل کرتے وقت بعض مقامات پر حذف واضافہ کردیا ہے۔

(۳) اسکی تکمیل اور منظر عام پر آنے کیلئے علمی دنیا کو ڈاکٹر عبدالمعید خاں صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

کتاب کی چند خصوصیات

۱. وسعت وجامعیت

فن تاریخ اور سیر وتراجم مسلمانوں کی علمی خصوصیات میں سے ہے، مختلف دینی وعلمی، تاریخی وتمدنی محرکات ودواعی کی بنا پر جن میں علم حدیث، اسماء رجال اور سیرت نبوی کو اولیت واہمیت حاصل ہے، مسلمانوں نے اپنے ابتدائی عہد سے اس موضوع کی طرف توجہ کی، اور اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا، اور اس موضوع پر ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دیا جس کی نظیر اپنی وسعت وتنوع میں دوسری اقوام وملل میں ملنی مشکل ہے، اسی کے ساتھ اصول حدیث وفن اسماء الرجال کے ضوابط وقواعد اور تصحیح و تضعیف کے ان معیاروں کی بنا پر جو ان علوم نے فراہم کیے، نیز ان اخلاقی تعلیمات و ہدایات کے اثر سے جو ان کو ورثہ میں ملیں، انھوں نے تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری میں وہ احتیاط ملحوظ رکھی جس کی مثالیں آسانی سے نہیں مل سکتیں، عربی زبان میں اس سلسلہ میں جو کام ہوا اس کی وسعت اور قدر وقیمت کا اندازہ ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو تاریخِ علوم یا اسمائے کتب (۱) پر لکھی گئی ہیں۔

مسلمانوں کی آمد کے ساتھ یہ علم ہندوستان میں بھی آیا، اور تاریخی طور پر یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ صحیح تاریخ نویسی کی بنیاد اس ملک میں مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑی، لیکن یہ تاریخی حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اس سلسلہ میں ہندوستان کا علمی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ساتھ مولوی محامد صاحب عباسی (آئی۔اے۔ایس۔) قائم مقام ناظم دائرۃ المعارف کا بھی ممنون ہونا چاہئے جن کے زمانۂ نگرانی میں یہ جلد باہر آئی۔

(۱) مثلاً چلپی کی ''کشف الظنون''، تاش کبری زادہ کی ''مفتاح السعادۃ'' وغیرہ۔

کارنامہ بہت سی حیثیتوں سے عرب مصنفین و مؤرخین کے علمی کارنامہ کے مقابلہ میں پست ومحدود رہا ہے، اس میں کچھ تو ہندوستانی مصنفین کی حد سے بڑھی ہوئی خوش اعتقادی اور شخصیت پرستی کا دخل ہے، اور کچھ ایرانی مصنفین و مؤرخین کی مبالغہ آرائی، غلو پسندی اور فارسی طرزِ تحریر کے معائب کو جو دورِ آخر میں شدید انحطاط اور تصنع اور اغراق کا شکار ہوگیا تھا، اور جس پر شاعرانہ انشاپردازی اور مشکل پسندی کا قبضہ ہوگیا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب مؤرخین (دورِ آخر کے ان مؤرخین کو مستثنیٰ کر کے جو عجمی نژاد یا فارسی طرزِ تحریر کے زخم خوردہ تھے) (۱) عجمی مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند، جری، آزاد اور نکتہ رس تھے، پھر خاص اسباب کی بنا پر ہندوستان میں صوفیا و مشائخ زیادہ تر مرکز توجہ بنے رہے اور سلاطین وعوام کی عقیدتمندی کی وجہ سے ان کے کرامات و کمالات کو روشن کرنے پر اہل قلم کی زیادہ تر صلاحیتیں صرف ہوئیں، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صوفیا اور مشائخ پر جو کتابیں اس ملک میں تصنیف ہوئیں ان کی کم سے کم تعداد ۱۴۷ رہے اور علماء کے حالات پر جو کتابیں ملتی ہیں (خواہ کتنی ہی مختصر ومجمل ہوں) ان کی تعداد مشکل سے ۳۴ تک پہونچتی ہے۔ (۲)

غالباً اسی بنا پر مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی کے لئے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''مآثر الکرام'' کے مقدمہ میں اس فن میں اولیت کا دعویٰ کرنا ممکن ہوا، وہ لکھتے ہیں:

''در پیش از من احدے آستین سعی بایں درجہ نشکستہ و کمر خدمت
بزرگان سلف و خلف بایں جد و جہد نہ بستہ۔'' (۳)

---

(۱) مثلاً عرب شاہ ورشید الدین وطواط وغیرہ۔

(۲) یہ اعداد مصنف ''نزہۃ الخواطر'' کی دوسری کتاب ''الثقافۃ الاسلامیۃ'' سے اخذ کئے گئے ہیں، جن میں امکانی حد تک استیعاب سے کام لیا گیا ہے۔

(۳) مقدمہ مآثر الکرام، ص ۴، مطبوعہ مفید عام آگرہ پریس۔

(مجھ سے پہلے کسی نے اس درجہ میں اس کوشش کے لئے کمرِ ہمت
نہیں باندھی اور بزرگانِ سلف وخلف کے مآثر کے احیاء کا اس
حوصلہ مندی کے ساتھ عزم نہیں کیا۔)

لیکن خود اس کتاب میں جو مولانا آزاد کے بہترین مآثر میں ہے، صرف ۱۳۳ر شخصیتوں کا تذکرہ ہے، جن میں ۶۰ر تراجم (تذکرے) ان کے ہیں، جن پر فقر و درویشی کی نسبت غالب تھی، اور ۷۳ر تراجم ان حضرات کے ہیں جن کا شمار علماء و فضلاء میں ہے، ان ۱۳۳ر میں ۴۰ر صرف قصبہ بلگرام سے (جو مصنف کا وطن ہے) وطنی تعلق رکھنے والے مشائخ وعلماء کے تراجم ہیں، لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کے نامور معاصر، فخر ہندوستان علامہ سید مرتضی بلگرامی (جو دنیائے عرب میں ''الزبیدی'' کے لقب سے مشہور ہیں) کا ترجمہ اس کتاب میں موجود نہیں۔

مآثر الکرام کے علاوہ مولانا سید غلام علی بلگرامی کی تقریباً اسی موضوع پر دوسری مشہور کتاب ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' عربی میں ہے، اگرچہ ادبی لطائف اور بلاغت وعلم بدیع کے بہت سے فوائد اور نکات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں تراجم کی تعداد مآثر الکرام سے بہت کم ہے، اس میں کل ۴۶ر تراجم ہیں، جن میں خود مصنف اور اس کے تین خاندانی بزرگ شامل ہیں، انھیں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے، مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی کے اظہار کمال کا اصل میدان عربی نظم ہے، ان کی عربی نثر اس طرز قدیم سے علیحدہ اور ان روایتوں اور پابندیوں سے آزاد نہیں جو حریری کی تقلید میں کم سے کم آٹھویں صدی کے بعد سے عربی کے تمام مصنفین واہل قلم نے طوعاً وکرہاً قبول کر لی تھی، غالباً اسی وجہ سے وہ کھل کر کسی کا حال بسط وتفصیل کے ساتھ نہیں لکھ سکے، ادب عربی اور اس کے اصناف پر ان کو جو غیر معمولی

قدرت تھی اس کے باوجود اس کتاب پر ''سبک ہندی'' کا نمایاں اثر ہے اور ''مآثر الکرام'' زبان کی حلاوت وسلاست کے لحاظ سے اس سے بدر جہا فائق ہے۔(۱)

علمائے اور صوفیا کے حالات پر بلاقید زمانہ وموطن ومولد جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتاب ''اَخبار الأ خیار'' اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی ہے، کہ وہ ایک بلند پایہ عالم ومحدث اور ایک جامع شریعت وطریقت مصنف کی تصنیف ہے، اس میں کل ۲۸۱ رتراجم ہیں، صوفیاء اور مشائخ کے تذکروں میں بہت سی حیثیتوں سے مولانا محمد بن حسن منڈوی معروف بغوثی کی کتاب ''گلزارِ ابرار'' کو خاص اہمیت حاصل ہے، جو گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے، اور اپنی وسعت اور جامعیت کی بنا پر خاص امتیاز رکھتی ہے، اس میں ۶۱۲ رتراجم ہیں، وقس علیٰ ھذا.

''نزہۃ الخواطر'' اس لحاظ سے اس وقت تک سب سے بڑا جامع اور وسیع تذکرہ ہے جو ہندوستان کے مصنف کے قلم سے نکلا ہے، اوّلاً وہ کسی خاص طبقہ اور صنف کے ساتھ مخصوص نہیں، اس میں علماء ومشائخ، سلاطین وامراء، شعراء وادباء اور ہر صنف وفن کے اہل کمال دوش بدوش اور پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں، ثانیاً اس کا تعلق کسی خاص تاریخی عہد اور صدی سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے داخلۂ ہند سے اپنے عہد (چودہویں صدی ہجری) تک کے اعیان ومشاہیر کا تذکرہ ہے، ثالثاً اس کا تعلق کسی

(۱) مولانا غلام علی آزاد کی تذکرہ وسوانح کے موضوع پر تین اور تصنیفات ہیں، خزانۂ عامرہ، ید بیضاء اور سرو آزاد، یہ تینوں فارسی میں ہیں، خزانۂ عامرہ میں جو نسبتاً ضخیم ہے اصلاً ان شعراء کا تذکرہ ہے جنھوں نے اپنے زمانہ کے سلاطین وامراء سے گرانقدر انعامات اور صلے پائے، ضمناً دوسرے شعراء کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، ''ید بیضا'' میں ہندوستانی وغیر ہندوستانی شعراء کا تذکرہ ہے، اور ''سرو آزاد'' میں صرف ان شعراء کا تذکرہ ہے جن کا خاک پاک بلگرام سے تعلق رکھتا تھا، گویا یہ تینوں تذکرے شعراء کے ساتھ مخصوص ہیں، خزانہ عامرہ میں چند امراء وحکام کا بھی ضمناً تذکرہ کر دیتے ہیں۔

خاص خطۂ ملک وولایت یا علاقہ سے نہیں بلکہ درۂ خیبر سے لے خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کے ساحل تک اس کا دامن پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان جیسے وسیع ملک، جس کو ایک تحتی براعظم کہنا زیادہ صحیح ہوگا، کا احاطہ اوراس میں پیدا ہونے والے تمام اہل کمال اور ممتاز شخصیتوں کی نشاندہی اور سوانح نگاری، جن میں سے ایک بڑی تعداد گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی، اور جن میں سے بہت سے اہل کمال کا تعلق قصبات وقریات سے ہے، اور وہ ان مورخین کی نظر سے جو بالعموم حکومت کے مرکزوں اور نامی گرامی شہروں سے تعلق رکھتے تھے، اوجھل رہے، استیعاب واستقصاء کرنا انسانی طاقت سے تقریباً باہر ہے، خود مصنف ''نزہۃ الخواطر'' کو اس بات کا احساس وافسوس ہے، وہ ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''مصنفین اور مورخین نے ہندوستان کے بادشاہوں، امراء اور صوفیاء کرام وشعراء کے حالات میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بڑی محنت وعرق ریزی سے کام لیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کے علماء کی تاریخ اور یہاں کے نظام ونصابِ درس اور اس کی عہد بعہد تبدیلیوں پر کوئی کتاب نہیں لکھی، اسی وجہ سے علماءِ ہند کی تاریخ پردۂ خفا میں ہے، اور عام طور پر انکے حالات کتابوں میں نہیں ملتے، ''عین العلم'' ایک مشہور کتاب ہے، جس کے مصنف ایک ہندوستانی ہیں، لیکن لوگ یہ نہیں جانتے کہ مصنف کون اور کہاں کے باشندہ ہیں، یہی فتاوی تاتارخانیہ، فتاوی حمادیہ اور فتاوی ہندیہ، مطالب المومنین، دستور الحقائق اور بہت سی دوسری کتابوں کے مصنفین

کا حال ہے۔"(۱)

لیکن ان ساری دقتوں اور نا قابل عبور مشکلات کے باوجود یہ کتاب اتنی جامع اور محیط بن گئی ہے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد کا کوئی مصنف اور مؤرخ اب اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اور خاص حالات و مواقع کو مستثنیٰ کر کے جو ہر محقق اور مصنف کو ہر موضوع پر پیش آتے ہیں، عام حالات میں اس کتاب سے بیش قیمت مدد اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اور اس میں سہولت کے ساتھ وہ ضروری اور کارآمد معلومات یکجا مل جاتے ہیں جو بیسیوں کتابوں میں منتشر ہیں، اور جن کا جمع کرنا چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرنے سے کم نہیں، اکثر اس کتاب سے حالات و جزئیات، ضروری سنین اور اہم تصنیفات کے نام، اسی سہولت کے ساتھ دستیاب ہو جاتے ہیں جیسے لغت (ڈکشنری) میں آسانی کے ساتھ کوئی مشکل لفظ مل جاتا ہے، کوئی انسانی کام نقائص، خامیوں اور فروگذاشتوں سے پاک نہیں رہ سکتا، اس لئے اس کے حرف آخر ہونے یا اس کے مصنف کے معصوم عن الخطأ ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا، مگر ان آٹھ جلدوں میں جو کچھ مواد آ گیا ہے، اس نے بہت سے طالبین علم و تحقیق کا بہت قیمتی وقت بچا لیا ہے، اس لحاظ سے مصنف کا یہ احسان نا قابل فراموش ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے صحیح لکھا ہے:

> "اسلامی ہندوستان کے پورے ہزار سالہ عہد میں شعراء و مشائخ و سلاطین کے سیکڑوں تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں، لیکن آزاد بلگرامی کی تصنیفات کو چھوڑ کر کوئی مختصر رسالہ بھی مستقل یہاں کے علماء و فضلاء کے حالات میں نہیں لکھا گیا، مولانا سید عبدالحی مرحوم

(۱) مقدمہ "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند"۔

نے اس نقص کو محسوس کیا اور پورے بیس برس اس کام پر انھوں
نے صرف کیئے، اس عرصہ میں ہندوستان کی اس سرحد سے اس
سرحد تک کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا جہاں ان کو ذوق طلب کھینچ کر
نہ لے گیا ہو، اور بالآخر آٹھ جلدوں میں علمائے ہند کی پوری سوانح
عمریاں جمع کیں، اس کا مقدمہ لکھا، جس میں ہندوستان کے
اسلامی علوم وفنون کی تاریخ مرتب کی،(۱) عربی میں ہندوستان کی
اسلامی تاریخ، سلاطین اسلام، یہاں کے اسلامی تمدن، مساجد،
مدارس، عمارات، شفاخانے اور دیگر خصوصیات پر ایک پوری
کتاب(۱) تیار کی ۔(۳)

۲- حسنِ انتخاب اور مؤرخانہ دیدہ وری

ایک مؤرخ کی صحیح کامیابی کا پیمانہ اور اس بات کی شہادت کہ اس کو اپنے فن میں کس درجہ کا ملکۂ خداداد حاصل ہے، اور وہ اس کوچہ کی رسم وراہ سے کہاں تک آگاہ ہے، یہ نہیں ہے کہ اس نے کتنے صفحات سیاہ کیئے اور کتنی ضخیم تصنیف اس نے تیار کردی، اس کا راز دراصل اس کے جزئیات ومعلومات کے انتخاب اور اس ردوقبول میں پوشیدہ ہوتا ہے، جس سے اس نے اپنی تصنیف میں کام لیا ہے، نیز اس مذاق سلیم میں جو اس پوری کتاب میں نمایاں ہوا ہے، ایک مؤرخ جب کسی نامور شخصیت کے تذکرہ پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کو

---

(۱) اس سے مراد "معارف العوارف" ہے جو "الثقافة الاسلامية في الهند" کے نام سے دمشق میں شائع ہوئی، اس کا تذکرہ آئندہ سطور میں آئے گا۔

(۲) "جنة المشرق" کی طرف اشارہ ہے، جو "الهند في العهد الاسلامي" کے نام سے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کی۔

(۳) معارف العوارف ۱۹۲۳ء۔

حالات وواقعات (یا اگر صاحب ترجمہ کوئی عالی مرتبہ شیخ یا باکمال عالم ہے) تو کرامات وکمالات، روایات وبیانات اور مناقب وفضائل کا ایک جنگل نظر آتا ہے، اس وقت اس کے صبر وظرف اور اس کی قوت انتخاب کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اس میں کس کو قبول کرے اور کس کو نظر انداز کردے، کس کو قابل اعتماد قرار دے اور کس کو ناقابلِ اعتماد، پھر یہ کہ وہ ان منتشر اجزاء سے کس طرح اس کی سیرت کا قالب تیار کرے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں کے تذکروں میں یہی سقم ہے، کہ ان طویل وعریض تراجم میں واقعات اور صاحب سوانح کے حالات کی بعض ایسی ضروری کڑیاں غائب ہیں جن کے بغیر نہ تو کوئی سوانح مرتب کی جاسکتی ہے اور نہ صاحب سوانح کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے، اور نہ بعد میں آنے والی نسلوں کو اس کے تذکرہ میں وہ مواد ملتا ہے جو ان کے لئے قابلِ تقلید، لائقِ اتباع اور حوصلہ افزا اور ہمت آفریں ثابت ہو، واقعات اور اجزائے زندگی کے اس خلا کو پر کرنے کے لئے اور اس کے پڑھنے والے ذہن میں جو تشنگی اور کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے، اس کو رفع کرنے کے لئے مؤرخین وسوانح نگاروں نے یا تو بڑے بڑے القاب، تعظیمی الفاظ اور پرہیبت وپرجلال علمی اور روحانی اصطلاحات اور عرفی خطابات استعمال کئے یا کشوف وکرامات کی بھرمار کردی، ظاہر ہے کہ تاریخ کی جو کڑیاں گزشتہ تذکروں میں آنے سے رہ گئیں یا حوادث روزگار اور مصنفین کی بے اعتنائی سے تلف ہوگئیں، ان کو بعد کا مؤرخ پیدا نہیں کرسکتا، لیکن پھر بھی اگر طلب صادق اور ہمتِ مردانہ سے کام لیا جائے تو بمصداق ''جوئندہ یابندہ'' وہ گمشدہ کڑیاں بعض غیر متعلق کتابوں، بیاضوں یادداشتوں اور قلمی ذخیروں میں مل جاتی ہیں اور ان سے بہت سے ایسے شگاف بند کئے اور ایسے رخنے بھرے جاسکتے ہیں، جو اہلِ نظر کی آنکھوں کو شدت کے ساتھ ان قدیم

تذکروں میں چھپتے ہیں۔

اس مقصد میں مصنف مرحوم کو کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اس کا اندازہ صحیح طور پر جب ہی ہوسکتا ہے جب متعدد شخصیتوں کا تذکرہ پہلے قدیم تذکروں میں پڑھا جائے پھر ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کا مطالعہ کیا جائے، اس وقت اندازہ ہوگا کہ مصنف کی راہ کس طرح ان قدیم تذکروں سے الگ ہے، اور اس نے (خود اپنے الفاظ میں) ''رزم و بزم کے افسانوں میں سے ان موتیوں کو تلاش کرلیا جن سے کحل الجواہر تیار ہوسکتا ہے''(۱) اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو کسی نامور اور مرجعِ خلائق شیخ یا کسی باکمال ومشہور عالم کا ترجمہ پہلے ان قدیم تذکروں سے نقل کیا جاتا پھر ''نزہۃ الخواطر'' میں اس کا جس طرح تذکرہ آیا ہے، پیش کیا جاتا، مثال کے طور پر شیخ جہانگیر اشرف سمنانی یا شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری کے تراجم یا ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی یا ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تراجم پہلے قدیم تذکروں میں پڑھ لئے جائیں پھر ان کو ''نزہۃ الخواطر'' میں ملاحظہ فرمایا جائے، اس وقت اس کا مشاہدہ ہوگا۔ ع

نمی رویم زراہے کہ کارواں رفتہ است

۳- صاحب ترجمہ کے اصل امتیاز و کمال اور اسکی حیثیت کا تعیّن

علماء و اہل کمال میں بکثرت ایسی شخصیتیں گزری ہیں جن کو متعدد علوم وفنون و اصناف کمال میں دخل اور مشارکت رہی ہے، اور ان کی شخصیت جامع علوم وکمالات نظر آتی ہے، بہ یک وقت ایک عالم نحوی بھی تھا، فقیہ بھی، محدث و مفسر بھی، اصولی و متکلم بھی، کامیاب مدرس اور ماہر مصنف بھی، لیکن اس ہمہ دانی اور جامعیت کے

(۱) حرفِ آغاز، یادِ ایام (تاریخ گجرات)

باوجود کوئی نہ کوئی ایک ذوق اس پر غالب اور ایک فن یا موضوع اس کی علمی زندگی میں ایسی مرکزی حیثیت رکھتا تھا، جو اس کے زمانہ اور طبقہ میں اس کا شعار اور مابہ الامتیاز بن گیا تھا، اور اس میں اس کا اپنے معاصرین اور اقران و امثال پر تفوق اور امتیاز سب کو تسلیم تھا، لیکن مرورِ زمانہ اور وفورِ شہرت سے اس ذوق اور اس مرکزی موضوع و فن کا تعین ہر کتب بیں اور فن تاریخ کا ذوق رکھنے والے کا کام نہیں، اس کے لئے بڑی گہری واقفیت اور تاریخی مزاج دانی کی ضرورت ہے۔

حضرۃ الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا کہ جانتے ہو کہ ابن خلکان کی کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کی ''وفیات الأعیان'' کو علماء نے ہر زمانہ میں حرزِ جان بنایا ہے؟ راقم نے اپنے محدود علم و مطالعہ کی بنا پر کچھ عرض کیا، فرمایا کہ ابن خلکان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کا ترجمہ لکھتا ہے اس کے اصل موضوع اور امتیازی علم کا تعین ابتدائی تعارفی عبارت ہی میں کرادیتا ہے، مثلاً ''فلان النحوی'' ''فلان الجدلی'' ''الفقیہ'' پھر جتنا غور و مطالعہ کیا جائے اس کو اس جگہ سے ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے، اس کے بعد فرمایا کہ ''یہی خصوصیت مولانا عبدالحی صاحب کی نزہۃ الخواطر میں ہے۔''

نزہۃ الخواطر کی اس خصوصیت کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس کا ذوق اور لطف وہی حضرات اٹھا سکتے ہیں، جو ان شخصیتوں کے کمالات کے رنگا رنگ مرقع میں ان کے اصل کارنامہ اور انکی خدمت کے اصل میدان کو جانتے ہوں۔

شیخ عبدالحق دہلویؒ بہت بڑے فقیہ، محدث، مدرس، مصنف اور صاحب حال و صاحب باطن صوفی تھے، ان کا ترجمہ مصنف اس طرح شروع کرتے ہیں:

"الشيخ الإمام، العالم العلامة، المحدث الفقيه، شيخ الإسلام وأعلم العلماء الأعلام، وحامل راية العلم والعمل في المشائخ الكرام."

اس میں دراصل "حامل راية العلم والعمل في المشائخ الكرام" پوری عبارت کی جان ہے، اوران کی شخصیت کی معرفت کے لئے کلید کی حیثیت رکھتی ہے، پھر ان کے کارناموں میں سے وہ ہندوستان میں اشاعتِ علم حدیث کو اصل کارنامہ قرار دیتے ہیں۔

ملاّ نظام الدین لکھنوی جن کو درس نظامی کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہے، ان کا تذکرہ ان شاندار الفاظ سے کرتے ہیں:

"الشيخ الإمام،العالم الكبير، العلامة الشهير، صاحب العلم والفنون وغيث الإ فادة الهتون، العالم بالربع المسكون، أستاذ الأساتذة وإمام الجهابذة."

ان القاب واوصاف پر انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ان کے کارنامۂ اشاعت علمی اور جہاں استادی کی طرف خصوصی اشارہ کیا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا عنوان بن گیا ہے، ملاّ صاحب جامع علوم وکمالات تھے، لیکن مصنف نے اصول و منطق وکلام کو ان کے خداداد کمالات کا اصل مظہر ومرکز قرار دیا ہے، اسی طرح ان کے باکمال ونامور فرزند ملک العلماء ملاّ عبد العلی بحر العلوم کی ذکاوتِ خداداد وجولانیٔ طبع کا اصل میدان منطق وحکمت وکلام اور فقہ واصول کو قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

"كا ن معدوم النظير في زمانه، رأسا في الفقه والأصول، إماماً جوّالًا في المنطق والحكمة والكلام."

اسی علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرہ میں ان کی تصانیف، شروح اور حواشی کی طرف شروع ہی میں خصوصی اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے:

"أحد مشاهير الهند، اتفق على فضله علماء الآفاق وسارت بمصنفاته الرفاق."

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نامور و باکمال فرزندوں میں شاہ رفیع الدین کو علوم عقلیہ وکلامیہ میں امتیاز خاص حاصل تھا اور اس میں وہ اجتہادی شان رکھتے تھے، ان کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"المحدث، المتكلم، الأصولي، الحجة، الرحلة، فريد عصره ونادرة دهره."

اسی طرح بسبیلِ مثال شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا جہاں تذکرہ ہے وہاں پر چند جملوں نے ان کی پوری نقاب کشائی کردی ہے:

"أعلم العلماء في العلوم النافعة، وأحسن المتأخرين ملكةً في الفقه وأصوله، وأعرفهم بنصوصه وقواعده."

سلطان عالمگیرؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے چند الفاظ میں انھوں نے ان کی امتیازی خصوصیات اور ان کے اصل کارنامہ کی طرف اشارہ کردیا ہے:

"المؤيد من الله، القائم بنصرة الدين، الذي أيد الإسلام وفتح الفتوحات العظيمة وساس الأمور."

یہ مختصر عبارت اہل نظر کی نظر میں مآثر عالمگیری کا خلاصہ ہے، بابر کے تذکرہ میں "الملك المؤيد" کے لفظ نے جس سے ترجمہ شروع ہوتا ہے، وہ کام کیا ہے جو طویل عبارت بھی نہیں کرسکتی، شیر شاہ سوری کے ترجمہ کو "السلطان العادل" کے لفظ

سے شروع کیا گیا ہے اور سکندر لودھی کے تذکرہ میں "العادل" کے ساتھ "الفاضل" کا لفظ بھی بڑھایا گیا ہے پھر "السلطان الصالح" کہا گیا ہے، جو اس کی زندگی کا جوہر اور امتیاز ہے۔

۴- زندگی و دلآویزی

ہمارے مشرقی ادب و تاریخ کی ایک خامی یہ ہے کہ شخصیتوں کے چہروں پر عقیدت و تقدس کے ایسے دبیز پردے پڑ گئے ہیں اور ان کے خارق عادت کمالات کو اتنے شغف و انہماک کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اصلی خط و خال اور ان کی بشریت کے مظاہر، ان کے عادات و خصوصیات اور ان کی بے تکلف مجلسوں کی اصل تصویر دب کر رہ گئی ہے، اکثر ان کتابوں کے پڑھنے سے انسان کو ان کا لطف اور ان کے مزاج و مذاق سے واقفیت حاصل نہیں ہوتی، عام طور پر ایک ہی طرح کے الفاظ اور ایک ہی طرح کے احوال و کرامات دہرائے جاتے رہتے ہیں، یہ عیب عربی تاریخوں میں کم اور فارسی تاریخوں اور تذکروں میں زیادہ ہے۔

مصنف مرحوم نے امکانی کوشش کی ہے، کہ تذکرے محض بے جان اور فضائل و مناقب کا ایک بے روح مرقع نہ ہوں، ظاہر ہے کہ قدیم تذکروں کے لکھنے میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کا ذریعۂ معلومات تنہا متقدمین کی کتابیں تھیں، اور جب کوئی چیز لکھی ہی نہ گئی ہو تو آدمی صدیوں کے بعد اس کو کہاں سے حاصل کر سکتا ہے، پھر بھی ملفوظات و مکتوبات کی مدد سے اور بعض معاصرین کے تبصروں اور تأثرات سے کام لے کر انھوں نے بہت جگہ ایسا مواد پیش کیا ہے جس سے ان شخصیتوں کی تھوڑی سی اندرونی جھلک نظر آتی ہے، اور ان کے اصل خیالات و

جذبات سے کسی درجہ میں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

لیکن انھوں نے جب معاصرین کے تذکروں پر قلم اٹھایا اور کتاب کی آخری جلد لکھنے کی نوبت آئی تو یہ تاریکی چھٹ گئی اور ان کا یہ ذوق کھل کر سامنے آگیا، چنانچہ کتاب کی آٹھویں جلد میں ان کے موئے قلم کی کھینچی ہوئی بہت سی تصویریں ملتی ہیں، جن میں زندگی کی بے ساختگی اور دلآویزی نظر آتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک زندہ انسان نے ایک زندہ انسان کا حال بیان کیا ہے، نہ کہ بے جان قلم اور چوبِ خشک نے دوسری کی زبانی گذشتہ شخصیتوں کے مناقب قلمبند کئے ہیں، ایسے مواقع پر ان کی قوت مطالعہ، سلامت طبع اور قدرت تحریر وانشاء بہت نمایاں نظر آتی ہے، کہ شمائل واخلاق، عادات واطوار اور حلیہ وسراپا کی تصویر اپنی زبان میں بھی ہر ایک کا کام نہیں، چہ جائیکہ ایک ایسی زبان میں جو اس کے مرکز سے بہت دور محض کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کی گئی ہو، اس موقع پر ہم آخری جلد سے فخر المتأخرین مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا تذکرہ پیش کرتے ہیں جن کی مجلسوں میں مصنف کو بارہا حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، انکے مواعظ سنے اور ان کے انتقال کے وقت بھی وہ لکھنؤ میں موجود تھے اور جنازہ میں شریک۔

> ''مولانا عبدالحی کا سلسلۂ نسب یہ ہے، عبدالحی بن عبدالعلیم بن امین اللہ بن محمد اکبر بن ابوالرحم بن محمد یعقوب بن عبدالعزیز بن محمد سعید بن شیخ شہید قطب الدین انصاری سہالوی۔
>
> العالم الفاضل النحرير أفضل من بث العلوم فأروى كل ظمآن
>
> ۱۲۶۴ھ میں باندہ میں ولادت ہوئی، اپنے والد سے قرآن مجید حفظ کیا اور معقولات ومنقولات کی تحصیل بھی انھیں سے کی،

ہیئت کی بعض کتابیں اپنے نانا مفتی نعمت اللہ بن نور اللہ لکھنوی سے پڑھیں اور سترہ برس کی عمر میں سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد ایک عرصہ تک حیدرآباد میں درس وافادہ میں مشغول رہے، دومرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے، ایک مرتبہ ۱۲۷۹ھ میں اپنے والد کے ساتھ، دوسری مرتبہ ۱۲۹۳ھ میں والد کی وفات کے بعد، مکہ مکرمہ میں سید احمد بن زین دحلان شافعی اور مفتی محمد بن عبداللہ حمید الحنبلی سے اور مدینہ طیبہ میں شیخ محمد بن محمد العرب الشافعی اور شاہ عبدالغنی (بن ابی سعید) دہلوی سے اجازت حاصل کی، اس کے بعد ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ پر حیدرآباد سے رخصت لے لی، لکھنؤ واپسی ہوئی اور ساری عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزاردی۔

مجھے ان کی مجلس میں ایک سے زائد بار حاضری کا موقع ملا ہے، ان کا حلیہ اس طرح ہے، چہرہ صباحت لئے ہوئے، سیاہ چشم، نگاہ گہری ودوربیں، رخسارے لطیف ونازک، بال لانبے، بے حد ذکی وذہین، پاک نفس ونرم دل، سحر بیان مقرر، معقول ومنقول میں متبحر، شریعت کی حکمتوں اور رموز واسرار سے آگاہ وباخبر، احکام ومسائل میں بے حد محتاط، ان کی شخصیت علم افتا میں پورے ملک میں منفرد تھی، اوران کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، اور ہر جگہ کے اہل علم اس فن میں ان کی جلالت شان کے مداح ومعترف تھے۔

اصول وفروع میں ان کو دستگاہ کامل اور فضیلت تامہ حاصل تھی، اور فن تعلیم میں وہ اس مقام پر فائز تھے جہاں دوسروں کی رسائی نہ تھی، جب اہل علم ان کی خدمت میں جمع ہوتے اور کسی موضوع پر علمی مباحثہ ہوتا تو خود اکثر خاموش رہتے اور دوسروں کی گفتگو سنتے رہتے، آخر میں سب ان کی طرف رجوع ہوتے اور ایک ہی جواب میں ان سب کی مکمل تشفی ہوجاتی، ایک طویل مدت تک ان کا یہی معمول رہا، کم ظرفی یا اشتعال کی کوئی بات یا حرکت ان سے صادر نہ ہوتی، خلاصہ یہ ہے کہ ان کی ہستی صحیح معنی میں نادرۂ روزگار اور ہندوستان کے لئے باعث افتخار تھی، ان کے فضل وکمال پر سب کا اجماع ہے۔

وہ مسلکاً حنفی تھے لیکن متعصب بالکل نہ تھے، دلیل کے جویا ہوتے اگر ان کے سامنے ایسی نص صریح آجاتی جو اس مسلک کے خلاف ہوتی تو تقلید ترک کردیتے، اپنی کتاب "النافع الکبیر" میں خود لکھتے ہیں کہ "مجھے فن حدیث اور فقہ حدیث کی طرف توجہ کا موقع اللہ نے عنایت فرمایا، میں کسی مسئلہ پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتا جب تک کسی آیت یا حدیث میں مجھے اس کی اصل نہیں مل جاتی، جو مسئلہ حدیث صحیح وصریح کے خلاف ہوتا ہے میں اس کو ترک کردیتا ہوں، میں مجتہد کو اس معاملہ میں نہ صرف معذور بلکہ ماجور بھی سمجھتا ہوں، البتہ عوام کالانعام میں کوئی انتشار پیدا کرنا نہیں چاہتا اور لوگوں سے ان کی عقل وحیثیت کے مطابق بات کرتا ہوں۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اللہ کے انعامات میں سے ایک انعام یہ ہے کہ اس نے مجھے افراط وتفریط سے بچا کر درمیانی راہ چلایا، چنانچہ جب بھی کوئی معرکۃ الآراء مسئلہ میرے سامنے آتا ہے، اعتدال کی راہ خود بخود میرے دل میں آجاتی ہے، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو تقلید محض کے مسلک پر عامل ہیں، اور ادلۂ شرعیہ کے باوجود قول فقہاء کو نہیں چھوڑتے، نہ ان لوگوں میں ہوں جو ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں، اور فقہ کو بالکلیہ ترک کردیتے ہیں۔''

''الفوائد البہیۃ'' میں عصام بن یوسف کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''یہ بھی جاننا چاہئے کہ اگر حنفی کسی مسئلہ میں دلیل کی بنیاد پر اپنے امام کے مذہب سے ہٹ جائے تو وہ تقلید سے خارج نہیں ہوگا بلکہ ترک تقلید کی شکل میں اس کا یہ فعل عین تقلید ہوگا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ عصام بن یوسف نے رفع یدین کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی پیروی نہیں کی، لیکن اس کے باوجود ان کا شمار احناف میں ہے، اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو ہمارے معتمد فقہاء نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے، یعنی امام ابو یوسفؒ کا طہارت قلتین کے مسئلہ میں امام شافعیؒ کی پیروی کرنا، اس زمانہ کے جاہلوں کا شکوہ اللہ کے سوا کس سے کیا جائے جو ہر اس شخص کو مطعون کرنے لگتے ہیں، جو دلیل کی مضبوطی کی بنا پر کسی مسئلہ میں تقلید ترک کرتا ہے، اور اس کو فوراً مقلدین کی صف سے خارج

جوعوام ہیں، حیرت ان پر ہے جو اپنے کو علماء کہتے ہیں، اور عوام کالانعام کی روش پر چل رہے ہیں۔"

حدیث وفقہ میں اس کمال علمی اور بصیرت کے ساتھ اس کو علم انساب واخبار اور فنون حکمیہ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، مناظرہ کی طرف بھی پوری توجہ تھی، چنانچہ ان کی کتابوں میں جابجا اغلاط علماء کی طرف اشارے ملتے ہیں، میر زاہد رسالہ (تعلیقات حاشیہ شیخ غلام یحییٰ) پر ان کے اور علامہ عبدالحق بن فضل حق خیرآبادی کے درمیان کئی مباحثے ہوئے، مولانا عبدالحق ان سے مناظرہ پسند نہ کرتے تھے، اور چاہتے تھے کہ مولانا عبدالحی کا ردلوگوں کے سامنے نہ آئے، اسی طرح ان کے اور نواب سید صدیق حسن خان کے درمیان آخرالذکر کی کتاب "اتحاف النبلاء" میں سنین وفات اور کشف الظنون کی منقولات کے بارہ میں بہت سے مباحثے ہوئے اور اس میں اتنے غلو سے کام لیا گیا کہ فطرت سلیم بھی اس سے ابا کرتی ہے، لیکن اس کے باوجود جب صاحب ترجمہ مولانا عبدالحی کا انتقال ہوا تو نواب صدیق حسن خاں کو اتنا افسوس ہوا کہ رات کو انھوں نے کھانا نہیں کھایا، اور ان کی غائبانہ نماز پڑھی، اسی طرح مدینۃ النبیؐ کی طرف شدّ رحال کے مسئلہ میں ان کے اور علامہ محمد بشیر سہسوانی کے مابین کئی قلمی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔"

اس کے بعد ان کی اہم تصنیفات کی فہرست درج کی گئی ہے۔

''ماہ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ(۱) کی آخری شب میں وفات پائی اور اپنے آبائے کرام کے مقبرہ میں مدفون ہوئے، میں اس موقع پر حاضر تھا، یہ ہماری تاریخ کا بڑا منحوس دن تھا، ان کی تدفین میں ہر مذہب وملت کے لوگ اتنی تعداد میں شریک ہوئے کہ ان کا شمار مشکل ہے، نماز جنازہ تین بار پڑھی گئی۔''

۵. تنقید، مزاجی خصوصیات اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پیغمبروں کے سوا کوئی انسان معصوم وسرتاپا مجموعۂ خوبی نہیں، بڑی سے بڑی علمی ودینی شخصیت میں کچھ مزاجی خصوصیات اور کچھ انسانی کمزوریاں ضرور پائی جاتی ہیں، کوئی مغلوب الغضب ہوتا ہے، کسی میں ضرورت سے زیادہ احساس برتری، کسی میں خودرائی ومطلق العنانی ہوتی ہے، کوئی اپنے باکمال معاصرین کے اعتراف سے گریز کرتا ہے، کسی میں خوشامد پسندی، کوئی اس علمی شہرت کا مستحق نہیں ہوتا جو کوتاہ نظر معاصرین یا غالی عقیدتمندوں نے اس کو عطا کر رکھی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مصنف مرحوم نے اپنے معاصرین کے تذکرہ میں تہذیب وشائستگی کے ساتھ (جوان کی فطرت کا جوہر ہے) اور ادیبانہ اور بلیغ انداز میں ان کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جو صاحب ترجمہ کے دوسرے علمی وعملی کمالات کے مجموعہ میں یایوں کہئے کہ پھولوں کے گلدستہ میں ایک نرم ولطیف کانٹے کی طرح موجود ہیں، یہاں پر اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) دسمبر ۱۸۸۶ء۔

عہد آخر کے مشہور فاضل اور معقولات کے باکمال استاد علامہ عبدالحق خیرآبادی کے غیر معمولی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اپنی شخصیت سے بہت متاثر، مخالفین کے معاملہ میں نہایت متعصب، تنقید وتبصرہ میں نہایت آزاد تھے، وہ ان کا خاکہ اڑاتے اور بعض اوقات تضحیک کرتے، میں نے ان کو خود لکھنؤ کی آمد کے موقع پر کہتے ہوئے سنا کہ ہندوستان میں خال خال علماء گزرے ہیں، زیادہ تر بچوں کے پڑھانے والے تھے، جن کا مبلغ علم ضمیرو مرجع کے آگے نہ تھا، علوم کی بوبھی ان کو نہیں پہونچی تھی، البتہ تین شخص اس کلیہ سے مستثنٰی ہیں، ملاّ نظام الدین سہالوی، مولانا کمال الدین فتحپوری اور بحرالعلوم عبدالعلی، یہ البتہ علم کے سمندر تھے، اور اس کے مستحق تھے کہ اذکیائے عالم میں ان کا شمار کیا جائے، یہ دوّانی اور سید شریف کا نمونہ تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق کہتے تھے کہ علوم دینیہ میں ان کو تبحر حاصل تھا، منطق وحکمت سے محض آشنا تھے، ان کے والد شاہ ولی اللہ صاحب ناصبی تھے۔

کہتے تھے کہ ہندوستان کا ایک ہی علاقہ ہے جس سے ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء اٹھے وہ دہلی سے شروع ہوکر بہار پر ختم ہوتا ہے، کہتے تھے کہ میں جب ملاّ عبدالحکیم سیالکوٹی کا تصور کرتا ہوں تو میرے سامنے عالمِ خیال میں ایک ایسے آدمی کی صورت آتی ہے جس کا قد لانبا، کرتا ڈھیلا ڈھالا اور اوچھا،

آستین بہت چوڑی، سیاہ تہبند، بڑی سی پگڑی، خاکی رنگ کی داڑھی، ایک آدمی کھڑا ہے، جب ایسی صورت میرے سامنے آتی ہے تو میں کہتا ہوں بھلا ایسے شخص کو علم سے کیا واسطہ۔''(۱)

پھر ان کے تلمیذ رشید مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی کا ذکر کرتے ہوئے معقولات میں ان کے بلند پایہ ہونے کا پورا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کو محدثین سے سخت تعصب ہے، اور وہ ان پر تنقید واعتراض کرنے میں بہت بیباک ہیں، فلسفہ میں پورا توغل رکھتے ہیں، ان کی پیشانی پر حدیث کا نور نظر نہیں آتا۔''

سرسید احمد خاں مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے شروع ہی میں لکھ دیا ہے کہ:

''انھوں نے کسی فن کو بھی تحقیق کے ساتھ حاصل نہیں کیا تھا، ان کی تصانیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو عقل وذکاوت سے حصہ وافر ملا تھا، لیکن علم کم تھا، ان کا شمار باقاعدہ علماء کے بجائے اہل فضل اور قابل لوگوں میں کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔''

اپنے نامور معاصر اور قابل احترام رفیق کار علامہ شبلی نعمانی کا ترجمہ انھوں نے جس زور وشور سے لکھا ہے اور ان کے یگانۂ روزگار علمی وذہنی کمالات کا جس بے تکلفی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، اس کا ایک نمونہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے پوری صفائی اور بے تکلفی کے ساتھ ان کی بعض مزاجی خصوصیات اور عادات کی طرف نیز فلسفہ اور اعتزال سے تأثر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے (جو راقم کے خیال میں کوئی عیب نہیں بلکہ وفور

---

(۱) نزہۃ الخواطر جلد ہشتم۔

علم اور ذکاوت کا نتیجہ ہے) کہ:

''وہ جب کسی معمولی سے معمولی موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو اس کو بہت دھوم دھام کے ساتھ بیان کرتے اور جب کوئی عربی یا فارسی کا شعر پڑھتے تو اس کا ترجمہ اور تشریح ضرور کرتے گویا ان کا مخاطب اس زبان سے نا آشنا یا بے علم ہے، وہ ہر زبان کے ماہر، نہایت نکتہ رس واقع ہوئے ہیں، اسی طرح کبھی کبھی ان کے سامنے کوئی شخص اپنی تحقیق بیان کرتا پھر وہ دوسروں کے سامنے اور خود اسی شخص کے سامنے اس کو اس آب وتاب کے ساتھ بیان کرتے گویا ان کی ذاتی تحقیق ہے، اور مخاطب کو اس سے انکار ہے، اسی طرح ان کو اپنے خیالات وتحقیق پر بہت زیادہ اعتماد تھا جو خود پسندی کی حد تک پہونچ گیا تھا۔''

۶- بے تعصبی اور فراخ دلی

مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم نے اولاً تو نزہۃ الخواطر کا دائرہ کار کسی ایک اسلامی فرقہ اور مسلک (مثلاً اہل سنت یا احناف) تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے پیروؤں، اہل حدیث حتیٰ کہ فرقہ امامیہ کے علماء و اہل فضل کو بھی لیا، دوسرے انھوں نے تاریخ و تذکرہ کی حد تک "آت كل ذي حق حقه" اور "أنزلوا الناس منازلهم" پر عمل کرنے کی امکانی کوشش کی، صاحب ترجمہ کے مخصوص عقیدہ، فرقہ، اور اس کے انحراف و شذوذ کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کے علمی وذہنی کمالات کا دریا دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، اس کتاب میں ان کے علم و مطالعہ کی حد

تک فرقہ اثنا عشریہ کے مشہور علماء و مجتہدین کا پورا تذکرہ آ گیا ہے، اور آدمی اس کتاب کے مطالعہ سے ان کا علمی درجہ متعین کر سکتا ہے، اور ان کی علمی کاوشوں سے واقف ہو سکتا ہے، اسی طرح اس میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا بھی ترجمہ ہے، جنھوں نے ندوۃ العلماء کی تحریک کی پر زور مخالفت کی اور اس تحریک کی زندگی مشکل کر دی، اسی کے ساتھ مصنف کے بعض اکابر و اسلاف کی تکفیر کا بھی بیڑا اٹھایا اور ہندوستان کی حد تک وہ اس سلسلہ کے بانی و داعی ہیں۔

نزہۃ الخواطر کی تصنیف کا وہ زمانہ تھا کہ اہل حدیث و احناف میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی تھی، اسی بنا پر ندوۃ العلماء کی تحریک کا ایک اساسی مقصد رفعِ نزاع باہمی تھا، جس کا اصل روئے سخن علماء کی طرف تھا، جو لوگ محتاط اور صلح پسند واقع ہوئے تھے، وہ تفسیق و تضلیل اور تحقیر و تذلیل سے تو محترز تھے، لیکن ان کے کمالات اور دینی خدمات کے اعتراف میں وہ اس فیاضی، فراخ دلی اور انصاف پسندی سے کام لینے کے عادی نہیں تھے، جس کے اس گروہ کے بہت سے علماء یقیناً مستحق تھے، وہ جب ان کا تحریراً یا تقریراً ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان و قلم کو کوئی اندرونی طاقت روک رہی ہے لیکن جب وہ اپنے گروہ کے اکابر کا ذکر کرتے ہیں تو ساری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور اوصاف و خطابات کا ایک دریا بہہ جاتا ہے، مولانا سید عبد الحی صاحب کا خاندان عملاً حنفی تھا، لیکن وہ اپنے زمانہ کے اکابر علماء اہل حدیث کے صحیح علمی کمالات کو نمایاں کرنے میں ذرہ برابر بخل سے کام نہیں لیتے اور ان کو وہ مقام دیتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں، البتہ اگر ان میں کچھ بے باکی پائی جاتی تھی تو اس کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہتے، میاں صاحب مولانا سید نذیر حسین دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس طرح ان کو یاد کرتے ہیں:

"الشيخ الإمام العالم الكبير المحدث العلامة نذير
حسين بن جواد علي بن عظمة الله بن الله بخش
الحسيني البهاري ثم الدهلوي المتفق علىٰ جلالته
و نبالته في العلم و الحديث."

نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے ترجمہ کے تمہیدی الفاظ حسب ذیل ہیں:

"علامة الزمان و ترجمان الحديث و القرآن، محي العلوم
العربية و بدر الأقطار الهندية، الشريف صديق حسن بن
أولاد حسن بن أولاد علي الحسيني البخاري القنوجي
صاحب المصنفات الشهيرة و المؤلفات الكثيرة."(۱)

یہی وطیرہ ان کا دوسرے اکابر علماء اہل حدیث مثلاً مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا ابراہیم آروی، مولانا شمس الحق ڈیانوی اور مولانا حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کے بارہ میں ہے۔

ایک خیال ہندوستان کے بہت سے دینی حلقوں میں عرصہ سے یہ قائم ہوگیا ہے کہ اہل حدیث علماء علم وتصنیف میں خواہ کتنا ہی کمال پیدا کرلیں ولایت، بزرگی، مقبولیت عنداللہ اور حقیقی تقویٰ وورع کے اوصاف سے عاری رہتے ہیں، لیکن مولانا نزہۃ الخواطر میں جہاں ان کے اتقیاء وصلحاء کا ذکر کرتے ہیں کسی طرح سے مسلک حنفی کے پیروؤں اور صوفی المشرب علماء اوران میں فرق نہیں کرتے، مولانا عبداللہ غزنوی عامل بالحدیث اور میاں سید نذیر حسین صاحبؒ کے تلمیذ رشید تھے، ان کا تذکرہ اس شان سے کرتے ہیں:

---

(۱) نزہۃ الخواطر جلد ہشتم۔

"الشيخ الإمام، العالم المحدث عبدالله بن محمد بن محمد شريف الغزنوي الشيخ (۱) محمد أعظم، الزاهد المجاهد، الساعي في مرضاة الله، المؤثر رضوانه علىٰ نفسه وأهله وماله وأوطانه، صاحب المقامات الشهيرة، والمعارف العظيمة الكبيرة." (۲)

اسی طرح انھوں نے جہاں اپنے خاندان کے ایک بزرگ مولانا سید مصطفیٰ ٹونکی کا ذکر کیا ہے، جو اسی طرح عامل بالحدیث اور مولانا سید نذیر حسین صاحب کے تلامذہ میں تھے، ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں: "المتفق علی ولایته وجلالته" (ان کی ولایت اور بزرگی پر سب کا اتفاق ہے)۔

کتاب کا مرتبہ اور ہندوستان کی انفرادیت

یہ چند خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ کتاب نہ صرف اپنے موضوع پر ایک وسیع کتب خانہ اور قدیم مصنفین کی محنتوں کا نچوڑ بن گئی ہے، بلکہ ہندوستان کے لئے سرمایۂ نازش وافتخار ہے، کہ اس کی وجہ سے تمام اسلامی ممالک میں جو اسلامی حکومت یا اسلامی تہذیب وعلوم کے قلمرو میں شامل تھے، تنہا ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس کے پورے اسلامی دور کی تاریخ تسلسل وترتیب کے ساتھ مرتب ہوگئی اور اس میں کوئی خلا باقی نہیں رہا، بڑے بڑے نامور اسلامی ملکوں کے باکمال فرزندوں کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں صدیوں کا خلا پایا جاتا ہے، کسی صدی کے کئی کئی تذکرے ہیں اور کئی کئی صدیاں مستند تذکرہ سے خالی ہیں، لیکن ہندوستان مرکزِ اسلام

(۱) آپ کا پہلا اور والدین کا رکھا ہوا نام "محمد اعظم" تھا، بعد میں انھوں نے "عبداللہ" رکھ لیا۔

(۲) نزہۃ الخواطر جلد ہفتم۔

سے اپنی دور افتادگی اور اپنی بہت سی سیاسی و علمی دقتوں اور آزمائشوں کے باوجود، اسلام کی بین الاقوامی اور زندۂ جاوید زبان عربی میں ایک ایسی کتاب پیش کرسکتا ہے جو پورے عہد کے باکمال مسلمانوں کے تذکرہ پر بڑی حد تک حاوی ہے، ہندوستان کے ہمسایہ اسلامی ممالک میں افغانستان و ایران کو تو دنیائے اسلام کا یونان کہنا صحیح ہوگا لیکن ان میں سے کوئی ملک اپنے علماء و اہل فضل کا کوئی ایسا مکمل و مسلسل تذکرہ پیش نہیں کرسکتا، دور افتادہ ممالک میں ترکی نے چارسو برس تک عالم اسلام کی قیادت کی ہے، اور قسطنطنیہ مسلمانوں کا دارالخلافہ رہا ہے اور وہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں علماء و مصنفین و مدرسین پیدا ہوئے لیکن وہاں بھی کسی عالم و مصنف نے ایسا کوئی تذکرہ مرتب کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، جو اس لائقِ صد احترام ملک کے مکانی و زمانی رقبہ پر محیط ہو۔

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ کتاب مصنف کی شخصیت کا آئینہ بن گئی ہے اور اس میں اس کے قلب و روح کی تصویر اتر آئی ہے، صاف باطنی، بلا امتیاز مسلک و خیال جمال و کمال سے تأثر اور اس کا اعتراف، مدح و تنقید میں اعتدال، کمزور پہلوؤں کی نشاندہی، طرزِ ادا کی شیرینی، سبک روحی وغیرہ، مصنف کے ذوق کے تنوع اور رنگارنگی کا پورا عکس اس کتاب میں آگیا ہے، جس سے اس کی دلکشی اور دلکشائی میں اضافہ ہوگیا ہے، کتاب کا انداز ایسا ہے کہ اس میں ہر صاحب ذوق کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان موجود ہے، اس تنوع و رنگارنگی کی وجہ سے یہ کتاب ایک ایسا رفیق و انیس بن گئی ہے جس کی صحبت سے کسی وقت گرانی اور ملالِ طبع پیدا نہیں ہوتا، اور وہ اس لحاظ سے اسم بامسمیٰ اور صحیح معنوں میں ''نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر'' ہے، جیسا کہ مصنف نے اسکا نام تجویز کیا تھا اور اس کے ساتھ وہ ذکر و موعظت اور درس و عبرت کا

حسین و دلآویز مرقع بھی ہے۔

معارف العوارف في أنواع العلوم والمعارف (الثقافة الاسلامية في الهند)

اوپر کی سطروں سے اندازہ ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے علماء و مصنفین و محققین کے صحیح حالات، ان کے علمی کارناموں اور تصانیف کے متعلق صحیح معلومات مہیا کرنے میں کس قدر دشواریاں ہیں، اور ان کے ہم وطنوں اور معاصرین نے ان کے حالات منضبط کرنے اور آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دینے میں کس قدر غفلت و بے اعتنائی سے کام لیا ہے، ایسی حالت میں ہندوستان میں علم و تعلیم کی تاریخ، نصابِ درس کے ارتقاء اور اس کی عہد بعہد تبدیلیوں کی روداد مرتب کرنا اور ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد کے تصنیفی کام کا مفصل و مکمل جائزہ لینا فرہاد کے کام کی طرح پہاڑ کا جگر کاٹ کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں، مولانا سید عبدالحیؒ نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا، اگر وہ سالہا سال سے ''نزہۃ الخواطر'' کی تصنیف میں مشغول نہ ہوتے، جس کے سلسلہ میں ان کو ہندوستان کے تقریباً تمام کتب خانے کھنگالنے پڑے اور ہزارہا متعلق و غیر متعلق صفحات نہ صرف تاریخ و طبقات اور سیر و تراجم کے، بلکہ کتب تصوف و ملفوظات اور قلمی بیاضوں اور یادداشتوں کے پڑھنے پڑے، تو وہ آسانی سے اس کام کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے، درحقیقت اس کام کے لئے وہی قلم موزوں تھا جو علمائے ہند کا تذکرہ لکھنے میں ربع صدی سے مشغول و منہمک تھا، واقعہ یہ ہے کہ ''اگر یہ کتاب لکھنے سے رہ جاتی تو ہندوستانی مسلمانوں کے قلمی احسانات کی تاریخ ضائع ہو جاتی۔''(۱)

---

(۱) ترجمۂ مصنف/ص/۲۶۔

اس کتاب کے مقدمہ میں اولاً نصابِ تعلیم کی تاریخ اور وقتاً فوقتاً اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ سب بیان کی گئی ہیں، قدیم تعلیم کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے، پھر اس کے تغیرات اور ان تغیرات کے محرکات واسباب کی نشاندہی کی گئی ہے، ہر زمانہ میں جو علم معیارِ فضیلت رہا ہے اور جو نصاب تعلیم کا مقصود اصلی سمجھا گیا ہے، اس کو بھی معین کیا گیا ہے، تنہا یہی ایک مستقل علمی کارنامہ ہے جو اس کتاب کی قدر و قیمت کے لئے کافی ہے، مصنف نے اردو میں ایک مختصر مگر جامع مضمون لکھا تھا جو ''الندوہ'' کے دور اول میں شائع ہوا، اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں نہایت پسند کیا گیا، بعد میں (اردو، انگریزی میں) جو مضامین اس موضوع پر لکھے گئے، انکی بنیاد زیادہ تر یہی مضمون ہے، اسی موضوع پر مصنف نے عربی میں بھی لکھا اور اس کو اس کتاب ''معارف العوارف'' کا مقدمہ بنایا، ان دونوں مضامین میں دکھایا گیا ہے کہ قافلہ ہندوستان کس طرح وارد ہوا، کن راہوں سے گزرا، کونسی منزلیں طے کیں، کس طرح سمٹتا اور پھیلتا رہا، کن لوگوں نے اس قافلہ کی سالاری اور رہنمائی کی، کن نوواردوں کے شامل ہونے سے اس میں نئی زندگی اور نیا جوش وخروش پیدا ہوا، کون کون سے مقامات اس کی فرودگاہ بنے، پھر اس تاریخ کو چار دوروں میں تقسیم کرکے ہر دور کے نصاب تعلیم اور کتب درسیہ کو مرتب شکل میں پیش کیا ہے، اور ایک ایک کتاب کا نام گنایا ہے، پھر ہر زمانہ میں قابلیت اور فضیلت کا کیا معیار سمجھا جاتا تھا، اس کو دکھایا اور اس کے اسباب لکھے ہیں یہاں تک کہ دورِ چہارم پر آگئے ہیں جو بارہویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے، اور جس کے بانی ملاّ نظام الدین فرنگی محلی ہیں، ان کے بقول:

''ملاّ نظام الدین نے ایسے پرزور ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی کہ اب تک باوجود امتدادِ زمانہ کے اس میں کا ایک شوشہ بھی کم

نہیں کیا گیا۔"

پھر انھوں نے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہ وہ ایک طرف درسِ نظامی کے فیض یافتہ تھے، دوسری طرف ندوۃ العلماء کی تحریک، اصلاحِ نصاب کے داعیوں میں تھے، اپنے زمانہ کے مروّجہ نصاب (درس نظامی) پر مبصّرانہ تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اب طریقۂ تعلیم بگڑ گیا ہے، ملّا نظام الدین کا طریقۂ درس یہ تھا کہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے، بلکہ کتابوں کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے، اس طرزِ تعلیم نے ملّا کمال الدین بحر العلوم، حمداللہ جیسے اہل کمال پیدا کئے تھے، اس زمانہ میں جو نصاب رائج ہے، درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔"

پھر اس کے تاریخی اسباب بیان کئے ہیں کہ کس طرح اس میں بعض علوم کی کتابوں کا اضافہ بغیر فکر وغور کے خود بخود ہو گیا ہے، پھر انھوں نے بڑے بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ "ہم اگر کہنا چاہیں تو ان کو صحیح طور پر ناخواندہ مہمان، یا سبزۂ خودرو سے تعبیر کر سکتے ہیں، پھر اس مروّجہ نصاب پر انھوں نے ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اور اس کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اس مقدمہ کے بعد پھر ہندوستان میں انھوں نے ایک ایک فن کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے، ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس علم کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں اور ہندوستان سے باہر اس علم کی بنیادی اور اہم تصنیفات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس علم پر ہندوستانی مصنفین کی فہرست پیش کرتے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں نے اس میں جو اضافے اور اس کی نو بہ نو جو خدمات کی ہیں، اس

کا خاکہ پیش کرتے ہیں، ان علوم کے انتخاب میں وہ فقیہانہ مزاج ومعیار سے کام نہیں لیتے اور صرف انہی علوم کا تذکرہ نہیں کرتے جن کا اسلام سے براہِ راست تعلق ہے، بلکہ ان سب علوم کو شامل کرتے ہیں جن سے مسلمانوں نے اپنے عہد تمدن میں دلچسپی لی اور اپنی ذہانت اور محنت سے چار چاند لگا دیئے، چنانچہ اس کتاب میں علوم آلیہ (صرف ونحو، فقہ، فرائض، حدیث، اصول حدیث، اسماء الرجال، تفسیر، تصوف، کلام) کے علاوہ علوم عقلیہ وفنون نظریہ (منطق وفلسفہ، ریاضی، ہیئت وہندسہ، علم موسیقی، طب) اور پھر ان سب کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، ہندی شاعری کا جائزہ اور ہندوستان کے شعراء کا منتخب کلام بھی پیش کیا ہے، آخر میں دوسری زبانوں سے اردو میں جو تراجم ہوئے ہیں ان میں سے بھی چند اہم کتابوں کے نام پیش کئے ہیں۔

اس کتاب کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فتاوی عالمگیری جیسی شہرۂ آفاق کتاب کے (جو مشرق وسطیٰ میں ''فتاوی ہندیہ'' کے نام سے مشہور ہے اور فقہ حنفی کی جزئیات واحکام کا بڑا ماخذ سمجھا جاتا ہے) مرتبین کی ایک جامع ومکمل فہرست پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، غالباً یہ جامع ترین فہرست ہے، جو اس وقت تک کسی کتاب میں یکجا پیش نہیں کی گئی تھی۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علم حدیث کے ہندوستان میں داخلہ اور اس کی اشاعت وترقی پر جو فصل لکھی گئی ہے وہ ہمارے علم میں اس سلسلہ کا سب سے بڑا محققانہ اور پراز معلومات مضمون ہے جو اس مضمون سے پہلے اس تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا، پھر فنون حدیث میں علمائے ہند نے جو خدمات انجام دیں اور اس میں جو امتیازات پیدا کئے ان سب کی تفصیل ہے، اس کتاب میں بھی ''نزہۃ الخواطر'' کی طرح مصنف کی سلامت روی، اعتدال وتوازن اور فراخ دلی کے جابجا نمونے نظر

آتے ہیں، تقلید وعدم تقلید، عمل بالحدیث اور تطبیقِ فقہ وحدیث کے بارے میں ہندوستان کے علماء کے جو گروہ بن گئے ہیں اور اس میں جو نقطۂ اعتدال ہے ان کا تذکرہ کرتے وقت مصنف اور کتاب کا یہ وصف پورے طور پر نمایاں ہوا ہے، فقہ واصول اور مذاہب کے سلسلہ میں انھوں نے اہل سنت کے فرقہ اثنا عشریہ وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، اس طرح یہ کتاب شرق اوسط اور عالم اسلام میں نیز مغرب میں ہندوستان کو علمی حیثیت سے متعارف اور مسلمانوں کی علمی ودینی خدمات سے واقف کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئی ہے، اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کی ایک ایسی ڈائرکٹری کی حیثیت رکھتی ہے جس سے طلباء وفضلاء، مصنفین ومحققین اپنے علمی مقالوں اور تحقیقی مباحث میں بیش قیمت مدد ورہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

مصنف نے اس کتاب کا نام "معارف العوارف في أنواع العلوم والمعارف" رکھا تھا، لیکن جب دمشق کی مشہور سرکاری اکاڈمی "المجمع العلمي العربي" (۱) نے ۱۹۵۸ء میں جب اس کو شائع کرنا چاہا کہ وہ ہندوستان کی علمی خدمات کی واقفیت کا واحد ذریعہ ہے، تو انھوں نے اس کو "الثقافة الاسلامية في الهند" کے نام سے شائع کیا، دار المصنفین نے "اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں" کے نام سے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ (۲)

جنة المشرق ومطلع النور المشرق

"یہ کتاب بھی عربی میں ہے اور تین فنون پر مشتمل ہے، اول فن جغرافیہ ہند

---

(۱) اب وہ "مجمع اللغة العربية" کے نام سے موسوم ہے، یہ مشرق وسطی کی سب سے پرانی اور سب سے زیادہ کارگزار اکیڈمی ہے، جس کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں پڑی تھی، اس کے پہلے صدر نامور عرب فاضل وادیب، علامہ محمد کرد علی تھے، مشرق ومغرب کے ممتاز ترین فضلاء اور ادباء اور مستشرقین اس کے رکن تھے، یہ اکیڈمی شروع سے ایک بلند پایہ علمی وتحقیقی سہ ماہی رسالہ بھی نکالتی ہے جو اس اکیڈمی کے نام سے موسوم ہے۔

(۲) کتاب کے مترجم مولانا ابو العرفان خاں صاحب ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء ہیں۔

میں، فن ثانی تاریخ میں اور فن ثالث خطط و آثار میں، جغرافیہ کے حصہ میں قدیم وجدید تاریخی ومذہبی وتمدنی حیثیتوں سے ہندوستان پر نظر ڈالی گئی ہے، اور ہر حیثیت سے یہ حصہ مکمل ہے، جتنی معلومات اس میں فراہم کی گئی ہیں وہ کہیں یکجا نہیں مل سکتی ہیں، تاریخ کے حصہ میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ مجتہدانہ انداز سے لکھی گئی ہے اور ہندوستان کا کوئی اسلامی حکمراں خاندان ایسا نہیں جو اس میں ذکر نہ کیا گیا ہو، اکثر تاریخی اغلاط جو شائع وذائع ہو چکے ہیں ان کی تصحیح کی گئی ہے۔

حصہ ثالث بالکل نئی چیز ہے شاہانِ اسلام کے عہد میں ہندوستان میں جو ترقیاں ہوئی ہیں، وہ سب اس میں بیان کی گئی ہیں، مسلمانوں کے عہد کا تمدن وطرزِ معاشرت، شاہانِ اسلام کے ہر ہر عہد کے رسوم اور معاشرت کی تبدیلیاں، ان کے محاصل وخراج وطریق حکمرانی وغیرہ سب پر غایت استقصاء کے ساتھ بحث کی گئی ہے، بہت سے امورِ خیر مثلاً باغات وانہار ومدارس وجوامع وغیرہ جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا، وہ بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں، جتنی معلومات اس باب میں یکجا مل سکتی ہیں وہ تاریخ کے متوسط درجہ کے کتب خانوں کی ورق گردانی سے نہیں مل سکتیں۔'' (۱)

یہ ان تاریخوں کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جو مختلف ملکوں میں ''خطط'' کے نام سے لکھی گئی ہیں، جن میں سے مقریزی کی ''خططِ مصر'' اور کرد علی کی ''خطط الشام'' مشہور ہے، اسطرح بجا طور پر اس کتاب کا نام ''خططُ الہند'' ہوسکتا ہے۔

یہاں پر اس کے تیسرے باب سے دو مختصر اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ کتاب کا (جو افسوس ہے کہ ابھی تک (۲) غیر مطبوعہ ہے) کچھ اندازہ ہو سکے۔

---

(۱) ترجمۂ مصنف۔ (۲) الحمد للہ کہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے یہ کتاب ''الہند فی العہد الاسلامی'' کے نام سے طبع ہوگئی اور اس کا اردو ترجمہ بھی مولوی شمس تبریز خاں صاحب رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے قلم سے شائع ہوگیا ہے، انگریزی کا ترجمہ بھی تیار ہے۔

اسلامی ہند میں ڈاک کا نظام کیا تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں ڈاک کی دو قسمیں تھیں، ایک ڈاک وہ تھی جو گھوڑ سواروں کے ذریعہ روانہ کی جاتی تھی، اس کو ترکی زبان میں ''اولاق'' کہتے تھے، یہ صرف سرکاری کاموں کے لئے مخصوص تھی اور اسکے لئے ہر چار میل پر سواروں کا انتظام کیا گیا تھا، دوسری عام ڈاک تھی جو پیادوں سے بھجوائی جاتی، اس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر تہائی میل پر ایک گاؤں بنایا گیا تھا اور گاؤں کے باہر تین گنبد یا قبے، جن میں پیادے کمر کسے ہوئے تیار بیٹھے رہتے، ہر ایک کے پاس دو ہاتھ کا ایک عصا ہوتا جس کے اوپری سرے تانبے کی جھانجھیاں لگی ہوئی تھیں، جب ڈاک شہر سے روانہ کی جاتی تو ڈاکیہ ایک ہاتھ میں ڈاک سنبھالتا دوسرے ہاتھ میں یہ نشانی، جو ساز کی طرح بجتی رہتی، اگر خطوط زیادہ ہوتے یا اس کے ساتھ کوئی وزنی چیز ہوتی تو وہ اس کو ایک تھیلے میں رکھ کر اپنی اس لاٹھی سے باندھ کر پیٹھ پر لاد لیتا اور وہ حصہ جس میں جھانجھیں ہوتیں اپنے ہاتھ میں پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ دوڑنا شروع کرتا، قبے میں بیٹھے ہوئے لوگ جھانجھوں کی آواز سن کر پہلے ہی تیار ہو جاتے، ڈاکیہ کے پہنچتے ہی ایک آدمی بڑھ کر تھیلا اس کے ہاتھ سے چھین لیتا اور اسی ترکیب اور کیفیت کے ساتھ آگے دوڑنا شروع کرتا، یہاں تک کہ آگے والے گنبد کے پاس پہنچتا، اور دوسرا آدمی ڈاک اس کے ہاتھ سے لے کر اسی تیز رفتاری

کے ساتھ آگے روانہ ہوتا، یہاں تک کہ ڈاک کی منزلِ مقصود آجاتی، ابن بطوطہ نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ڈاک گھوڑوں سے زیادہ تیز رو تھی۔

''مرآۃ احمدی'' میں ہے کہ تیموری سلاطین کے عہد میں ڈاک کا قانون یہ تھا کہ ایک میل کا فاصلہ (جوان کے یہاں پانچ ہزار ہاتھ کے برابر تھا) ایک نجومی ساعت میں طے کرنا ضروری تھا، اس لحاظ سے احمد آباد اور دہلی کی درمیانی مسافت ان کو بارہ دن میں طے کرنی ہوتی تھی اور اگر کوئی فوری مسئلہ ہوتا تو ایک ہفتہ میں، اس سے زیادہ تاخیر میں ان کو تاوان دینا پڑتا تھا، اور ایک چوتھائی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔(۱)

سلاطین ہند کی خاص ایجادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلم سلاطین نے بہت سی ایسی چیزیں بذات خود ایجاد کیں جو عجائبات میں شامل ہیں اور جن کا پورے طور پر شمار آسان نہیں، ہم اس موقع پر صرف چند خاص چیزوں کا ذکر کریں گے۔

فیروز شاہ تغلق نے ایک ایسی حیرت انگیز گھڑی ایجاد کی تھی جو صرف تانبے کی ایک کٹورے سے مشابہ تھی، ہر ایک گھنٹہ کے بعد مترنم آواز میں اس سے یہ شعر سنا جاتا ؎

(۱) جنۃ المشرق قلمی، ص ۲۴۷، یہ اقتباس اس کتاب کے تیسرے باب سے لیا گیا ہے جو تعمیرات کے علاوہ شاہراہوں، شہروں، پلوں، تالابوں اور حوضوں کے متعلق ہے، نیز اس میں ان تغیرات اور اضافوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مختلف زمانوں میں پیش آئے۔

ہر ساعتے کہ بر در شاہ طاس می زنند
نقصان عمری شود آں یاد می دہند

اس سے افطار کا وقت اور سایہ کی کیفیت و مقدار بھی معلوم ہوتی تھی، سلطان نے اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ایجاد کی تھیں، یہ گھڑی فیروز آباد میں تھی۔

جونپور میں گومتی پر ایک پل تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا، جس کا تاریخی نام "صراط مستقیم" تھا، یہ پل منعم خاں نے ۹۸۱ھ میں اکبر شاہ تیموری کے عہد میں تعمیر کیا تھا، اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے دونوں رخ پر دکانیں تھیں، گزرنے والے کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ پل سے نہیں کسی بازار سے گزر رہا ہے۔

محمد بن الحسن الرومی (رومی خاں) نے ابوالغازی نظام شاہ کے ایما سے ۹۹۹ھ میں خالص پیتل کی ایک توپ تیار کی تھی (اور ایک قول کے مطابق اس میں دوسری دھاتوں کی بھی آمیزش کی گئی تھی) جس کا طول ۱۴ر فٹ ۳ر انچ، عرض ۵ر فٹ ۱۲ر انچ، وزن ۱۰۲۱ر من تھا، اس کا نام "ملک میدان" اور اب بھی بیجاپور میں موجود ہے۔

امیر فتح اللہ شیرازی نے اکبر شاہ کے عہد میں ایک ایسی بندوق ایجاد کی تھی جس سے ایک مرتبہ میں بارہ دفعہ گولیاں نکلتی تھیں، امیر فتح اللہ ہی نے ایک ایسی پن چکی ایجاد کی تھی جو بغیر کسی واسطہ کے خود بخود چلتی تھی، اس کے علاوہ بھی انھوں نے

مختلف ایجادات کیں۔

حکیم علی گیلانی نے ۱۰۰۲ھ میں لاہور اور آگرہ میں ایک ایسا حوض تیار کیا تھا جس کا طول وعرض بیس بیس گز اور عمق تین گز تھا، اس کے وسط میں ترشے ہوئے پتھروں کی ایک خوبصورت عمارت تھی اور اس کی چھت پر ایک بلند مینار تھا اور چاروں طرف چار پل تھے، جس کے ذریعہ لوگ عمارت میں آتے جاتے تھے، عجیب بات یہ تھی کہ اس کے دروازے کھولتے وقت پانی اس میں داخل نہ ہوتا تھا۔

اورنگ آباد میں نہر ہرسول کے قریب ایک ایسا تالاب یا خزانۂ آب تھا، جو ملک عنبر کے حکم سے زیرزمین بنایا گیا تھا، پہلے پانی ایک بہت بڑے حوض میں اکٹھا ہوتا، اس کے بعد زمین دوز نالیوں سے مختلف علاقوں کو سیراب کرتا، میں نے کتاب میں دوسری جگہ اس کی تفصیل درج کی ہے۔(۱)

شاہجہاں کے عہد میں قلعہ معلّیٰ میں ایک ایسا حمام تیار کیا گیا جس میں ایک بتی برابر جلتی اور اس سے پانی گرم ہوتا رہتا، یہ بتی اس وقت سے اسلامی عہد اقتدار کے آخری دور تک برابر جلتی رہی۔(۲)

□□□

(۱) بیجاپور کی تعمیرات اور دوسرے تاریخی مکانات وعجائبات کا ذکر کتاب کی ایک علاحدہ فصل میں کیا گیا ہے۔

(۲) جنۃ المشرق (قلمی) ص/۲۹۰۔

باب دہم

اردو کی تاریخی تصنیفات، یادِ ایام، گلِ رعنا، دوسرے رسائل و دینی تصنیفات

اردو میں تاریخی تصنیفات

مولانا سید عبدالحی صاحبؒ نے (غالباً اس وجہ سے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے علمی و دینی کارناموں پر کسی نے عربی میں تفصیل کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا تھا) شروع سے اپنی تاریخی و تصنیفی سرگرمیوں کے لئے عربی زبان کا انتخاب کرلیا تھا، اور وہی شروع سے ان کی محنت کا اصل میدان اور ان کی علمی و ذہنی صلاحیتوں کا اصل مرکز و مظہر رہی، اور اسی پر ان کی عمر کا پیشتر حصہ صرف ہوا، اور یہی بہتر تھا، کہ اردو میں کام کرنے والے بہت تھے، اصل ضرورت باہر کی دنیا کو متعارف کرانے کی تھی، جس کے لئے دو ہی بہترین ذریعے ہو سکتے تھے، عربی، انگریزی، عربی کو کئی وجوہ سے ترجیح حاصل تھی کہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی اسلامی برادری کی وہ محبوب و مقدس زبان تھی، اور اسی عالمگیر برادری کو اس کے ایک خاندان اور گھرانہ (ہندوستانی مسلمانوں) کی خدمات اور کارناموں سے واقف کرانے کی زیادہ ضرورت تھی، پھر وہ انگریزی سے واقف بھی نہ تھے، اور انگریزی میں اس کام کو بطریقِ احسن انجام دینے کے لئے بہت سے لوگ موجود تھے۔(۱)

لیکن کبھی کبھی انھوں نے اردو میں بھی کسی تقریب یا تحریک سے اس موضوع

---

(۱) اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی تک اس طبقہ میں سے کسی نے یہ کام انجام نہیں دیا۔

پر قلم اٹھایا، مگر وہ ایک وقتی ضرورت تھی جو ان کی علمی زندگی میں ایک ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتی تھی، جیسے ہی وہ اس ضرورت کی تکمیل سے فارغ ہوئے اپنے اصل موضوع و مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

اردو میں ان کی تاریخی تصنیفات و رسائل میں (متفرق مضامین کے علاوہ) دو کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں، ایک ''یادِ ایام''، دوسرے ''گلِ رعنا''

یادِ ایام (تاریخِ گجرات)

یادِ ایام کی تصنیف ان کے محترم و فاضل دوست نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ کی فرمائش سے عمل میں آئی، نواب مرحوم اس زمانہ میں ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ'' کے آنریری جوائنٹ سکریٹری تھے، کانفرنس کا اجلاس جب ربیع الاول ۱۳۳۷ھ دسمبر ۱۹۱۸ء میں سورت میں ہونا قرار پایا، انھوں نے مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی، اور فرمائش کی کہ وہ اس کے لئے کوئی ایسا مضمون یا رسالہ تیار کریں جس میں گجرات کے اسلامی دور کے کارناموں کی تصویر آجائے، اور جو اہلِ گجرات اور شرکائے اجلاس کے لئے چشم کشا اور ہمت آفریں ثابت ہو، انھوں نے اس سلسلہ میں جو مکتوب لکھا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''جناب مکرم و معظم .... السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

امسال سورت میں کانفرنس کا اجلاس ۲۷، ۲۸، ۲۹/ دسمبر (۱) کو قرار پایا ہے، سورت باب مکہ ہے یا تھا، اس لئے جی چاہتا ہے کہ یہ حیثیت اجلاس میں بالکل ہی مفقود نہ ہو، کیا آپ کے قدوم کی

---

(۱) ۱۳، ۱۴، ۱۵/ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ۔

توقع کی جائے؟ ملاقات بھی ہو جائے گی، ضروری امور پر موقعِ گفتگو ملے گا، آیئے تو خالی ہاتھ نہ آیئے، گجرات کی گزشتہ اسلامی عظمت پر ایک خطبہ ہو جس سے علم ظاہر و باطن کے جو دریا اسلامی دور میں جاری رہے وہ یاد آجائیں، اسی کے ضمن میں مختصر تاریخ ہو، جس میں خاص خاص سلاطین کے اوصافِ علمی وتربیت نمایاں ہو، آپ اس کام کو تو کر سکتے ہیں، وقت اور فرصت دونوں کم ہیں، لیکن کرنے کا کام ہے، اور ہو گیا تو ایک کارنامہ ہوگا بصیرت افزا۔"

مولانا سید عبدالحی صاحبؒ نے اپنے "صدیق حبیب" کی اس عزیز فرمائش کی تعمیل کی جو ان کے ذوق اور موضوع سے پوری مطابقت رکھتی تھی، اس لئے بقول ان کے "ان کے زخمِ کہن تازہ ہو گئے، اور انھوں نے تھوڑی مدت میں وہ بسیط مقالہ یا مختصر رسالہ تیار کر لیا جو بعد میں کانفرنس کی طرف سے "یادِ ایام" کے نام سے شائع ہوا، وہ سورت پہونچ کر دفعتاً علیل ہو گئے اور مضمون پڑھنا تو درکنار کانفرنس کے جلسوں میں بھی نہ شریک ہو سکے مگر اس بہانہ سے یہ قیمتی رسالہ وجود میں آ گیا، جس کے لئے (اگر یہ قومی محرک نہ ہوتا) ان کا وقت نکالنا مشکل تھا، یہ ہزاروں صفحات اور بیسیوں کتابوں کا عطر ہے، جس میں صرف "سرکار و دربار" کی روداد نہیں سنائی گئی بلکہ اس دور کی پوری تمدنی، علمی، اور دینی تصویر مکمل طریقہ پر آ گئی، شاہانِ گجرات کے خصائصِ حکمرانی، اصلاحاتِ ملکی، زراعت، صنعت و حرفت کی ترقی، علوم و فنون کی اشاعت وفروغ، مدارس کا قیام، ماہرین فنون کا تعارف، گجرات کے وزرائے با کمال اور علمائے نامدار کا تذکرہ، ان کے کارنامے اور سلاسلِ طریقت، سبھی ضروری مضامین

اختصار سے آگئے ہیں۔

بیان میں اتنی دلآویزی اور تحریر میں اتنی حلاوت ہے کہ کتاب نہ صرف صحیح تاریخ نویسی کا بلکہ ادب وانشاء کا بھی ایک دلکش نمونہ بن گئی ہے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اس رسالہ پر اپنے تأثرات کا اظہار مصنف کے نام ایک خط میں کیا ہے جو یہاں پیش کیا جاتا ہے:

''رب کریم عم نوالہ کی ایک نعمت عظیم تھی جو کل آپ کے رسالہ کے پیرایہ میں ظاہر ہوئی، میں نے رات ہی اس کو کل تقریباً پڑھ لیا، میرے سرور ومباہات کی عجیب کیفیت تھی، پڑھتا تھا، اور فخر وخوشی کی موجیں دل میں اٹھتی تھیں اور بار بار رسالہ کو آنکھوں سے لگاتا تھا اور چومتا تھا، اگر آپ سامنے ہوتے تو یقین ہے کہ آپ کے ہاتھ چومتا، قدم چومتا، اللہ اکبر! یہ سعادت میرے مقدر میں تھی کہ مسلمانوں کی علمی مجلس کو اس خطۂ ملک میں لے گیا، جہاں سب سے پہلے اہلِ توحید کے قدم آئے اور جہاں سب سے پہلے اسلام کے مصنف مدفون ہیں، فالحمد لله علی ذلك حمداً کثیراً طیباً. اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہ نایاب رسالہ ہاتھ آیا، میری معلومات میں کس قدر اضافہ ہوا، سب سے اول اسلامی خطہ ہندوستان میں سندھ مانا گیا ہے، کراچی کانفرنس کے زمانہ میں میں نے اس کی تاریخ دیکھی تھی، یہ رات معلوم ہوا کہ ''تانہ'' ''تابعی'' ہے اور کی زیارت ''تبع تابعین'' کا ایک گونہ شرف بخش سکتی ہے، آپ نے ماشاء اللہ خوب رسالہ لکھا ہے، بیان صاف

اور دلکش، مطالب محققانہ، مآخذ نادر اور صحیح، کمال یہ ہے کہ ایک مختصر رسالہ میں گوناگوں تاریخ سنادی، ملکی، علمی، روحانی، صنعتی، حرفتی، زراعتی، میں نے سورت سے واپس آکر ''تاریخ فرشتہ'' میں گجرات کی تاریخ لفظ بلفظ پڑھی، حاشا میرے دماغ میں ان حالات کا ایک شائبہ بھی نہیں آیا، بزم ورزم کا فانوس خیال آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اسی وقت علی گڑھ بھیجتا ہوں کہ طبع ہو کر جلد شائع ہو، گجراتی میں بھی انشاء اللہ شائع ہوگا۔

کیا خوب ہو! اگر ندوۃ العلماء کا اجلاس امسال احمد آباد میں ہو، میں نے اس کے متعلق نیاز نامہ بھیجا ہے، میرا دل شہادت دیتا ہے کہ یہ رسالہ آپ کی بیش بہا تصانیف کی اشاعت کا مقدمہ ثابت ہوگا، انشاء اللہ۔

حیدرآباد، ۷رجمادی الاولی ۱۳۳۷ھ(۱)

گلِ رعنا

ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار اور جدید نظام تعلیم کے رائج ہونے سے پہلے ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا، جو فارسی وعربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق وفلسفہ، ادب، (نثر ونظم) بلاغت وفن عروض سے لے کر علوم دینیہ (فقہ، اصول وحدیث وتفسیر وعلم کلام) پر مشتمل تھا، صدیوں تک ہندوستان میں ذہنی صلاحیتوں کے نشو ونما، فطری جوہر وملکات کے چمکانے اور اعلیٰ ثقافت (کلچر) پیدا

(۱) ۸رفروری ۱۹۱۹ء۔

کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا، جس سے ملک کے انتظامیہ کے لئے اعلیٰ عہدہ دار یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ عہدہ دار یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ (اکاونٹنٹ جنرل) جس کو عہد قدیم میں "مستوفی الممالک" کے نام سے یاد کرتے تھے، دبیر و منشی (انشا پرداز وسکریٹری) اور قاضی و مفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے، مستوفی الممالک مولانا شمس الدین خوارزمی (صدر و محاسب اعلیٰ بعہد غیاث الدین بلبن) خواجہ جہاں محمود گانواں گیلانی وزیر سلطنت بیدر دکن، جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی وزیر شاہجہاں بادشاہ اور تفضّل حسین خاں علامہ وزیر سلطنت اودھ کے نام بطور نمونہ پیش کئے جاسکتے ہیں، جو سب اسی دور کی یادگار اور اسی طرزِ تعلیم کا نتیجہ تھے۔

اس عہد میں جس طرح ہر طرح کے باصلاحیت تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کے لئے جو ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال سکیں، کوئی اور ذریعۂ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اسی طرح ادب وانشاء، تحریر وتصنیف، نقدِ سخن اور شاعری اور سخن سنجی کا مذاق اور سلیقہ پیدا کرنے کے لئے بھی کوئی متوازی نظامِ تعلیم یا اختصاص پیدا کرنے کا کوئی شعبہ موجود نہ تھا، جس طالب علم میں جس فن کی فطری صلاحیت اور خداداد مناسبت ہوتی تھی یا اس کے مخصوص محرکات جمع ہو جاتے تھے، وہ اس میں امتیاز واختصاص پیدا کر لیتا تھا، اور اس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیتا تھا، فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش ودلآویز نمونے نصاب تعلیم میں داخل تھے، اور بالعموم اساتذہ ان کو ایسی دلچسپی، دلسوزی سے پڑھاتے تھے (۱) کہ بجز ان لوگوں کے جو فطری طور پر ذوق اور ادبی صلاحیت سے محروم ہوتے تھے، عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر وادب سے لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے، اس لئے اردو

---

(۱) عربی کے مقابلہ میں فارسی ادبیات کے نمونے اور اس کی نظم ونثر کا انتخاب بہتر تھا، اس لئے اس نصاب سے فارسی کا جتنا اچھا ذوق پیدا ہوتا تھا اور اس میں انشاء وتحریر کی جو صلاحیت پیدا ہوتی تھی وہ عربی میں عام طور پر مفقود تھی۔

میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی، اس زمانہ میں نصابِ تعلیم، زندگی، ملک کی زبان وادب اور مجالس ومعاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی، جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا، یہی باکمال اساتذہ جو مسند درس پر بیٹھ کر منطق وفلسفہ کی خشک وبے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے اور حدیث وتفسیر کے درس کے وقت وقار وتمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر وقریہ کی ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے، اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے، خود بھی طبع آزمائی کرتے اور شعر کا کھرا کھوٹا خوب پرکھتے، بلکہ اکثر اوقات انہی کا قول اس بارہ میں قول فیصل ہوتا، مولوی محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں اپنے استاد ذوق کے حالات میں لکھا ہے، کہ ذوق نے اپنے استاد شاہ نصیر کی غزل پر غزل لکھی:

''شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اس طرح میں لکھا، مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا، انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا:

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں
کہ بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا، اور دربارِ شاہی میں جا کر قصیدہ

سنایا۔"(۱)

۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظامِ تعلیم رائج ومقبول نہیں ہوا تھا، ادبی وعلمی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ فضلاء صدر نشین ہوتے، وہی زبان وادب کی اس ملک میں سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے، انہی کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا، انہی کے قلم سے ان مباحث پر بلند پایہ تصنیفات نکلتیں، اس لئے کہ پورے ملک میں یہی سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا، ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک بھی مولوی امام بخش صہبائیؔ، مولانا عبداللہ خاں علویؔ، مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ اور مولانا فضل حق خیرآبادیؔ، جس طرح علوم معقول ومنقول میں اپنے دور کے امام مانے جاتے تھے، اسی طرح نکتہ شناسی، دیدہ وری، وسخن فہمی میں بھی معیار تسلیم کئے جاتے تھے، اوران کا قول حرفِ آخر اور زبان وادب کے بارے میں بھی "فتویٰ" کی حیثیت رکھتا تھا، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ جن کی سخن فہمی اور نکتہ رسی ان کے دور میں ایک ایسی حقیقت بن گئی تھی کہ غالبؔ تک کو یہ کہنا پڑا ؎

غالبؔ بہ فن گفتگو ناز دیایں زورش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

اسی نظام تعلیم کے فیض یافتہ وپروردہ تھے مولانا فضل حق خیرآبادیؔ، جو اس دورِ آخر میں علوم عقلیہ کے امام مانے جاتے ہیں، اور جن کا سارا وقت منطق وفلسفہ کی اعلیٰ کتابوں کی درس وتدریس اور ان کی موشگافیوں میں گزرتا تھا، اس پایہ کے سخن فہم وسخن شناس تھے کہ غالبؔ نے ان کی خاطر اپنے اشعار (جو شاعر کے لئے اولاد کی طرح

(۱) آب حیات، مطبع کریمی لاہور، ص ۴۵۴۔

عزیز ہوتے ہیں) کے ایک بڑے حصے پر خطِ نسخ پھیر دیا، مولانا حالیؔ لکھتے ہیں کہ:

"مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دوثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔"(۱)

اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی وادبی قیادت رہی، مولوی محمد حسین آزادؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد دہلویؔ اور علامہ شبلی نعمانیؔ جن کو دورِ آخر میں زبان وادب کی عمارت کے چار ستون کہنا بجا ہوگا، اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اور انھیں کے قلم سے "آبِ حیات"، "مقدمہ شعر وشاعری" اور "موازنہ انیس ودبیر" جیسی معرکۃ الآراء کتابیں نکلیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحی اسی دورِ واپسیں کی آخری یادگاروں میں تھے، انھوں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، اس میں گھر گھر شعر وسخن کے چرچے تھے، شہروں کو چھوڑ کر جہاں مشاعرہ لازمۂ تمدن بن گیا تھا، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی مشاعرہ کی محفلیں آراستہ ہوتیں، اور نوجوان تو نوجوان بچے تک شعر موزوں کرنے کی کوشش کرتے، ان کے والد مولوی سید فخر الدین صاحب خیالیؔ جیسا کہ اس کتاب کے باب اول سے معلوم ہو چکا ہے، پُر فکر شاعر اور کہنہ مشق نثّار وادیب تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب جب لکھنؤ میں تحصیل علم میں مشغول تھے اس وقت منشی امیر احمد مینائی، حکیم ضامن علی جلال، شیخ امیر اللہ تسلیم اور مولوی محمد محسن کاکورویؔ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، ان میں سے بعض اساتذۂ سخن اگرچہ دربار رامپور سے متعلق ہو گئے تھے لیکن وطنیت کے تعلق سے لکھنؤ کے در و دیوار ان کے اشعار کی تعریف وتحسین کے شور سے گونج رہے تھے، اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور کلام تھا، اُدھر مرزا

---

(۱) یادگار غالب۔

سلامت علی دبیرؔ اور میر ببر علی انیسؔ کے مراثی کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور سارا شہر ان کے کلام سے مست ہو رہا تھا، وہ خود دردمند دل اور موزوں طبیعت لے کر آئے تھے، اردو تو ان کی زبان تھی، عربی و فارسی، ادب و زبان سے ان کو فطری مناسبت تھی، بھوپال گئے تو وہاں بھی والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر (جو مفتی صدر الدین خاں آزردہؔ کے عزیز شاگرد تھے) کی جوہر شناسی اور قدردانی سے شہر با کمال و صاحب ذوق علماء و ادباء کا مرکز تھا، اور افتخار الشعراء حافظ محمد خاں شہیرؔ، غلام احمد فروغیؔ اور متعدد نامی گرامی شعراء موجود تھے، اس ماحول اور اس انداز کی تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوقِ سلیم اور سخن فہمی کا مذاقِ صحیح پیدا نہ ہونا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعراء کا ایک تذکرہ مرتب ہوا جو ان کی زندگی کے بعد ''گلِ رعنا'' کے نام سے شائع ہوا۔

شعرائے اردو کے تذکرے

ہندوستان میں ترکی و افغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے فارسی ہی تصنیفی و دفتری زبان قرار پائی اور ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصہ بعد تک ہر قسم کا سنجیدہ علمی و تحریری کام یہاں تک کہ مراسلت، باپ بیٹوں اور دوستوں کی خط و کتابت بھی بالعموم اسی زبان میں ہوتی تھی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے، یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خط و خال اس کی زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک پلک اور شعراء کی امتیازی خصوصیات اور ان کے طرز کلام کو ظاہر کرنے کے لئے لکھے گئے، اور ان میں تمام تر ان کے اردو کلام کا نمونہ ہی پیش کیا گیا ہے، لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی ہے، چنانچہ میر تقی میرؔ کی ''نکات الشعراء''،

میر حسنؔ اور مصحفیؔ کے تذکرے، مولوی قدرت اللہ کا ''طبقات الشعراء'' فتح علی شاہ کا ''تذکرہ''، اسی طرح سے ''بزم سخن مہر جہاں تاب'' اور حد یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کا ''گلشنِ بے خار'' سب فارسی ہی میں ہیں۔

آبِ حیات

مولوی محمد حسین آزادؔ مرحوم کا یہ بہت بڑا علمی وادبی کارنامہ اور اُردو پر احسان ہے کہ ''آبِ حیات'' لکھ کر انھوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان وادب وشاعری کے گہوارے میں پلے تھے اور اردوئے معلیٰ کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی، استاذ ذوقؔ جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھیں تھیں، لکھنؤ بھی وہ اس وقت آئے تھے جب ناسخؔ وآتشؔ کے تذکروں سے محفلیں گرم اور دبیرؔ وانیسؔ کی خوشنوائی سے لکھنؤ کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن فہم، سخن شناس تھے، ان کا خمیر شعروادب سے اٹھا تھا اور اس کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشاء پرداز ہیں کہ انکی انشاپردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی کلاسیکل ادب اور ان کے ادبی شہپاروں سے آنکھیں ملاتی ہے، ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا سید عبدالحی نے ''گلِ رعنا'' میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور ان کے اس یگانہ کمال کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی ''آبِ حیات'' ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشا پردازی کا

بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی بیساختگی اور برجستگی اور اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کردینے کے قابل ہیں۔

اس کتاب کی مقبولیت کی سب بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادونگار قلم نے لکھدی ہیں وہ آج اردو کی انشاء پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہوگئی ہیں، اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں، جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چوں وچرا مانے جاتے ہیں، اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے۔"(۱)

"گل رعنا" لکھنے کی ضرورت

لیکن کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لئے وقف نہیں ہوتا اور کوئی کتاب بھی (خواہ وہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو) اپنے فن وموضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی، علم وفن، فلسفہ وحکمت، شعروادب، صنّاعی و معماری، مصوّری ونقاشی، اختراع وایجاد، سب کی وسعت وترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقش دوام اور ان کی تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا گیا اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرین فن اور علم وتحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہل قلم نے اپنے پیشروؤں کے فضل وکمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے انکا علمی محاسبہ بھی کیا اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں

(۱) گل رعنا/ص۴۰، طبع چہارم ۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۱ء۔

اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم وفن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی وگستاخی نہیں قرار دی گئی، بلکہ ہر نئی نسل کے بساط علم وتحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ یہی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی ہے

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ خوردہ درگِ تاک است

آبِ حیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، وہ اپنی غیر معمولی مقبولیت اور اپنی اعلیٰ انشاء پردازی، دقیق نکتہ سنجی، بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرّا اور غلطیوں اور فروگذاشتوں سے کلیۃً خالی نہ تھی، مولانا آزاؔد پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے، اور ادب وحسنِ انشا ان کے تیغِ قلم کا اصل جوہر ہے، ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بُعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند ہوتا ہے، اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لئے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کیلئے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے، اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گرانبار ہوتی ہے، مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحان وطبیعت، ادب وانشاء پردازی ہے، خواہ وہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں، یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہوتو ''دربارِ اکبری'' کا مطالعہ کیا جائے۔

آبِ حیات کے ان تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے، ہم تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱. آبِ حیات میں جن شعراء کا تذکرہ ہے بہت خوب ہے، اور آزاؔد نے ان

کے بارہ میں اپنی سخن شناسی اور ذوق کی لطافت کا پورا ثبوت دیا ہے، لیکن ہر دور کے شعراء کی ایک بڑی تعداد جن میں سے بہت سے ان شعراء کے ہمپایہ تھے جن کا تذکرہ آب حیات میں آیا ہے، اور بعض اپنے ان خوش قسمت معاصرین سے جن کا آب حیات میں تذکرہ آگیا ہے، بلند پایہ تھے نظر انداز ہوگئی ہے، ان کے تذکرہ کے بغیر اردو شاعری کی مسلسل تاریخ میں بیچ بیچ میں خلا محسوس ہوتے ہیں، اور بعض اہم کڑیاں مفقود نظر آتی ہیں۔

مثلاً طبقۂ متقدمین میں سے مولانا نصرتیؔ، فقیر اللہ آرزوؔ، میر سراج الدین سراجؔ، میرزا داؤدؔ، داؤد میر عبدالولی عزلتؔ، عارف الدین خاں عاجزؔ اور محمد حسین کلیمؔ نظر انداز ہوگئے ہیں، ان میں سے بعض کا کلام بالخصوص میر سراج الدین سراجؔ کے اشعار صفائی زبان کا نمونہ اور اردو شاعری کی ترقی و پیش رفت کے اظہار کے لئے سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، اور میرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد کے کلام سے لگا کھاتے ہیں، نیز دور متوسطین میں سے انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، میر محمد بیدارؔ، میر قدرت اللہ قدرتؔ، میر ضیاء الدین ضیاءؔ، حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، کرامت علی شہیدیؔ کا تذکرہ موجود نہیں، شیخ قیام الدین قائمؔ اور شیخ بقاء اللہ بقاءؔ، کا تذکرہ حاشیہ میں چند چند سطروں میں آیا ہے، ان میں سے یقینؔ، ممنونؔ، ظفرؔ، شیفتہ (۱) کسی طرح سے آزاد کے سے جوہر شناس اور کمال کے سچے قدردان کی قدردانی سے محروم ہونے کے لائق نہ تھے، اور سہو یا تغافل کی توجیہ اس حالت میں آسان نہیں کہ اس تذکرہ میں میر ضاحکؔ اور میر مستحسنؔ، خلیقؔ جیسے شعراء موجود ہیں، جن کے دو دو چار شعر سے زیادہ آزاد کو نہ مل

---

(۱) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا صرف نام اور ولدیت، مومن خاں کے تذکرہ میں آگئی ہے اور اس کا ذکر ہے کہ وہ "گلشن بے خار" کے مصنف ہیں۔

سکے، اور نہ انھوں نے اپنے عہد اور ادبی رجحانات پر کوئی اثر ڈالا، متاخرین کے دور کو لو تو خواجہ محمد وزیر وزیر، میر وزیر علی صبا، نواب سید محمد خاں رند، مرزا محمد رضا برق، میر علی اوسط رشک، مرزا اصغر علی خاں نسیم، میر ظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر، قلم انداز ہو گئے ہیں، اور اسی طرح لکھنؤ کے ان نامی گرامی شعراء کے تذکرہ سے آب حیات خالی ہے، جن کا اس عہد میں طوطی بولتا تھا، اور جو دور دور شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے، اسی طرح منشی امیر احمد امیر مینائی، نواب مرزا خاں داغ، مرزا قربان علی سالک، میر مہدی مجروح اور حکیم ضامن علی جلال اس بزم میں نظر نہیں آتے، جن کی شاعری سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ رامپور وحیدر آباد اور خود دہلی کی مجلسیں معمور و مخمور تھیں، اس موقع پر یہ عذر نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی شاعری کے شہباز نے آزاد کی وفات کے بعد بال و پر نکالے اور انھوں نے ارتقاء کے منازل طے کیے، اس لئے کہ یہ سب وہ ہیں جو شاعری کی دنیا میں نام پیدا کر کے آزاد کی وفات (۱۳۲۷ھ، ۱۹۰۸ء) سے کئی کئی سال پہلے اس دنیا سے سفر اختیار کر چکے تھے اور آزاد جیسا اردو ادب و شاعری کا قدر دان اور مبصر، ان سے بے خبر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سے آزاد نے انیس و دبیر کا تذکرہ دل لگا کر کیا ہے اور انکی معنی آفرینی، نازک خیالی اور بلند پروازی اور شکوہ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے، جن کے متعلق امیر مینائی کہتے ہیں کہ:

> ''ان کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا، کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے۔''(۱)

ان کی نظمیں ''صبح تجلی''، ''چراغ کعبہ'' اور ''سراپا'' وغیرہ کے بند پڑھے جائیں، وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، تشبیہات و استعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیس و دبیر سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی

(۱) مقدمہ مکتوبات امیر مینائی۔

ساری ذہانت ومحنت نعت نبویؐ اور مدیح خیر المرسلینؐ میں صرف کی، اور انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ ومنقبت، مصائب اہل بیت اور واقعۂ کربلا کے بیان کرنے میں، جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی، اپنی ذہانت اور قوت شاعری صرف کی۔

اسی طرح ''آب حیات'' اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی اور بہت سے ایسے شعراء واساتذہ نظر انداز ہوگئے جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔

اسی طرح آزادؔ کی آخری زندگی اور ان کی وفات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، لسان العصر میر اکبر حسینؔ الہ آبادی نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ پیدا کیا، خود مصنف آب حیات مولوی محمد حسین آزادؔ بھی اس کے مستحق تھے کہ ان کو اس بزم میں جگہ دی جائے اور اردو شعراء کا تذکرہ جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو، ان کے تذکرہ سے خالی نہ ہو، اس لئے ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے اور اس عہد تک کے لئے ایک جامع تذکرہ کہلانے کی مستحق ہو۔

۲. آب حیات میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزادؔ نے ان کے بارہ میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گوہر بار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا، وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی کا تھا اس لئے کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں، کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ

گزرے ہوں، مثلاً اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ان کی نظر سے نہیں گزرا اور اس کے لئے آب حیات میں داخلی شہادتیں موجود ہیں، غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ''نکات الشعراء'' (جس کو انجمن ترقی اردو نے نظامی پریس بدایوں سے شائع کیا) کے مقدمہ میں اس کو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا، (۱) اور آب حیات اور ''نکات الشعراء'' میں متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کر کے آخر میں لکھا ہے:

''بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گزرا، قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے۔'' (۲)

یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱. آزاد کہتے ہیں کہ ''میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن سے دماغ پریشان ہو، دیباچہ میں کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا تذکرہ لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر نہیں لکھوں گا جن سے دماغ پریشان ہو، ''نکات الشعراء'' کے مطبوعہ نسخہ میں صرف ایک سو (۱۰۲) دو شعراء کا تذکرہ ہے۔

۲. آزاد لکھتے ہیں کہ ''ان ہزار میں سے ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا'' ''نکات الشعراء'' کے مطالعہ سے اس کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خلاف ان کی فراخ دلی، صاف دلی، اور وسیع المشربی کا برملا ثبوت ملتا ہے، وہ

(۱) ملاحظہ ہو ''آب حیات'' اور ''نکات الشعراء'' / ص ۲۰ تا ۲۴۔

(۲) نکات الشعراء (مقدمہ) ص ۲۴۔

اعتراف کمال، تحسین سخن شناس کی روشن مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

۳. آزاد نے لکھا ہے کہ "ولی بنی نوع شعراء کا آدم ہے" اس کے حق میں فرماتے ہیں:

"وے شاعر یست از شیطان مشہور تر" (آب حیات ص ۹۵/۱ مطبوعہ مفید عام پریس ۱۸۹۹ء) یہ فقرہ نکات الشعراء میں کہیں موجود نہیں اس کے بجائے نکات الشعراء میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں، "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد۔"

۴. آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ "میر صاحب نے میر سوز کو پاؤ شاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز"، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں کہ یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، نکات الشعراء میں خواجہ میر درد اور میر سوز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے بالکل خلاف ہے، اسی طرح ان کے تخلص کے متعلق جو لطیفہ آب حیات میں ہے نکات الشعراء سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، میر صاحب نے ان کے تخلص کی تبدیلی کے واقعہ کو ممنونیت اور بزرگانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی و نازک مزاجی کی جو تصویر کھینچی ہے اور نواب سعادت علی خاں کا سامنا ہو جانے اور ان کی بے پرواہی اور بے نیازی کا جو نقشہ بیان کیا ہے، پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کا ایک ہزار روپیہ بھیجنے اور رد و کد کے بعد قبول کرنے کا جو واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، اس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی، مصنف گل رعنا نے میر صاحب کے ایک ہمعصر مرزا لطف علی کی کتاب "گلشن ہند" کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ان کا مشاہرہ کبھی موقوف نہیں ہوا اور ۱۲۱۵ھ تک ان کا یہی حال رہا، انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جب میر صاحب

کی تنخواہ جاری تھی، خود انشاء اللہ خاں کی رسائی پہلی مرتبہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ہوئی، اس لئے درایۃً بھی یہ واقعہ صحیح نہیں، انھوں نے ان تمام واقعات پر جو میر صاحب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے وہ ان کے منہ پر کھلتی نہیں، کچھ شبہ نہیں کہ میر صاحب نازک مزاج تھے، مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں ''خردماغ'' سمجھے گا۔''(۱)

آزاد کی واقفیت اودھ کی تاریخ سے زیادہ گہری اور وسیع نہیں، اور یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ اودھ کی تاریخ کا مواد ان کو نہ ملا ہو، اس لئے ان کے قلم سے بعض ایسی روایتیں نکل گئی ہیں جو محض ناواقفیت اور سطحی معلومات پر مبنی ہیں، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں:

''آزاد کہتے ہیں کہ سودا، ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے کہا مرزا تمہاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے،'' یہ بپاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔'' یہ سب افسانہ ہے، شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ وہ دلّی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ

(۱) حاشیہ گل رعنا/ص/۱۵۹، ۱۶۰، طبع چہارم۔

ان کی ملازمت میں رہے، ان کے کلیات میں متعدد قصیدے
شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں، مصحفی اپنے تذکرہ میں
لکھتے ہیں، ''ہر جا کی می رفت عزت وحرمت تمام می یافت،
نواب مرحوم ومغفور نیز بودن اور اور سرکار خود غنیمت می
دانستند۔''(۱)

صرف نکات الشعراء ہی نہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گزرا، یا کم سے کم آب حیات کی تصنیف کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھا، انھوں نے سید انشاء کے اس زمانہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے جب اقبال نے ان سے منہ موڑ لیا تھا اوران کے ولی نعمت (نواب سعادت علی خاں) کی نگاہیں ان سے پھر گئی تھیں، مرزا سعادت یار خاں رنگین سے نقل کیا ہے کہ ''تیسری بار گیا تو ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پکو کا توبڑا اڈالے، ایک ککڑ کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا، توبڑا میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک کر چل دیا'' اس موقع پر آزاد نے انشاء کی غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے:۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزاد نے انشاء کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس
موقع کے لئے نہایت موزوں ہے اوراس کا ایک شعر یہ ہے ؎

(۱) گل رعنا/ص ۱۳۹/طبع چہارم۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشاء کی اس زمانہ کی تصنیف نہیں جوان کے جنون اور بے چارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، میں نے اس غزل کے چند اشعار ''تذکرہ مصحفی'' میں پڑھے ہیں جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشاء لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے، مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں، اور مرزا اعظم بیگ وغیرہ شعراء دلی سے معرکے درپیش تھے۔''(۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''آزاد نے انشاء کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو انہی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے، ''حیات دبیر'' کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے، جو میر انشاء کے نواسے تھے کہ سید انشاء نہ مجنون ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوادربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں، اور دربار بھی اس وقت حاضر ہوں جب ان کو بلایا جائے، انشاء

(۱) حاشیہ گل رعنا/ص ۲۶۲ طبع چہارم۔

نے اسی جنس بیجا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے: ؎

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا
چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازیست (۱)

یہ ان چند تاریخی فروگذاشتوں اور غیر محتاط یا مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں جو آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبّے کی طرح نمایاں ہوتی ہیں اور ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانتدار مؤرخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا اور ہمارے علم میں ''گل رعنا'' میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳- آبِ حیات میں اساتذہ سخن کے تذکرے، ان کے محاسن و کمالات کا اعتراف و اظہار اور ان کے مرتبہ و مقام کے تعین نیز بعض ہمعصر اور باہم دیگر مقابل شعراء کے موازنہ کے بارہ میں کچھ ایسی خامیاں پائی جاتی ہیں، جن کو ہم اگر آزاد کے احترام اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں ''ناانصافیاں'' نہ کہیں تو ''ناہمواریاں'' ضرور کہہ سکتے ہیں، متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے ہیں، اس بے اعتدالی کا سب سے زیادہ احساس مرزا مظہر جانجاناںؒ کے تذکرہ کے موقعہ پر ہوتا ہے، مرزا صاحب ہندوستان کی ان باکمال ہستیوں میں ہیں، جن کے وجود میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد ان کے پایہ کا بزرگ نظر نہیں آتا، ان کے نامور اور صاحب نظر معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ جو خود یگانۂ روزگار تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں (جن سے ہم واقف ہیں)

---

(۱) حاشیہ گل رعنا/ص ۲۶۲/طبع چہارم۔

کسی ملک میں ان کا ہمسر پایا نہیں جاتا، دور ماضی اور بزرگانِ سلف میں اس کا سراغ لگ سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھو تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں نہیں پائے جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ وفساد سے پُر ہے۔"(۱)

آزاد نے ان کے تذکرہ میں نہ صرف ان کے مرتبہ ومقام کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ ان ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کا بھی احترام نہیں کیا جو ان کے عقیدتمند اور حلقہ بگوش تھے، اول تو ان کی نازک مزاجی کو اس انداز سے پیش کیا جس سے نہ صرف ان کی غیر واقعی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے بلکہ میر صاحب سے بھی کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک نہایت تنک مزاج، مغلوب الغضب اور غیر مہذب انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس میں آزاد نے صرف رنگ آمیزی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اس میں مذہبی جذبات (جو افسوس ہے کہ اکثر حقائق پر پردہ ڈال دیتے ہیں) کی جھلک بھی پیدا ہوگئی ہے، پھر ان کی طرف بعض ایسے واقعات منسوب کئے ہیں جو ان کے مرتبہ کے دینی پیشوا اور مقتدائے خلائق سے قطع نظر ایک خوش وضع اور ثقہ آدمی کے مرتبہ سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

مصنف گل رعنا نے جو آزاد کے برخلاف تصوف وصوفیہ کی تاریخ، ان کے مزاج ومذاق سے زیادہ آشنا اور مراتبِ رجال سے زیادہ واقف ہیں اور جن کو براہِ راست مرزا صاحب کے افادات وتحقیقات، ان کے علوم عالیہ ومضامین زیادہ پڑھنے اور ان کے معاصرین کی شہادتوں سے واقف ہونے کا موقعہ ملا ہے، اس طرزِ نگارش پر احتجاج آمیز تنقید کی ہے، جو انہی کی نہیں ان لاکھوں مسلمانوں کے دلی جذبات کی

(۱) کلمات طیبات/ص ۱۶۴، ۱۶۵۔

ترجمانی ہے جو مرزا صاحب کے ہم عقیدہ اور عقیدتمند ہیں، وہ مرزا صاحب کے حالات وکمالات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس سے بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ''ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں، کچھ تو اس اعتقاد سے ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اور کچھ میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں'' الخ. (ص/۱۳۸) تاباں کا حال جیسا چبکا کر لکھا ہے اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح بیان کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ طلب ہے (۱۲۹) شعر مندرجہ (۱۰۴) کو پڑھئے پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو اور آزاد کی معذرت کو دیکھئے، فرماتے ہیں کہ ''تہذیب آنکھ دکھاتی ہے مگر کیا کیجئے ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائیِ زبان اور طراری کا نمک ہے'' (ص/۱۴۰) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی، (ص/۱۸۲)۔''(۱)

اس کے بعد ان واقعات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے جو آزاد نے

(۱) گل رعنا/ص/۱۲۹، ۱۲۸، طبع چہارم۔

دوسرے رنگ سے بیان کئے ہیں اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ واقعات کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آبِ حیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے، جیسا کہ ان کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش وخروش اور کثرتِ کلام ڈھونڈتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا۔''(۱)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''یہاں تو نہیں مگر میر ضاحکؔ اور میر خلیقؔ کے یہاں کیا مل گیا، میر ضاحکؔ کا ایک شعر اور میر خلیقؔ کے دو شعر ہاتھ آئے، مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحکؔ کے حالات میں فرماتے ہیں: ''ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادہ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا...... اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے، مرجھائے پھول، دل افسردہ کے طاق میں پڑے ہوئے تھے انھیں کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں، (آب حیات ص/۱۶۷)۔''(۲)

اس کے بعد وہ مرزا صاحب کے بارے میں میر صاحب اور مصحفی جیسے نقاد سخن کی شہادتیں اور اعترافات نقل کرتے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں، اسی افسردگی اور بے دلی کی وجہ سے آزاد نے مرزا صاحب کے صرف بیس اشعار نمونہ کے

(۱) گل رعنا/ص/۱۳۱ طبع چہارم۔ (۲) حاشیہ گل رعنا/ص/۱۳۱۔

طور پر پیش کئے ہیں، مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور غالباً مرزا صاحب کے اتنے اردو اشعار یکجا کسی تذکرہ میں نہیں آئے ہیں، یہ تعداد میں اکتالیس ہیں۔

مصحفی اور انشا کے تقابل میں پھر یہی اندرونی جذبہ ابھر کر سامنے آگیا ہے، آزاد سے نقاد، سخن فہم اور اردو شاعری کے اداشناس اور مزاج داں سے بالکل اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ مصحفی جیسے مسلم الثبوت استاد اور صاف طرز شاعر پر جن کے کمالات وفتوحات کی سرحدیں بارہا میر اور سودا کی سرحدوں سے مل گئی ہیں، اور ان کے بعض اشعار صرف اردو شاعری ہی میں نہیں بلکہ مطلق شاعری کی تاریخ اور اس کے منتخب اشعار میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، پر سید انشاء کو ترجیح دیں گے، جن کے متعلق دور آخر کے سب سے بڑے مبصر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کا سبب نہ تھیں بلکہ عمداً تھیں یا بے پروائی کی وجہ سے تھیں کہ اپنی طبع وقاد اور جامعیتِ استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو خاطر میں نہ لاتے تھے" آگے لکھتے ہیں کہ "انھوں نے الفاظ ومحاورات میں بہت سے تصرف کئے، یہ تصرف اگر صرف معدود مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں کیونکہ اس زبان آور سے زیادہ قادر زبان اور زبان داں کون ہے؟ خصوصاً جب کہ استعداد علمی سے مسلح ہو لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے۔"(۱)

آخر وہی ہوا کہ زمانہ نے جس کے متعلق انھوں نے اپنے بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ "وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام، اس کا واضع قانون ہے" زمانہ نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، سید انشاء کی ہنگامہ خیزیاں، بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں

(۱) آب حیات/ص ر،۲۸۴،۲۸۳، مطبع کریمی لاہور۔

اوران کے کلام کا پیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے، اور زمانہ جتنا گزرتا جاتا ہے، اس کی آب وتاب بڑھتی جارہی ہے، اور تحقیق وتحسین کے نئے نئے گوشے پیدا ہوتے جارہے ہیں، آب حیات کا یہ حصہ جس میں ان دونوں کا محاکمہ ہے اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیوں کی موئے قلم سے تصویر کھنچی گئی ہے، ان کے ذاتی رجحان اور اندرونی جذبہ کی صرف غماز ہی نہیں آئینہ داری کرتا ہے، جو آزاد جیسے بے لاگ جوہری کے شایان شان نہیں۔

اسی طرح صرف مرزا مظہر جانجاناںؔ ہی نہیں، مومنؔ خاں جیسے استاد کا تذکرہ بھی جو ایک مستقل دبستان کے بانی اور مسلم الثبوت استاد ہیں، انھوں نے بادلِ ناخواستہ اور غالباً لوگوں کے توجہ دلانے سے کیا ہے، چنانچہ آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومنؔ خاں کا تذکرہ نہ تھا، اس کی انھوں نے بعد کے ایڈیشن میں جو تاویل کی ہے وہ نظر میں جچتی نہیں، مومن خاں جیسے نامور شاعر کے اتنے حالات بھی آزاد کو نہ ملیں (جس نے ان کا زمانہ دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوا) جس سے اتنا تذکرہ بھی مرتب کیا جاسکے جتنا کم سے کم میر ضاحکؔ اور میر خلیقؔ کا آیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، پھر تمہید کی سطریں بتاتی ہیں کہ انھیں مومن خاں کو ذوقؔ و غالبؔ کی بزم میں لانے اور ان کی صف میں بٹھانے میں تأمل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا، وجہ یہ تھی کہ دور پنجم جس سے ان کا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان وشان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو جو اہلِ محفل

کے لئے حاصل ہے، نہ ہوتو ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔"(۱)

لیکن پھر زمانہ نے دروبارہ اپنا حاکمانہ فرمان صادر کیا اور ذوقؔ اور معلوم نہیں کتنے شعراء کے بجائے جن کا آزاد نے آب وتاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، مومنؔ خاں کو اہل ذوق اور اہل تحقیق کی توجہات کا مرکز بنا دیا، اوران کے کلام کو ایک نئی زندگی اور تابانی عطا کی۔

غالبؔ کے تذکرہ میں انھوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جس سے ان کے اثنا عشری رجحان کا اظہار اور صحابہ کرامؓ پر طنز ہوتا ہے۔(۲) اس کے مقابلہ میں استاد ذوقؔ کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں:

"علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے، اور کبھی ان پر طعن وتشنیع نہ کرتے تھے، اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا۔"(۳)

اپنے استاد ومربی سے عقیدت حسن فطرت اور شرافت کا جوہر ہے، آزاد نے اپنے استاد سے حالات کو جس شیفتگی، دلی شغف اوران کے کمالات شاعری کو جس جوش وخروش کے ساتھ بیان کیا ہے اس پر وہ قابل ملامت یا مستحق شکایت نہیں بلکہ تعریف واعتراف کے مستحق ہیں، لیکن جب یہ چیز حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے تو ضرور قابلِ شکایت ہے، آزاد نے بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام کے متعلق جو رائے دی ہے اور اس کو جس طرح استاد ہی کے پلہ میں ڈال دیا ہے، اس سے خود استاد کی روح خوش نہ ہوگی، اور کلام کا فرق سمجھنے والا اس میں شاعر کی زندگی اور واردات کا عکس دیکھنے والا

(۱) آب حیات/ص/۴۲۰۔

(۲) ملاحظہ ہو آب حیات/ص/۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۹۔ (۳) آب حیات/ص/۴۶۷۔

مطمئن نہیں ہوگا، آزاد لکھتے ہیں:

''بادشاہ کے چار دیوان ہیں، پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیؔر کی اصلاحی ہیں، کچھ میر کاظم حسین بیقراؔر کی ہیں، غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں، جن سنگلاخ زمینوں پر قلم چلنا مشکل ہے ان کا نظام وسرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے، کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں، والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے، طرحیں خوب نکالتا ہے، مگر تم سرسبز کرتے ہو، ورنہ شور راز ہوجائے، مسودہ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف وقافیہ، باقی بخیر، یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن وعشق کی پتلیاں بنادیتے تھے۔''(۱)

مصنف گل رعنا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، اور ان کی حکومت دہلی میں قلعہ معلیٰ کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔

لیکن اقلیم سخن کی فرمانروائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی اور اردوئے معلیٰ ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفؔر سے چھین کر استاد ذوقؔ کو بخش دی۔''

(۱) آب حیات/ص ۴۹۱۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را (۱)

پھر آگے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں، اور حضرت ذوقؔ کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہو چکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جدا گانہ نظر آئیں گی، ذوقؔ پھر بھی ذوقؔ ہیں، ظفرؔ کے استاد، ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش وخروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفرؔ کے ہاں جو سامان نظر آئے گا، وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہئے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی، مگر جوش وخروش کی جگہ دل کے ٹکڑے حروف والفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ وجگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انھیں ظفرؔ کا سمجھو یا ذوقؔ کا۔'' (۲)

اسی طرح ان کو اس سے بھی اختلاف ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کا کلام استاد ذوقؔ ہی کی شاعری کا کارنامہ ہے وہ لکھتے ہیں:

''آزادؔ نے آب حیات میں جس طرح ظفرؔ مرحوم کی کاوش فکر پر

---

(۱) گل رعنا/ص ر ۲۹۷، طبع چہارم۔ (۲) ایضاً۔

پانی پھیرا ہے، ان کے بھی نتائج فکر کو اپنے استاد ذوق کے دامن کمال سے وابستہ کر دیا ہے باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی، اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے، مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا۔"(۱)

ان فروگذاشتوں اور ناہمواریوں کے باوجود آب حیات کی انفرادیت قائم تھی اور رہے گی اس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، ضرورت اس کی تھی کہ اس کے اس تاریخی حصہ کو مکمل کر دیا جائے اور اس کی ان غلطیوں کی نشاندہی کردی جائے جو مصنف کی ادبی افتاد طبع یا اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مصنف کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر نہ تھی، اور وہ اس کے بعض شعبوں (مثلاً تصوف وسلوک، علماء ومشائخ کے حالات، ملفوظات مخطوطات) کا رمز شناس اور خصوصی طالب علم نہیں رہا تھا۔

مولانا سید عبدالحی صاحب نے اپنی عربی تصنیفات "نزہۃ الخواطر" "معارف العوارف" اور "جنۃ المشرق" کی تالیف و ترتیب کے سلسلہ میں ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، علمی اور ادبی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا، اور اس ضرورت سے انھوں نے سیکڑوں متعلق اور غیر متعلق کتابیں اور ہزار ہا صفحات پڑھے تھے، ان میں بلا ارادہ بہت سا مواد ان کی نظر سے گزرا، جس سے اردو زبان کے آغاز اس کی شعر و شاعری کی تاریخ اور اردو شعراء کے حالات زندگی اور ان کے کمالات پر روشنی پڑتی تھی، اور ان سے اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور شعراء کا تذکرہ مرتب کرنے میں بیش قیمت مدد ملتی تھی، بہت سے نظریات کی جو اس وقت تک مشہور و مقبول تھے تردید ہوتی تھی، اور بہت سے نئے حقائق

(۱) حاشیہ گل رعنا/ص ۲۸۸، طبع چہارم۔

سامنے آتے تھے، آب حیات میں جس کا مطالعہ انھوں نے اس کی اشاعت کے بعد ہی کرلیا ہوگا، بہت سی چیزیں ان کے تاریخی ذوق کو کھٹکیں اور ان کی مؤرخانہ نظر میں چبھی ہونگی، اس لئے اس کا داعیہ پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا، کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں، اور ان اغلاط کی تصحیح کریں، جو نادانستہ آب حیات میں آ گئی ہیں، اور یہ حق کسی صاحب قلم اور صاحب نظر سے چھینا نہیں جا سکتا۔

شاید ان کو اس کام کی تکمیل میں دیر لگتی یا عربی تصنیفات کی تکمیل کا کام اور زندگی کے دوسرے مشاغل اس کی مہلت نہ دیتے، کہ ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں وجع مفاصل کا ان پر حملہ ہوا اور نقل و حرکت ان کو دشوار ہوگئی، مریضوں کو دیکھنا، مطب میں جانا، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت سب ناممکن ہوگئی، تصنیفی و تحریری کام ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا، اور وہ یکسر بے کار و معطل نہیں رہ سکتے تھے، اس حالت میں وقت گزاری اور تفریح کے لئے ان کو اپنی پرانی بیاض یاد آئی اس کو نکالا تو معلوم ہوا کہ مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اس کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائیں، تذکرے جمع کئے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی اور وہ خاصی کتاب بن گئی۔(۱)

یہ گل رعنا کی تصنیف کی مختصر کہانی ہے، جو مصنف نے اس کتاب کی شان ورود کے سلسلہ میں خود سنائی ہے، اس کتاب کا مسودہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کے پاس بھیج دیا، جن سے ان کو عزیزانہ تعلق تھا، اس عرصہ میں ان کی وفات ہوگئی اور وہ کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے، غالباً جمادی الاول

---

(۱) پیش لفظ مصنف ''گل رعنا'' /ص ر۳، طبع چہارم۔

۱۳۴۳ھ جنوری ۱۹۲۵ء کے "معارف" کے شذرات میں جو مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم کے قلم سے ہیں، پہلی مرتبہ اس کتاب کا تعارف اور اس کی طباعت کا اعلان نظر آیا، اس وقت ان کے بہت سے دوستوں اور شناساؤں کے لئے یہ انکشاف تھا کہ ان کو اس موضوع سے اس درجہ کا ذوق اور واقفیت ہے کہ اس موضوع پر ان کے قلم سے ایک ایسی وقیع تصنیف نکل سکتی ہے، رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) کے ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ جولائی ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے یہ صحیح لکھا ہے:

> "جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انھیں ممکن ہے کہ اس کا علم ہو ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے ہیں، اور ایسا خیال کچھ بیجا بھی نہ تھا کیونکہ مولوی صاحبان نے عموماً اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔(۱)
>
> معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے اِرثاً ملا ہے جو اردو، فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔"(۲)

کسی تصنیفی کاوش کو اس زمانہ کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کئے ہوئے پیمانہ اور اس کے تصنیفی منصوبہ سے علیحدہ کر کے کسی دوسرے زمانہ کے حدود و

---

(۱) پچھلے دور کے فضلاء مدارس کے متعلق تو یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوگا، لیکن ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تک کے علماء پر یہ الزام صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔

(۲) رسالہ اردو/ بابت جولائی ۱۹۲۵ء ص ۵۰۷۔

ماحول میں رکھ کر اس زمانہ کے معیاروں، اصطلاحوں اور مقرر کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا، مصنف ادب وشاعری کے ان تنقیدی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، جو بیسویں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں دریافت کئے گئے اور صدیوں کی کاوش کے بعد انھوں نے ارتقا کے منازل طے کئے، ان میں بھی ایک بڑا حصہ وہ ہے جو مغربی ماحول ومعاشرہ کی آب وہوا، مخصوص سیاسی وتمدنی عوامل کا نتیجہ اور مغربی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتا ہے، اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری پر جوں کے توں ان کا انطباق نہیں کیا جاسکتا، مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے، جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں، انھوں نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات ودواعی اور اس تصنیف کے اغراض ومقاصد اور اس پیمانہ اور رقبہ کا اپنے پیش لفظ میں اظہار کر دیا ہے، انھوں نے اردو زبان وادب اور اردو شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات دی ہیں، متعدد نئے مأخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے، اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ آبِ حیات اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں، جب دکن وگجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعراء کے ذریعہ اس مرغوب طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا، انھوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب:

> ”ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مؤلف کی وسعتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ زبان وشعراء کے

کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔"(۱)

کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا، دلچسپ اور ان کی اردو انشا پردازی اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں، چونکہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اور تراجمِ رجال ان کا خاص موضوع رہا ہے، اور نزہۃ الخواطر جیسی کتاب ان کے قلم سے نکل چکی ہے، اس لئے ان حواشی میں تاریخ کے طالب علموں کو بہت سی نئی معلومات اور ضخیم کتابوں کا عطر مل جاتا ہے، اودھ چونکہ ان کا وطن ہے اور اس کی تاریخ کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اس لئے اس صوبہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بہت پُر از معلومات اور مبصرانہ ہیں، اور ان میں ان شخصیتوں کی صحیح تصویر کشی اور سلطنتِ اودھ کے عہد کی بولتی ہوئی تصویر آ گئی ہے، علم کی سچی پیاس اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے کام کی کوئی ایک چیز ہاتھ آ جائے تو اس کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے، اور دل میں جگہ دی جاتی ہے، اور اگر کوئی اجنبی اور بیگانہ بھی راستہ گزرتے ہوئے ایسی صدا لگا دیتا ہے جس سے منزلِ مقصود کی دریافت یا گوہرِ مقصود کے حصول میں ادنیٰ سی مدد ملتی ہے، تو اس کو ہزار بار شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، علم و ادب کی ترقی ہر زبان و ادب اور ہر ملک و ملت میں ان سب لوگوں کی رہینِ منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانے کا بھی اضافہ کیا یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد و غبار اور خس و خاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا، جو خود مغربی ممالک کی ادب و زبان اور فن تنقید کی تاریخ تشکر و ممنونیت اور اقرار و اعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے، جس کی تقلید و پیروی ہمارے

(۱) رسالہ اردو/ جولائی ۱۹۲۵ء۔

مشرقی ممالک کے لئے معراجِ کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کے لئے سدرۃ المنتہیٰ بنی ہوئی ہے۔

اردو میں آبِ حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل ومکمل شستہ وشائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ اور شیریں زبان میں اردو شعراء کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالبعلم اور شائقِ فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا ہو، اس لئے جیسے ہی ''گل رعنا'' ملک کے مؤقر علمی ادارہ دارالمصنفین سے شائع ہوئی، وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں داخل کی گئی، اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہندوستان و پاکستان میں یکساں طریقہ پر ایک اہم نصابی کتاب اور وقیع علمی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرے رسائل اور دینی تصنیفات

مولانا سید عبدالحی صاحب کی مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ان کے قلم سے حدیث وفقہ، تاریخ وطب، ادب عربی اور اصلاحِ اخلاق اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے عربی و اردو میں متعدد تصانیف اور رسائل نکلے، ان کتابوں کا مختصر تعارف ''ترجمۂ مصنف'' سے اُخذ کر کے لکھا جا رہا ہے۔

تلخیص الاخبار

یہ کتاب آخر عمر کی تصانیف میں سے ہے، اس کتاب میں احادیثِ رسول کریم ﷺ جمع کی ہیں، حدیث کی کتابیں اور بھی ہیں مگر ان میں یہ مجموعہ خاص وقعت رکھتا ہے، اس میں خاص کر وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن کا تعلق تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ باطن، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن وحسن معاشرت سے ہے، انسان کی مادی ترقی کے

ساتھ ساتھ نئے نئے خیالات اور نئے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، اس عصر میں جو مشکلات ایک مسلمان کو پیش آسکتی ہیں، ان کا حل جناب رسول اللہ ﷺ کے اقوال سے یہ کتاب کرسکتی ہے۔

منتہی الأفکار في شرح تلخیص الاخبار

یہ تلخیص الاخبار کی عربی میں شرح ہے، اس میں مسائل مختلف فیہ کو نہایت خوش اسلوبی سے سلجھایا ہے، مصنف مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے جو فراست وذکاوت، سلامتِ طبع وقوتِ فیصلہ دی تھی، اس کا ظہور اس میں بدرجۂ اُتم ہوا ہے۔

تذکرۃ الابرار

یہ کتاب فارسی میں ہے، اس میں مصنف مرحوم کے خاندان قطبیہ حسنیہ کے مشائخ وعلماء ومشاہیر کے تذکرے ہیں، اس کتاب سے مصنف مرحوم کے خاندان کے بلند مرتبہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

کتاب الغنا

یہ کتاب مبحث غنا پر عربی میں لکھی تھی، یہ کتاب آخر عمر کی تصانیف میں سے ہے، اور اپنے مبحث پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سب سے مکمل ہے، یہ کتاب بھی مصنف مرحوم کی سلامت طبع وقوت فیصلہ کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

قرابادین

اس کتاب میں اپنے خاندانی نسخے جن کا خود بارہا تجربہ کرچکے تھے، جمع کئے ہیں، یہ کتاب اس عاجز بے مایہ (۱) کے لئے لکھی تھی، ان نسخوں کی قدر وہی لوگ جان

(۱) اس سے مراد مؤلف رسالہ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم ہیں۔

سکتے ہیں جنھیں ممدوح کی خدمت میں علاج کیلئے حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔

ارمغانِ احباب

یہ کتاب اس سفر کی یادگار ہے جو ممدوح نے ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء میں علماء ومشائخ سے مستفید ہونے کے لئے کیا تھا، اس کتاب سے اس اخلاقی و مذہبی زوال کا پتہ چلتا ہے، جو اس تھوڑے سے عرصہ میں مسلمانانِ ہند کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔

طبیب العائلہ

یہ کتاب اردو میں ہے، عورتوں اور بچوں کی روزمرہ کی بیماریوں، حفظانِ صحت کے طریقے اور ہیضہ، طاعون جیسے مہلک اور تیز امراض کے علاج بیان کئے ہیں، اس میں یہ کتاب علمی حیثیت سے نہایت بیش بہا ہے، اور اس طرز پر لکھی گئی ہے کہ معمولی پڑھے لکھے بھی بلا کسی خطرہ کے اس سے نفع اٹھاتے ہیں، اس کتاب میں وہی باتیں بیان کی گئی ہیں، جو بار بار کی آزمائش سے صحیح ثابت ہو چکی ہیں، یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔

شرح سبعہ معلقہ

یہ کتاب مصنف مرحوم نے عربی میں ایک شاگرد کی استدعا پر لکھی تھی مگر ناتمام رہ گئی۔

ریحانۃ الأدب وشمامۃ الطرب

یہ کتاب ممدوح نے ادب کے طلباء کے لئے لکھی تھی، اس کے کئی حصوں میں سے بعض مکمل ہو چکے ہیں، اور بعض ناتمام ہیں، اس کتاب سے عربی ادب میں مصنف کا پایہ معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ کے ذریعہ سے صرف ونحو کی تعلیم جدید استقرائی

اصول سے دی جاسکتی ہے، اور ادب عربی کی اتنی لیاقت پیدا ہوسکتی ہے، کہ طالبعلم بلاتکلف تقریر وتحریر پر قادر ہوسکتا ہے۔

تعلیم الاسلام

یہ کتاب سلیس وآسان اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس میں ضروری ضروری مسائل جن کی ہر شخص کو ضرورت پڑتی ہے، لکھے ہیں۔

نور الایمان

یہ اردو رسالہ بچوں کی تعلیم کے لئے لکھا تھا، اس کتاب میں عقائدِ اسلام بیان کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا حلیہ شریف اور اخلاق وعادات بیان کئے ہیں۔

رسالہ در بیان سلاسلِ خانوادہ نقشبندیہ

یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا، میرے ماموں مولوی سید ابوالقاسم صاحب مرحوم نے ''برکاتِ احمدیہ'' میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''در بیان سلاسل خانوادہ نقشبندیہ رسالہ ایست از برادر عزیز القدر سلالۃ الاکابر وخلاصۂ ارباب المفاخر السید عبدالحی (رزقہ اللّٰہ حظا وافرا من العلم وبارك له فيما أعطاه أجمع ما في الباب) کہ جمیع سلاسل ایں خاندان دراں جمع نمودہ گویا کہ در منثور را در سلک نظم آوردہ ویا بحر ذخار در کوزہ بند ساختہ دیدنی است وقابل ہزار تحسین وآفریں۔''

تعلیقات علی سنن ابی داؤد

یہ کتاب عربی میں ہے، مگر نامکمل ہے۔

القانون في انتفاع المرتهن بالمرهون

یہ رسالہ بھی عربی میں ہے، اور آخر عمر کی تصنیفات سے ہے۔

تم بحمد اللہ